

# نَری یادوں کے گلاب

ناولٹ

شازیہ اعجاز شازی

PDFBOOKSFREE.PK

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY  
www.pdfbooksfree.pk

## ابتدائیہ

میرا نام یقیناً قارئین بہنوں کے لیے نووارد کی حیثیت رکھتا ہے۔ ڈائجسٹوں کی دنیا میں میرا داخلہ ماہنامہ نازنین کراچی میں چھپنے والے ناولٹ "غم تمہارا ہے" کے ذریعے ہوا۔ یہ کہانی اپریل ۲۰۰۹ء کے شمارے میں چھپی جو اچھی خاصی پسند کی گئی۔

اگلے ہی ماہ ماہنامہ نئی کہانیاں اور فیشن میگ میں میری دو اور تحریروں شائع ہوئیں۔ اور اس کے بعد یہ سلسلہ چل پڑا۔ ایک ہی سال کے اندر دس کہانیاں لاہور اور کراچی کے اخبارات میں چھپیں۔ جن میں سے ایک ناولٹ "ریت کی دیوار" انعام یافتہ قرار پایا جبکہ "سحر ہونے تک" نے ماہنامہ نئی کہانیاں میں ماہ دسمبر کی اول انعام یافتہ تحریر کا اعزاز حاصل کیا۔

نئی کہانیاں، شمع ہر شمع، فیشن میگ میں دو دو اور نازنین، ماہنامہ خاتون خانہ میں ایک ایک کہانی شائع ہو چکی ہے۔ جبکہ اب تک کی آخری اشاعت فروری ۲۰۱۰ء کے ماہنامہ شمع، کراچی میں چھپنے والا افسانہ "چاہت کا درخت" ہے۔

اتنے کم عرصے میں اتنی زیادہ کہانیاں شاید کسی بھی دوسری خاتون مصنفہ کی ڈائجسٹ اور ماہل کی زینت نہیں بنی اور وہ بھی پہلے ہی سال۔

مسابک کتاب ہونا جہاں بہت بڑا اعزاز ہے وہاں ذمہ داری بھی ہے اور مجھے نہیں



معلوم کہ میں اس ذمہ داری سے بہ احسن عہدہ براہ ہو سکتی ہوں کہ نہیں؟ تاہم میری کوشش ہے اور رہے گی کہ میں پڑھنے والوں کو ایسی تحریریں دوں کہ جن سے معاشرے کے بگاڑ کو کم کرنے میں مدد ملے۔

اکثر احباب پوچھتے ہیں کہ ان کہانیوں کے کردار کہاں سے کشید کرتی ہوں میرا جواب یہ ہے کہ ہر شخص ایک نہ ایک کہانی اپنے چہرے یا ماتھے پہ سجائے پھرتا ہے۔ کردار بھی اسی معاشرے کا حصہ ہوتے ہیں۔ ہاں انہیں بازیافت کرنا لکھنے والے کی ذمہ داری ہے۔

میرے ناولت بھی اسی جیتے جاگتے معاشرے کی کہانیاں ہیں۔ اور ان کے تمام تر کردار میں اپنے ارد گرد سے محسوس کر کے لیتی ہوں اور سیدھے سادھے انداز میں لکھتی ہوں تاہم یہ کوشش ضرور ہوتی ہے کہ کہانیوں میں یکسانیت نہ آئے۔ انشاء اللہ جلد ہی قارئین نہیں میرے سلسلہ دار ناول مختلف ڈائجسٹوں میں دیکھیں گی۔

اس کے علاوہ درجن بھر کے قریب ناولت بھی اشاعت کے لیے مختلف ڈائجسٹوں کے پاس "انتظار فرمایئے" کے مرتلے سے گزر رہے ہیں۔

آخر میں ان کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتی ہوں جنہیں میں نے پڑھ پڑھ کر لکھنا سیکھا۔ جی ہاں، اے آرخاتون، مدیہ، بٹ، سلی کنول، بشری رخن، مدیہ، جیل، بانو قہار اور دو تمام جن کے نام اس وقت ذہن میں نہیں آ رہے۔

شازیہ اعجاز شازی

## تری یادوں کے گلاب

اے اللہ..... انسان اتنا ظالم کیوں ہے؟ تیری تحقیق اتنی بے درو کہے ہوگی۔ لفظ محبت تو باعثِ تحقیر کا نکتہ ہے۔ پھر کائنات سے یہ لفظ کیوں اٹھ گیا۔ ہر طرف نفرت کا راج کیوں ہے۔ کیا ہو گیا ہے انسانوں کو۔ وہ انسان کیوں نہیں رہے۔ شکلیں..... ہر طرف شکلیں ہی شکلیں۔ باپ حادثے میں معذور پڑے سی کر گزارہ کرتے ہوئے ماں کی آنکھیں بے نور۔ تھوڑی سی تنخواہ میں مشکل سے گزارا اور پھر اچانک پڑنے والی مصیبتیں۔ ماں باپ کی کفالت، کرائے کا گھر جو بھرتوں کے ڈربے سے غلبہ نہیں۔ لیکن مالک مکان کے غرے آسمان پر، کرائے بڑھانے کی دھمکیاں، نوکری کی مشکلات، پہلے پھر بھی صورتحال کچھ بہتر تھی۔

تینوں بھائی ساتھ رہتے تھے۔ تانیا اب تو تھی ہی خود غرض تائی اماں آفت کی پرکال پھر مرے کو دے دی۔ آخر چچا کی شادی ہو گئی اور نزلہ انہی بچاروں پر گرنا انہیں ہی گھر چھوڑنا پڑا۔ کرائے کے گھر میں شکلیں تو خیر تھیں ہی لیکن نعمان صاحب کے بس کے حادثے نے تو زندگی ہی برباد کر دی۔ اس حادثے میں نعمان صاحب معذور ہو گئے۔ نہ صرف معذور بلکہ ان کی زبان تک بند ہو گئی اور اب وہ صرف ایک زندہ لاش تھے۔ لیکن بیوی اور بیٹے نے انہیں لاش نہ پہنے دیا اور انہیں ہتھیار بنایا لیا۔

نعمان صاحب ان دونوں کے بھی شکر گزار تھے۔ درحالیہ دور میں رشتے سب سے زیادہ مفید ثابت ہو گئے ہیں۔ تین بھائی تھے یہ۔ نعمان، اختر اور احمد گھوسہ جیلے اور سیٹا بن کر پاس تھا۔ اماں نے اپنے اختیارات سے کام لے کر مکان دو بھائیوں کے نام کر دیا اور نعمان کو وہاں سے ہمیں ہی طرح نکال پھینکا گیا۔ وہ بچکر اپنی بیوی اور بیٹے کو لے کر کرائے کے مکان میں آ گئے اور یہاں سے ساتھ یہ حادثہ ہو گیا اور وہ معذور ہو کر گھر بیٹھ گئے۔ عام کر بچپن میں کرچکا تھا وہ سینہ

”اور۔۔۔ واہ۔۔۔ یہ کیا بات ہوئی۔ بہن تمہاری قہمی یا ہماری؟“ بڑی بھادج نے کہا۔

”تم تو کون سے بولنے کے لیے کس نے کہا ہے۔ بات کرنے دو۔ دیکھو عامہ میں معلوم ہے ایمان بیکار سے معذور ہو کر گھر بیٹھے ہیں مگر اب ان تینوں بچوں کا مسئلہ ہے۔ ہمارا گھر بھی ہونا سا ہے تم کو کچھ پتے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی ایسا فیصلہ ہو جائے جس سے ان کی پرورش بھی ہو جائے۔ میں ایک تجویز ذہن میں رکھتا ہوں کہ ایک ایک سال تک ان بچوں کو اپنے ساتھ رکھا جائے۔ بچوں کی خالائیں بھی ان کا بوجھ اٹھائیں اور انہیں اپنے ساتھ رکھیں، کہ بچے کسی کی محبت سے محروم نہ ہو سکیں۔“

”اورے واہ۔۔۔ بھائی احمد حسین! بڑا شاطر دماغ پایا ہے آپ نے؟“

”کیوں۔۔۔ اس میں شاطر دماغ کی کیا بات ہے؟“

”سارا بوجھ ہم پر لا دو یا آپ لوگوں نے ہم خود بال بچوں والے ہیں یہ ممکن نہیں۔“

”تو پھر کیا کیا جائے ان کو کسی قیمتی خاٹے بھیج دیا جائے۔“

”کچھ بھی کیا جائے آخر کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔“

”اوں۔ ہوں۔ کون کیا کرے گا دنیا جانتی ہے۔“

”نہیں تائی اماں! دنیا بھی جانتی ہے اور میں بھی جانتا ہوں۔ آپ بالکل بے فکر ہیں۔ میں

انہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ پاکستان اور یہ میرا وعدہ ہے کہ میں ان تینوں کو اس معاشرے میں سرفراخ کر کے قابل بناؤں گا۔“

”سوچ لو مہاں! جوانی ہے، جوانی کے جوش میں آدمی سکندر اعظم بن جاتا ہے لیکن

سکندر اعظم بننے کے لیے پوری دنیا کو کندھوں پر اٹھانا پڑتا ہے۔“

”اللہ مالک ہے۔“ یہ کہہ کر عامر نے ان تینوں کو ہانپوں میں بھر لیا۔ داوی اماں چینی چینی

آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ پھر ان کی لڑائی ہوئی آواز ابھری۔

”اللہ تمہیں اس کا اجر دے گا۔“ اور عامر ان تینوں بچوں کو لے کر اس ڈرہے میں واپس آ

گیا۔ اس نے باپ کی آنکھوں میں بڑے سکون کے آثار دیکھے تھے۔ شاہدہ بیگم بھی انتہائی نہیں

مورت تھیں۔ انہوں نے کہا۔

”خدا ان کی تدبیریں ہمارے ساتھ شامل کر رہا ہے تو ان شاء اللہ ان کی تقدیر سے ہمارے

بھی اصرار دور ہو جائیں گے۔“ نعمان حسین نے دیکھا کہ آسمان کی طرف دیکھا تھا جیسے خدا

تان کر سامنے آ گیا اور اس نے باپ کو تسلی دی کہ وہ ہے ماں کی جگہ پریشانی کی کیا بات ہے؟ باپ کی آنکھوں میں پیار کا سمندر اُمنڈ آیا۔ ان کا دل چاہتا تھا کہ اپنے بیٹے کو سینے سے لگا لیں۔ اس کا ہاتھ چوم کر اسے بتائیں کہ وہ اس سے کتنا پیار کرتے ہیں مگر وہ اسے دل ہی دل میں دعا میں دینے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اور ہر ماں کی آنکھیں جو محنت کرتے کرتے دھندلا گئی تھیں لیکن وہ اس کا اظہار نہیں کرتی تھیں نہ یہ بتاتی تھیں کہ ان کے دل میں کیا ہے۔ ایک بے بسی ایک بے کسی ایک تڑپ جو اپنے رفیق زندگی کو معذوروں کی طرح بستر پر دیکھتی تھیں تو اس کا دل کٹ جاتا تھا اور بیٹے کے چہرے پر چھائی ہوئی ٹھکن جیسے وہ چھپانے کی انتہائی کوشش کرتا تھا اور فیس فیس کر ان سے باتیں کرتا تھا ان کا دل بہلانے کی کوشش کرتا تھا۔

شرافت بعض اوقات انسان کو مشکلات کا شکار کر دیتی ہے مگر بات وہی ہے کہ جب نہ اپنی برائی نہیں چھوڑ سکتے تو اچھے اپنی اچھائیوں کو کیسے نظر انداز کر سکیں۔ چچا اختر حسین اور چچی نازیہ بیگم ایک حادثے کا شکار ہو کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ تاپا احمد حسین جو سدا کے زمانہ ساز تھے یہ سوچ کر کہ اب اختر حسین کے تینوں بیٹوں کا بوجھ ان پر پڑے گا جو بالکل چھوٹے چھوٹے تھے انہوں نے نعمان کے ہاں اطلاع بھیج دی کہ آئیں اور آ کر ان بچوں کے بارے میں فیصلہ کریں چنانچہ بحالت مجبوری عامر اور شاہدہ بیگم کو ان کے گھر جانا پڑا۔

عامر کئی سالوں کے بعد اس گھر میں آیا تھا۔ جہاں کے بچے بچے سے اس کا بچپن جڑا ہوا تھا۔ اس نے اسے اپنا بیٹا سمجھ کر کے محن میں لگی ہوئی تھی۔ تاپا جان اور تائی جان کے چہرہ کی رعونت اور خوشنوت میں کافی اضافہ ہو چکا تھا۔ کمزور داوی اماں بھی پاس ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک لمبے کے لیے عامر کے دل میں تلخی نے سر اٹھار ا مگر شاہدہ بیگم کا چہرہ دیکھ کر اس نے خود کو سنبھال لیا۔ البتہ داوی صاحبہ نے پتہ نہیں کیوں بڑی محبت کا اظہار کیا اور دودھ کی کمی کی طرح نکالی جانے والی بہو اور پوتے کو سینے سے لگا لیا۔ تینوں بچے اس انداز میں سر جھکائے بیٹھے تھے کہ جیسے ماں باپ کی موت انہی کا جرم ہو۔

اس نے ان مصوموں کو دیکھا تو اس کے دل پر عجیب اس اثر ہوا۔ اس وقت نازیہ چچی کی بڑی بہن نے کہا۔

”ہم بھلا ان بچاروں کو کیسے سنبھال سکتے ہیں ہم تو خود اپنے شوہروں کی مرضی سے سانس لیتے ہیں۔“



سے دعا کر رہا ہو کہ وہ ان کی مدد کرے۔

☆.....☆.....☆

اس دن عام اپنے خیالات میں کھوپا کھیں چار ہاتھار کے خیالی کے انداز میں کسی سے کرا  
مکیا۔ تبھی اس نے کسی کی پہنچ ہوئی آواز سی۔

”اے میں آپ اسڑک پر چل رہے ہیں اور آپ کو ہوش نہیں ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ  
اگر میں چاہوں تو آپ کو ابھی..... ہاں نے جبرانی سے اسے دیکھا اور اس کے چہرے پر شدید  
شرمندگی کے آثار ابھر آئے۔ سفید شلوار، سفید قمیض اور سفیدی روپنہ۔ دو اسٹ اپنی بڑی بڑی  
آنکھوں سے غصے سے دیکھ رہی تھی۔ ہلکی سی سالو لائٹ لیے گندی رنگت۔ بہت ہی دلکش نقوش  
سب سے بڑی چیز اس کے چہرے کی وہ جھلکت تھی۔

”م..... م معافی چاہتا ہوں۔“

”جی ہاں۔ عام سا لفظ ہے۔ معافی چاہتا ہوں۔ پتہ نہیں یہ آنکھیں استعمال نہیں کی  
جاتیں۔ راستہ دینا تو شان کے خلاف ہے۔“ اس نے تھک کر اپنی چیزیں اٹھائیں اور وہاں سے  
آگے بڑھ گیا۔ اسے بہت ہی ضروری کام سے جانا تھا۔

☆.....☆.....☆

دروازہ ہلکے سے کھٹکے سے کھلا تھا۔ نیند میں آئے تھے۔ شاید بیچم چونک کر سیدھی  
ہوئیں۔ آنے والا عام ہی تھا۔ ان کو دیکھ کر مسکرایا۔

”آپ سوئی نہیں امی ابھی تک؟“

”جی ہاں بہت دیر ہو گئی آج؟“ انہوں نے گھڑی کی طرف دیکھا جو رات کے گیارہ بجھا  
رہی تھی۔

”ہاں امی! میں نے آپ کو بتایا تھا کہ دیر ہو جائے گی۔“ اس نے تخت پر مگر تے  
نے کہا۔

”وہ تو ٹھیک ہے جیٹا۔ مگر اتنی بھر۔ میں پریشان ہو گئی تھی۔“

”اب پریشان مت ہو۔ یہ تو بڑا بڑا روزانہ یہ ہی ٹائم ہوگا۔“

”روزانہ..... اتنی دیر تک یا جام رو کے باہر؟“ وہ حیرانی سے بولیں۔

”ای پارٹ ٹائم جاب ملی ہے۔ صدر میں دو تین دکانوں پر حساب کتاب کرنے کا کام

تری یادوں کے کتاب

ہ۔ مارے ہوئے ہوئے اتنا نام تو لگ ہی جائے گا۔“

”جیہاں انسان ہی ہو کوئی مشین تو نہیں اتنا کام کیسے کرو گے کوئی دوسری نوکری کیوں نہیں  
امانڈ لیتے.....؟“ وہ فکر مند ہوئیں۔

”امی..... نوکری ملنا کوئی آسان ہے؟ آپ کو کیا لگتا ہے کہ سب میرے ہنگامہ میں بیٹھے ہیں  
کہ میں ان کے پاس آؤں اور وہ ہار پھول لے کر مجھے پہنائیں اور میٹ پر بٹھا دیں؟“ وہ اتنا تھکا  
ہوا تھا کہ اس کے لہجے میں تلخی آ گئی۔

”آپ فکر نہ کریں۔ میں دیکھ رہا ہوں کوئی دوسری جاب بس آپ دعا کریں میرے لیے۔“  
اس کو اپنے لہجے کا احساس ہو گیا اس لیے محبت سے ان کا ہاتھ تھام کر ان کے گھٹنوں پر سر رکھ دیا۔

”تمہارے لیے دعا میں ہی دعا میں ہیں جیٹا۔“ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔  
”اور یہ ہی کیا ہمارے پاس؟“ ان کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

”ہاں۔ بہت ہیں اور یہ بتائیں کہ تینوں بچے سو گئے ہیں کیا؟“

”ہاں..... ابھی تو سلا یا ہے۔ تمہارے آنکھار میں جاگ رہے تھے۔ شاکر اور امرو تو بچس  
پینے تھے کہ نہیں تم سے بے غش ہی نہ۔“ وہ مسکرا کر بتانے لگیں۔ وہ بھی مسکرا دیا۔ واقعی  
تینوں بچے اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ شاکر اور امرو جو جڑواں تھے۔ خود ہی اس کے پاس بیٹھ کر  
اس کی باتیں دہانے لگتے تھے تو اس کو ان پر بہت پیار آتا دونوں کو ایک ساتھ گود میں اٹھا لیتا تھا  
بڑا بڑا غمیرے سوچ نظروں سے اس کو دیکھتا رہتا تھا۔ عام نے کئی بار اس سے بے تکلف ہونے کی  
کوشش کی تھی لیکن وہ شرمایا شرمایا سار رہتا تھا۔

”ابا سو گئے؟“

”ہاں بچے دو بھی سو گئے ہیں تم جلدی سے ہاتھ دھو کر آؤ میں کھانا گرم کر رہی ہوں۔“ وہ  
اچھڑائی ہوئیں۔

اور کھانا کھا کر وہ جیسے ہی اپنے بستر پر گر اسے کچھ ہوش نہ رہا۔ سارے دن کی محنت شفقت  
نے مانت نہ رہا تھا۔ صبح جب بچے گھر سے نکلتے تھے۔ تین بیٹیں بدل کر فیکٹری پہنچتا تھا۔ ادھر سے ٹیوشن  
پہنچا۔ پھر آفس اور رات گئے گھر پہنچا اور بستر پر گر کر اسے کچھ ہوش نہیں رہتا تھا۔ مگر اچانک ہی  
اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اسے ایسا لگا جیسے کسی نے اسے آواز دی ہو۔ ادھر اُدھر دیکھا تو حیران رہ گیا۔  
وہ اتنا تھا۔ اس نے اسے آواز دی تھی۔ عام نے گھڑی پر نظر ڈالی جو رات کے تین بج رہی تھی۔

تری یادوں کے گلاب

"اطہر کیا بات ہے بیٹا؟ طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟ اتنی رات کو کیا کر رہے ہو؟" گھبرا کر اس نے کئی سوال کر ڈالے۔ چرا پاؤ گھبراہٹی گھبراہٹی نظروں سے اسے دیکھا رہا۔

"بیٹا کیا ہوا۔۔۔ آپ ٹھیک ہوتا۔۔۔؟ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔ اس کی سمجھ میں یہ ہی آیا کہ بچے سوئے میں ڈر گیا ہے۔"

"وہ بھائی جان۔۔۔ آپ سے ایک بات کر۔۔۔ کرنی ہے۔" وہ بہت انک رہا تھا۔

"ہاں۔۔۔ بیٹا کہو۔۔۔ کیا بات ہے؟ کچھ چاہیے آپ کو کیا؟" اس وقت وہ اپنی محسن نیند سب کچھ بھول گیا تھا۔

"بھائی جان آپ مجھے اسکول داخل نہ کرائیں۔" اس نے آخر کبھی دیا۔

"کیوں بیٹا آپ کال نہیں چاہتا اسکول جانے کو؟"

"نہیں بھائی جان آپ مجھے کہیں کام پر رکھوادیں۔" اس نے مصومیت سے کہا۔

"اسنے سے بچے کے سن سے اتنی بڑی بات سن کر وہ حیران رہ گیا۔ اس پر کہنے کی کیفیت طاری ہوگئی۔ کچھ دیر تک وہ بول بھی نہ سکا۔"

"بیٹا۔۔۔ آپ سے کس نے کہا؟" بڑی دیر بعد وہ بولنے کے قابل ہوا تھا۔

"وہ جب میں تاجا جان کے ہاں تھا تھاں۔۔۔ تو وہ کہتے تھے تم کام کیا کرو۔ انہوں نے

ایک ہوٹل میں کام بھی دعوہ کر لیا تھا۔ مگر پھر ہم یہاں آ گئے۔" وہ اس کے تاثرات سے بے نیاز ہوتا چلا گیا۔

"اوہ تاجا جان! اہم تو سوچیلے تھے۔ آپ نے تو سگوں کا بھی لحاظ نہیں کیا۔" وہ سوچ کر رو

گیا۔ اسنے سے بچے کو محنت مشقت کی آگ میں جھونکنے کا تصور ہی اس کے لیے تکلیف دہ تھا۔

"آپ اتنا کام کرتے ہیں۔ اتنا تھک جاتے ہیں۔ میں آپ کے ساتھ مل کر کام کروں

گا۔ شاکر اور احرار کو اسکول داخل کرا دیں۔" وہ مصومیت سے اپنے پلان بتا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

آخر چچا اور حمیدہ چچی سے اسے بہت سی شکایتیں تھیں۔ مگر ان مصوم بچوں سے اتنی ہی محبت تھی۔ اس نے پیار سے اسے اپنے برابر بھالایا۔

"بیٹا یہ سب سوچنا آپ کا کام نہیں۔ اس سیشن سے آپ کا اسکول میں ایڈمیشن ہو جائے

گا۔ اگلے سال ان شاء اللہ شاکر اور احرار بھی اسکول جانے لگیں گے۔ آپ لوگوں کا کام ہے صرف

تری یادوں کے گلاب

اور۔۔۔ اس وقت سے تڑپا جاتی کرنا اور بس پیچھے کہاں سے آئیں گے۔ کون کسے گا؟ کتنا خرچ ہوگا۔

اس نے آپ کو کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔ آئندہ میں آپ کے مسئلے سے یہ بانٹیں نہ سنوں۔ ٹھیک ہے۔" ماسم نے اس کے کال پر پیار کیا۔

"م۔۔۔ مگر بھائی جان! وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر اس نے اس کے سر پر ایک چپٹ لگا لی۔

"اگر کمر کچھ نہیں بس میں نے کہا ناں یہ آپ کا مسئلہ نہیں۔ چلو آپ جا کر سو جاؤ۔ بلکہ ایسا

اروہرے ساتھ ہی سو جاؤ۔" اس نے اطہر کو اٹھا کر اپنے برابر میں لٹالیا۔ بچہ بہت جلد نیند کی

آخرش میں چلا گیا مگر اس کی آنکھوں سے چند زلزلہ دھندلی تھی۔

☆.....☆.....☆

"ماسم تمہیں سپروائزر صاحب جبار ہے ہیں۔" نعمان جہاں کے ساتھ ہی کام کرتا تھا آ کر

اطلاع دی۔

"مجھے جبار ہے ہیں۔ مگر کیوں؟" وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"جا کر خود پوچھو۔" وہ تو اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گیا مگر اسے پریشانی لگ گئی۔ سب چھوڑ

پھاڑ سپروائزر کے کنبین کی طرف چل پڑا۔

"اسلام دیکھ کر آپ نے بھالیا تھا۔"

"ہاں۔۔۔ آؤ بیٹھو۔" شمشاد بیگ نے اس پر نظر ڈال کر کہا۔

"آخر نے بتایا تھا کہ تمہیں اکاؤنٹس کا کام آتا ہے؟"

"جی سر!"

"ایسا ہے کہ آفس میں کسی کی ضرورت ہے جو یہ کام کر سکے ابھی تو عارضی طور پر ہے مگر ہوسکتا

ہا۔۔۔ اپنی یہ کام منتقل ہو جائے۔ میں نے تمہارے لیے بات کر لی ہے۔ تم پڑھ لکھے ہو۔ یہ کام

ہا۔۔۔ نہ۔ آفس کے ماحول میں رہو گے تو آگے بڑھنے کے امکانات ہیں۔ روزنہ زیادہ سے زیادہ

پہنچاؤ دیا جائے گا۔ کم سے کم وہاں کچھ سیکھ ہی لو گے۔ آگے تمہارے کام آئے گا۔" وہ تفصیل

دیتا لے گا۔

"تو انہی فی الحال تو یہی رہے گی۔ یہ اچھا موقع ہے۔ اسے ضائع نہیں کرنا۔" شمشاد بیگ



تری یادوں کے گلاب

”کہیڈو تو آ پرٹ کر سکتے ہو؟“ انہوں نے اچانک پوچھا۔

”جی سر!“

”پھر کیا خیال ہے؟“

”میں تیار ہوں سر۔“

”گڈ توکل اپنا پورٹ فولیو لے آنا اور آفس میں جا کر منیجر صاحب سے مل لینا۔“ وہ مطمئن ہو گئے تھے۔

”شاید۔ یہی وہ چانس تھا جس کا میں منتلاشی تھا۔“ اس نے دل میں سوچا۔

”اگلے دن وہ جیسے ہی آفس میں داخل ہوا اس کی نظری لڑکی پر پڑی تھی۔ وہ آج بھی سفید

لباس میں ملبوس تھی۔ کھنٹی پکلاں کو جھکائے وہ ری کپشن پر تیشی پوری تندی سے کام میں مصروف

تھی۔ وہ قریب پہنچ کر کھٹکھٹا راتو اس نے نظری اٹھائی۔

”السلام علیکم مس! میرا نام عامم ہے۔ مجھے شمشاد بیگ صاحب نے بھیجا ہے اور مجھے منیجر

صاحب سے ملنا ہے۔“ اس نے شائستگی سے کہا۔

”ایک منٹ۔“ وہ انٹرکام پر بات کرنے لگی۔

”جائیے۔“ اس نے کمرے کی جانب اشارہ کیا۔

”تھیک ہو۔“ وہ اندر کی طرف بڑھا مگر کچھ یاد آنے پر پلٹا۔

”ایک سیکنڈ زی امیں آپ سے معذرت کرنا چاہ رہا تھا۔ اس دن میں بالکل بھی بھائی کر آپ

سے نہیں مگرایا تھا۔ یقین کریں میں نے آپ کو آتے ہوئے بالکل نہیں دیکھا تھا۔ میں اسی وقت

کلینر کرنا چاہ رہا تھا مگر آپ کچھ سے بغیری چلی گئی تھیں۔“

”کوئی بات نہیں۔ میں بھی اس دن کچھ فیسے میں تھی۔“ وہ نظریں اٹھائے بغیر بولی تھی۔ جواباً

وہ شکر یہ کہہ کر اندر چلا گیا۔

آفس میں کام کرتے ہوئے اس کو تین مہینے ہو چکے تھے۔ ابھی تک نوکری پکی ہونے کی کوئی

خبر نہیں تھی۔ وہ ڈیوٹی سے اپنا کام کر رہا تھا اور خوش تھا کم سے کم ماحول تو اس کی مرضی کا تھا۔ ورنہ

فیکٹری میں مزدوروں کے ساتھ سارا دن پان سگریٹ کی غوا عصاب پر سوار ہونے لگی تھی۔ اس لڑکی

سے روزانہ بات ہوتی تھی لیکن سلام دعا سے آگے کبھی بات نہیں بڑھی تھی۔ بس اتنا چہ چلا تھا کہ اس

کا نام سرین تھا۔ ہلکے رنگوں کے لباس پہنے۔ سلیپے سے دوپٹہ اوڑھے وہ مسلسل اپنے کام میں

تری یادوں کے گلاب

مصروف رہتی تھی۔ آفس کی کچھ لڑکیاں عامم کی مٹاؤ کس پر سنبھلتی سے متاثر ہو کر اس سے بات

لے لے کر کوشش کرتی تھیں مگر اس کے پاس اتنا وقت ہی کہاں تھا کہ کسی پر توجہ دیتا۔ اس کی توجہ تو

۱۔ اس بات پر تھی کہ کسی طرح اس کی نوکری پکی ہو جائے یا پھر کوئی دوسری بہتر نوکری مل

۲۔ ان تین بچوں کو بہتر مستقبل دینے کا وعدہ تو وہ کر بیٹھا تھا مگر کیسے؟ یہ سوالیہ نشان دن رات

اس کی آنکھوں کے آگے ناچتا رہتا تھا۔

اس دن بھی وہ اپنی سوچوں میں غلطیاں آفس سے نکلتا تھا۔ تھوڑا آگے چل کر اسے یاد آیا کہ

وہ زینت کا ڈنٹ کو فائل دینا بھول گیا ہے۔ اپنی یادداشت کو کوستے ہوئے اس نے واپسی کی راہ

لی۔ اس منٹ پہلے ہی وہ اوپر گئے تھے۔ مزید دیر کا مطلب ٹیوشن کے لیے لیٹ پہنچنا، وہ تیزی سے

ایس پاس چڑھ کر آفس میں داخل ہوا۔ سامنے سرین کی میز خالی تھی۔ ویسے ہی تقریباً آدھا آفس

خالی تھا۔ چیف اکاؤنٹنٹ کو فائل دے کر وہ تیزی سے لوٹ آیا تھا کہ دبی دبی سسکیوں کی

آواز کا سن روم سے آ رہی تھی۔ اس نے اندر جھانکا تو ٹھٹھک گیا۔ سرین بیٹھی تھی۔ نہ

بات نہ کب سے وہ وہاں بیٹھی رو رہی تھی۔ جب وہ آفس سے نکلا تھا تب اس کی ٹیبل خالی تھی۔

اس کی مائولی رنگت جتنا تھی ہوئی تھی سلیپے سے گندھی ہوئی چوٹی میں سے ٹیس نکل کر ادھر ادھر

پھیلی تھی۔ عامم سرین کو اس حال میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ انتہائی مضبوط لڑکی تھی اور وہ

اس کی بات نہ کرتا تھا مگر آج وہ اس سرین سے بالکل مختلف لگ رہی تھی۔ بہت ٹوٹی اور

لمبی ہوئی۔

”وہاں تک زی مس! آریو آل رائٹ؟“ وہ بے اختیار ہی اندر آیا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی وہ

ماتحتی اپنی آنسو صاف کرنے لگی۔

”ہی میں نمیب۔ ہوں تھیک ہو دیری جی۔“

”نہیں۔ آپ تھیک نہیں لگ رہی ہیں۔ کوئی پراٹم ہے تو مجھے بتائیں۔ شاید میں آپ کی مدد

کرسکوں۔“ اس نے کاس میں پانی بھر کر اس کے سامنے رکھا۔

”نہیں نے کہا میں کوئی بات نہیں ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا آپ کو؟“ وہ ایکدم ہی چلائی تو

ماؤ۔ ”وہاں بہت ڈسٹرب لگ رہی تھی۔“

”اے۔“ اس نے آپ کہتی ہیں تو تھیک ہے۔ میں چلتا ہوں۔ لیکن میرا غلغلہ مشورہ ہے کہ

تری یادوں کے گھاب

”ہاں ٹھیک ہے۔ بابا..... بار بار اشاروں میں تمہارے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ جا کر دیکھ لو اور۔“ ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ کمرے میں تھا۔

”بابا!“ اس نے آہستہ سے اپنا اٹھ ان کے پاؤں پر رکھا۔ ان کے جسم میں خفیف سی حرکت پیدا ہوئی اور انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گیا اور ان کے ہاتھ قہقہہ لگے۔

”کیسے ہیں بابا آپ؟“ اس نے ان کے ہاتھ کی پشت پر بوسہ دیا۔

جواب ان کے ہونٹ ذرا سا لرز کر رہ گئے۔ وہ تاسف بھری نظروں سے اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ کیا تھا۔ ان کا بیٹا! اور اب کیا ہو گیا تھا۔ مشقت، بے آزاری اور نیند کی کمی اس کے روم روم سے پھولی پڑ رہی تھی۔ ان کی آنکھیں غم ہو گئیں۔ یہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ کتنی محنتیں اور شفقتوں سے اس کو بڑا کیا تھا۔ اس کی ہر وہ فرمائش پوری کی تھی جو وہ کر سکتے تھے۔ اس کو کتنا بھی چاہتا تو تکلیف ان کے دل میں ہوتی تھی۔ مگر آج..... آج وہ کتنی اہت سے سب کچھ سنبھالے ہوئے تھا۔ وہ دل ہی دل میں اسے دعاؤں سے نواز رہے تھے۔ جبکہ وہ ان کے پاس بیٹھا کھانا کھاتے ہوئے ادھر ادھر کی باتیں کر رہا تھا۔ درمیان میں ان کے منہ میں نوالہ بھی ڈال دیتا تھا۔

☆.....☆.....☆

نسرین جب سے آئی تھی داخلی دروازے پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ اس کو عام کا انتظار تھا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ آتا دکھائی دیا۔ نسرین ایک دم چونکا ہو گئی۔ وہ اس کا شکر یہ ادا کرنا چاہ رہی تھی لیکن وہ نہیں چاہتی تھی کہ آفس میں کسی کے کان میں بھٹک بھی پڑے ورنہ لوگ کتنے ہی دامنے تراش لیتے۔ وہ معمول کے انداز میں اسے سلام کرتے ہوئے اپنے کیمین کی طرف بڑھ آیا۔ اس نے خدا کا شکر یہ ادا کیا کہ اس نے وہاں تک کہ اس کی خیریت نہیں پوچھی۔ ورنہ سب پوچھتے اور جاتے۔ مگر اب وہ خود کیسے اس کے کیمین میں جائے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اسے بھی مارے۔ لہذا وہ زمین کی طرح سجدے۔ جو وقت بے وقت اس کے کیمین میں آ کر کوئی دفتری کام ان کے لئے لگتی تھی۔ خود کو نمایاں کرنے کی انتہائی بھڑکی کوشش اسے ہمیشہ ایسی حرکتوں کا پتہ رہتی تھی۔

”مس نسرین! آواز پر اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ سامنے درزانی صاحب کھڑے تھے۔

”ماسم! کیا ہے کیا؟“

تری یادوں کے گھاب

آپ بھی اب حریف نہ کریں۔ آفس تقریباً خالی ہو چکا ہے آپ کا اور میرا مناسب نہیں ہے۔“ وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ وہ ایکدم متحش ہو گئی۔

”ایک منٹ ذکیں میں آپ کے ساتھ ہی چلوں گی۔“ وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ حیرانی سے اس کے ہل پل بدلتے موڈ کو دیکھ رہا تھا۔ نسرین نے جلدی سے دوپٹے کے پلو سے اپنا چہرہ صاف کر کے سر ڈھانپ لیا۔ بیک کنڈھے پر لٹکا کر وہ کھڑی ہو گئی۔

”بھلیں۔“ وہ خاموشی سے اس کے ساتھ ساتھ باہر نکل آیا۔

بس اسٹاپ پر پہنچنے تک ان دونوں میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ سامنے سے اس کے روٹ کی بس آ رہی تھی مگر اسے نسرین کو ایسے حال میں چھوڑنا مناسب نہیں لگ رہا تھا۔

”آپ جائے۔ آپ کی دین آگئی میں اب ٹھیک ہوں۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

عام حیران رہ گیا۔ اسے کیسے پتہ چلا کہ وہ کس نمبر کی دین میں جاتا ہے؟

”نہیں جب تک آپ کی دین نہیں آ جاتی میں یہیں رہوں گا۔“ اس نے قطعی انداز میں کہا۔

جواب دہ اسے دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی مطلوبہ دین آتی نظر آئی۔ ماسم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کچھ اس کی دین بھی تھی۔ ورنہ آج نیوٹن کی چھٹی ہو جاتی۔ ویسے تو وہ خود بھی بہت پابند تھا لیکن مسز انصاری کے انداز پر اسے بہت غصہ آتا تھا۔ کبھی اگر وہ دس منٹ بھی لیٹ ہو جاتا تو

نہایت درشت انداز میں جواب دیتی کرتی تھیں اور آج تو ان کے پاس کی چھٹی ہی ہو گئی تھی۔ اس کے کرتے ہی نسرین پلک کر اس میں سوار ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

بیٹا آج تو بہت دیر ہو گئی۔ وہ جیسے ہی مگر پہنچا شاہدہ بیگم پلک کر آئی تھیں۔ اس نے کھڑی پر نظر ڈالی جو پونے بارہ بج رہی تھی۔ وہ سکر دیا۔

”اوی تھوڑی بہت دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔“ آج وہ اتنا تھکا ہوا تھا کہ مسکرانے کی بھی ہمت نہیں تھی مگر جانتا تھا اس کی نظریں اس کا چہرہ پڑھ لیتی تھیں۔ اور وہ کہیں سے بھی اپنی جھکن ان پر ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا۔

”تمہارے بابا آج تمہارے انتظار میں جاگ رہے ہیں۔“ انہوں نے اندر کی طرف اشارہ کیا۔

”بابا! بھی تک جاگ رہے ہیں؟ طبیعت ٹھیک ہے نا ان کی؟“ وہ مگر مند ہوا۔



تری یادوں کے گھاب

”ہم کو سزا انصاری کے گھر جاتے ہوئے اُس کا دل دھڑک رہا تھا۔ جو عورت پانچ دس منٹ پہلے اب اس کے سامنے کھڑی تھی وہ چھٹی کرنے پر تو کیا کیا نہیں سناے گی؟“

”ایسا لگتا تھا کہ وہ اسٹاپ وائچ سے نام کا حساب رکھتی تھی کہ اس نے کتنی دیر پہلے کو پڑھا یا اور یہی ایسا کہ دماغ گھما کر رکھ دیتا تھا۔ ایک تو ویسے ہی آفس میں مغز ماری کرنے کے بعد وہاں مانپتا تھا۔ ایک کپ چائے کی شدید طلب کے باوجود وہ ان کے کند ذہن بچے کے ساتھ دماغ لپکاتا تھا۔ جس کے بارے میں اسے پورا یقین تھا کہ اس بچے کو پڑھانے کی ذمہ داری صرف اور صرف اُس کے ممبر کا امتحان لینے کے لیے دی گئی تھی۔“

آج بھی جب وہ گھر میں داخل ہوا تو بچے کی جگہ اس کی اماں براہیمان تھیں۔ وہ دہل کر رہ گیا۔

”یا اللہ رحم آج تو یہ کچھ یاد دی خطرناک موڑ میں ہیں۔“ آہستہ سے ان کو سلام کیا۔  
”بہت شکر یہ آپ کا کہ آپ نے اپنے مصروف ترین شیڈول میں سے وقت نکال کر آنے کی زحمت کی۔“ لہجہ انتہائی طنز پر تھا۔ وہ خاموش رہا۔

پہلی تاریخ کو پیسے لینے تو آپ بہت نام پر آ جاتے ہیں۔ باقی مہینے آپ کا بس نہیں چلنا کہ آپ ایک آدھ گھنٹہ پڑھا کر اٹھ جائیں وہ بھی اگر آئیں تو۔۔۔۔۔ ان کا لہجہ اور انداز انتہائی اسٹینڈنگ تھا۔ اس کا دماغ محکم کیا۔

کتنی بھولی عورت تھی۔ اول تو وہ خود دقت کی بہت پابندی کرتا تھا جس کے نتیجے میں اسے ہر چھپتے چھپتے کالی در ہو جاتی تھی۔ پیسے دینے میں بھی تاخیر کرتی تھی۔ پڑھائی کے نام میں وہ پانچ منٹ بھی کم نہیں کرتا تھا۔ اس کو اپنے منہ سے مانگنا اچھا نہیں لگتا تھا اور وہ اس کی خاموشی سے ناجائز فائدہ اٹھاتی تھی ان کے چکر میں اس کے کتنے ہی کام رکھے رہتے تھے۔ مگر اس نے کبھی کچھ نہیں کیا تھا اور آج وہ کتنی دیدہ دلیری سے کہہ رہی تھی۔

”ہم۔۔۔۔۔ آپ زیادتی کر رہی ہیں۔“ ابھی وہ کہہ ہی رہا تھا کہ وہ پھٹ پڑیں۔  
”میں زیادتی کر رہی ہوں؟ آپ کا جی نہیں چاہتا میرے بچے کو پڑھانے کو کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس کے لیے ایک سے ایک ٹیوٹر رکھتی ہوں۔“

”آپ اب چھٹی کریں۔“ آج وہ انتہائی بدتمیزی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔  
”ہم! میں دعا کروں گا کہ ان ایک سے ایک ٹیوٹروں میں سے کوئی ایک ہی اس ناممکن کام

تری یادوں کے گھاب

”جی۔ وہ ابھی آئے ہیں۔“ اس نے ہنسکون انداز میں جواب دیا۔ وہ ابھی کچھ اور کہنے کو بچھے کسی کی آواز دینے پر مڑ کر دیکھنے لگے۔

”ارے تو یہ صاحب! دو منٹ! وہیں رکھیں میں ابھی آیا۔ آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنا ہے۔ مس سرین! ایک ٹیوٹر کریں گی آپ؟“ وہ اس سے مخاطب ہوئے۔  
”کیسے؟“ اس نے نظریں اٹھا لیں۔

”یہ فائل عامم کو دے آئیں گی؟ میں خود جاتا مگر تو یہ صاحب نکل جائیں گے مجھے بہت ضروری بات کرنی ہے اُسے پلیز اگر آپ۔۔۔۔۔“ وہ کتنی نظروں سے دیکھنے لگے۔ ساتھ ساتھ وہ تو یہ صاحب کو بھی دیکھ رہے تھے۔

”ٹھیک ہے۔ میں دے دیتی ہوں۔“ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید وہ منع کر دیتی مگر اس کا تو بہت بڑا مسئلہ حل ہوا تھا۔ اُس نے وہ پینٹ ٹھیک کیا اور فائل اٹھا کر اس کے کمرے کی طرف بڑھی۔  
وہ اپنے کمپیوٹر کی طرف متوجہ تھا کہ دستک کی آواز پر چونک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔

اس کو دیکھ کر وہ واقعی حیران رہ گیا تھا۔ وہ آج تک اس کے کمرے میں نہیں آئی تھی۔  
”مس یہاں آپ؟“ حیرانگی میں یہی الفاظ اس کے منہ سے اٹکے تھے۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی فائل اس کی طرف بڑھا دی۔

”یہ دزانی صاحب نے دی ہے آپ کے لیے۔“ عامم نے ایک نظر فائل پر ڈالی اور  
تھام لی۔  
”تھینکس!“ ساتھ ہی ایک نظر اُس کو دیکھا۔ وہ ایسی ہی مضبوط اور باہمت نظر آ رہی تھی جیسی ہمیشہ لگتی تھی۔

”مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا۔“ وہ آہستہ سے بولی۔  
”شکر یہ کس بات کا؟“ وہ اس کو دیکھنے لگا۔

”کل آپ نے میری بہت ہیلپ کی۔ میں اصل میں کچھ آپ سبٹ تھی تو۔۔۔۔۔“ وہ جملہ مکمل نہیں کر پائی۔

”کوئی بات نہیں مس میری جگہ کوئی بھی ہوتا وہ یہ ہی کرتا۔ یہ اخلاقی تقاضا تھا“ وہ رسائی سے بولا۔ وہ بس ایک نظر اسے دیکھ کر جلدی سے باہر نکل گئی۔

☆.....☆.....☆

کو ممکن کر دے۔ خدا حافظ! وہ کہہ کر گڑ کا نہیں پیچھے دھرا بھلاکتی رہ گئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

کتنا آسان ہوتا ہے کسی کی عزت نفس کو پامال کرنا۔ اس نے شوکر سے سامنے پڑا بھر بنایا اور پارک میں داخل ہو گیا۔ یہ رہائشی کالونی کا چھوٹا سا پارک تھا۔ جہاں شام کو بڑی رونق ہوتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ مسز فیضان کے بیٹے کو پڑھانے چلا جائے۔ مگر ان کے وقت میں پورا ایک گھنٹہ باقی تھا۔

”چلو آج تمہارا زام ہی سکی۔ کل سے سب شیڈول ایک گھنٹہ آگے کر لوں گا۔“

وہ اندر ہی اندر حساب کتاب کرنے لگا۔ ایک دم پانچ کی ٹوٹی کا سوچ کر وہ پریشان ہو رہا تھا۔ حالانکہ آج میں اس کا بیٹا بھی اور اس کی اہلکارہ دن کی ٹھنڈی تھی مگر وہ اس بدترین صورت کے منہ نہیں لگتا چاہتا تھا۔

”چلو اللہ مالک ہے۔ کچھ نہ کچھ بندوبست ہو ہی جائے گا۔“ وہ بچ سے ٹپک لگا کر بیٹھ گیا۔ سامنے کچھ نیچے پٹ پٹ ہال کھیل رہے تھے۔ وہ دلچسپی سے ان کا کھیل دیکھنے لگا۔ جب ایک بڑے میاں اس کے پاس آ کر بیٹھے تھے وہ اٹھ کھڑا کہ اس نے ٹوٹس ہی نہیں لیا۔

”میاں! آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ نئے آئے ہیں؟“ بڑے میاں نے اسے مخاطب کیا۔

وہ ایک دم چونکا بھرا نہیں سلام کیا۔

”وکیلک السلام! میں پوچھ رہے تھے کہ آپ نئے آئے ہیں یہاں؟“ انہوں نے اپنے الہاں دہرایا۔ وہ مسکرایا۔ میاں کا پرانا خواب تھا کہ ایک دن وہ کسی اچھی سی کالونی میں ایک اچھا، مہر خریدے۔ مگر موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے یہ چاند کو پانے کی تنہائی۔ اس کی آنکھوں میں اپنے خوابوں کی کڑیاں چبھنے لگیں۔ اس کو خاموش پا کر بڑے میاں نے اپنا سوال پھر دہرایا۔

”نہیں انگل! میں یہاں ٹیوشن پڑھانے آتا ہوں آج ذرا جلدی آگیا تو یہیں بیٹھ گیا۔“

اس نے گول مول جواب دیا۔

”ارے میاں! یہ انگل کیا ہوتا ہے ایک تو ہم اس نئی نسل کے انگلوں سے بہت تنگ ہیں کچھ میں نہیں آتا کہ چاہا جی کہ لانا ہیں۔ ویسے یہاں سب لوگ ہمیں دانتے ہیں۔ چاہو تو تم بھی کہہ سکتے ہو۔ ہمارے پوتے تمہاری ہی عمر کے ہیں اور تمہارا نام یہ ہے؟“ انہوں نے فوراً رشتہ بھی جوڑ لیا۔ وہ مسکرایا۔

”یہ نام عام ہے دادا میاں!“ وہ بخور اس کے چہرے کو دیکھ رہے تھے۔ پھر اس پڑے۔

ان نے ہنسا کر اپنے چہرے پر ہاتھ بھیرا۔

”حاف کرنا میاں! تم تمہارے گالوں کے گڑھے دیکھ رہے تھے۔ ایک بات کہیں تم

”جی نہیں۔“

”تم مسکرایا کرو اور اسکیلے میں مسکرایا کرو۔ ورنہ کسی کی نظر لگ جائے گی۔ ماشاء اللہ تمہاری طراوت بہت پیاری ہے۔ اللہ بخشنے تمہاری دادی جب حیات تھیں۔“ وہ سانس لینے کوڑ کے اور ذائقہ شکل بنائے انہیں دیکھ رہا تھا۔

”جی میری دادی ابھی بھی حیات ہیں۔“ اس نے گڑ بڑا کر صبحی کی۔

”ارے تمہاری دادی یعنی ہماری شریک حیات۔“ وہ ہنسا لگے۔

”لاحول ولا قوۃ“ زبردستی جوڑنے والے رشتوں پر اسے بھر پوری آگئی جو اس نے بڑی مشکل سے بند کی۔

”ہاں تو ہم کہہ رہے تھے۔“ انہوں نے سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا۔ ”تمہاری دادی کو یہ گڑھے بہت پسند تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کی اولاد میں سے کسی ایک کے ہی گالوں پر گڑھے بننے ہوں مگر قسمت“ وہ غصہ سانس بھر کر رہ گئے۔ ”ساری اولاد ایسی کم بخت مسکرانے میں کج رہی۔ اور اگر کبھی مسکرا دیں تو دل کرتا ہے کہ نہ ہی مسکرائیں۔“ وہ طے دل کے پھوسلے بھوڑ رہے تھے۔

”ہم۔۔۔ ہم سب کچھ رہے ہیں۔ ویسے تو ہماری اولاد ہیں۔ ہمیں جان سے پیارے ہیں مگر بات ہے وہ ہے۔ اس میں کبھی شرم؟ اگر ہماری بیگم زندہ ہوتیں تو تم سے مل کر بہت خوش ہوں۔“

اپنا کبھی اس کی نظر گھڑی پر پڑی تھی۔ وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔

”اپ۔۔۔ اتنی دیر ہو گئی۔ اچھا دادا میاں! مجھے اجازت دیں میرا ٹیوشن کا نام ہو گیا ہے۔“

اس نے آپ سے ملاقات ہوئی۔ اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا جو انہوں نے تمام لیا۔

”مل بھراؤ گے؟“

”مل ہے۔ مگر مجھے آپ سے مل کر بہت اچھا لگا۔“



”ہم کو بھی تم سے مل کر بہت ہی اچھا لگا۔“ وہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے اس کے چہرے پر پھونک ماری اور اس کا ہاتھ چوم لیا۔  
”جاء بیٹے اللہ نظر بد سے بچائے۔ ہر پریشانی دور ہو، کامیابی تمہارے قدم چومے خدا حافظ۔“

وہ خاموشی سے اُن کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے ٹھک کر اُن کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا۔  
مسز فیضان کے گھر پہنچنے میں اب صرف دس منٹ باقی رہ گئے تھے۔ کبھی کبھی کسی کی سرسری باتیں بھی دل کو تکتا ہوا کر دیتی ہیں۔ یہ آج اسے اندازہ ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆

”دادی“ وہ گھر میں داخل ہوا تو دادی کو سامنے تخت پر سوتے ہوئے دیکھ کر ہچکچاہٹ رہ گیا۔  
جب سے اُن کو لوگوں نے وہ گھر چھوڑا تھا وہ کبھی ان کے گھر نہیں آئی تھیں۔

اس کے والد ہر عید، بقرعید پر اس کو لے کر ماں کو سلام کرنے جاتے مگر وہاں ایسا استقبال ہوتا کہ سلام کرتے ہی واپس پلٹ آتے۔ جب سے وہ بیمار پڑے تھے یہ تعلق بھی ختم ہو گیا تھا اور آج اتنے سالوں بعد رات کے ساڑھے گیارہ بجے وہ اُنہیں اپنے گھر میں سوتے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ شاید بیگم اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے باور پنی خانے میں لے گئیں اور تفصیل سے بتایا۔

چالچالی ڈھوپ میں کوئی تین بجے کا وقت تھا جب دروازہ بجا۔ اچھی تھوڑی دیر پہلے ہی انہوں نے تینوں بچوں کو سلا یا تھا۔ اظہر اور احمد بہت مشکل سے سوتے تھے۔ ابھی بھی انہوں نے جلدی سے بڑھ کر دروازہ کھولا کہ کہیں وہ اُنھ نہ نہ جائیں۔

”تھیں! آپ؟“ سامنے ساس کو دیکھ کر وہ حیران ہی تو رہ گئیں۔ کچھ ان کا علیہ بھی ایسا تھا۔ میلے کپڑے، اُلٹھے اُلٹھے بال، بے پناہ کمزور اور زرد چہرہ، جلدی سے ان کو اندر لائیں۔ لمبوں پانی پلایا، گرم گرم روٹی پکا کر دی۔ وہ کتنی ہی دیر تک کھانے کو کھڑکھڑکتی رہیں تب انہوں نے خود نوالہ توڑ کر ان کے منہ میں ڈالا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ کھانے کے بعد وہ چائے بنا کر لائیں جیسے ہی وہ آ کر بیٹھیں ماں ان کے قدموں میں آ کر بیٹھ گئیں۔

”مجھے معاف کر دے بہو! مجھے معاف کر دے۔ میں نے تم لوگوں کے ساتھ بہت بُرا کیا۔

”یہ نہ نا انسانی کی۔ مجھے معاف کر دے۔“ شاید بیگم کو تو جیسے بھونے ڈنک مارا۔  
”انہیں۔“ مجھے کیوں گناہگار کر رہی ہیں۔ آپ اُنہیں اوپر نہیں۔“ انہوں نے زبردستی اُنہیں اُٹھا کر تخت پر بٹھایا۔

”میں نے ہمیشہ تم لوگوں کے ساتھ زیادتی کی ہے جس کی سزا میں جگت رہی ہوں۔ انہوں نے مجھ سے نکال دیا۔“ انہوں نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا۔  
”اماں یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“ شاید بیگم سنانے میں آ گئیں۔

”ہاں بہو میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ سب کچھ اپنے نام تو وہ پہلے ہی کروا چکا تھا۔ اختر کے ہانے کے بعد نے اس نے مجھے اور بھی بے عزت کر رکھا تھا۔ اس کی بیوی کو میری صورت سے پہلے ہی نفرت تھی۔ جھوٹی عینی کر کر کے میرے بیٹے کو مجھ سے بدگن کر دیا اور آج اس نے مجھے ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر نکال دیا کہ اس کو اپنے گھر کا کھد چین بر باد نہیں کرے۔ ایک مہربانی کی کہ تمہارا پتہ ہاتھ میں تھا تو دیا۔ ایک مہربان رشتے والا یہاں چھوڑ گیا۔“ ان کی آنکھوں سے پانی بہے پلے جا رہا تھا۔

شاید بیگم ہڈیاں دف نفروں سے اُنہیں دیکھ رہی تھیں۔ ایک زمانے میں ان کے غرور کا یہ عالم تھا کہ ان سے بات تک کرنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ مگر وقت کیسے کیسے رگ دکھاتا ہے۔ انہوں نے ان کا منہ ہاتھ دھلوا دیا۔ اپنا ایک جواز نکال کر دیا۔ اپنے ہاتھوں سے ان کے سر میں تل ڈال کر اُنہیں کی۔ وہ ان کو اپنے تیار شوہر کے سامنے اس طبقے میں نہیں لے جانا چاہتی تھیں۔ ورنہ ان کو بہت دکھ ہوتا۔

ماں کو دیکھ کر وہ کہتے میں آ گئے تھے۔ وہ بھی بیٹے سے لپٹ کر روئے جاری تھیں۔ شاید بیگم نے بڑی مشکل سے دونوں کو سنبھالا تھا۔ ان کے یہ کہنے پر کہ اماں اب ہمارے ساتھ ہی رہیں گی اماں ایک طرف خود نعمان احمد بھی چونک کر ان کی صورت دیکھنے لگے پھر جیسے وہ سب کچھ سمجھ گئے۔  
”میں نے ٹھیک کہا ناں بیٹا۔“ شاید بیگم نے ساری داستان سنا کر پوچھا۔ جواب اس نے ایک لڑائی سانس بھری۔

”جی امی! آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔“ وہ آہستہ سے بولا۔ آج ہی مسز فیضان نے بھی ’وہ‘ کے لیے منع کر دیا کہ ان کے شوہر کا تالہ کسی دوسرے شہر ہو گیا ہے۔ نفروں کے آگے وہی ہاتھ مار رہا ہے۔ جواب نہیں ملے تھے۔

تری یادوں کے گلاب

”چلو اللہ مالک ہے۔ میں کیوں ایسے سوچ رہا ہوں۔ ہر کوئی اپنا رزق ساتھ لاتا ہے۔ ورنہ میری کیا اوقات کہ میں کسی کو رکھ سکوں۔“ یہ سوچ کر وہ اٹھ گیا۔ اماں اتنی پریشان لگ رہی تھیں کہ وہ انہیں ٹیوشن ختم ہونے کے بارے میں بھی نہ بتا سکا۔ چپ چاپ جا کر لیٹ گیا۔

”حائم“ دادی کی کڑوری آواز پر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”دادی جان آپ اٹھ گئیں؟“ اس نے بڑھ کر سلام کیا۔

”مجھے معاف کر دے بیٹا“ وہ ایک دم اس کے آگے ٹھکی تھیں۔

”دادی کیا کر رہی ہیں؟“ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔

”مجھے کیوں گناہگار کر رہی ہیں۔ یہ آپ کے بچے کا گھر ہے۔“ وہ ان کو ہانپوں کے حلقے میں لے کر سمجھا رہا تھا۔ اس کا انداز کچھ ایسا تھا کہ ان کے بے چین دل کو قرار آ گیا۔

وہ ساری رات اس کی آنکھوں میں کی تھی۔ جن خاتون کے رعب و دبدبے اور خشونت سے اس کا سارا بچپن ہم گزرا تھا ان کا یہ حال وہ دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ اسے ان سے کوئی شکایت نہیں تھی بہت شکایتیں تھیں اپنے باپ کی معذوری کا وہ کہیں نہ کہیں انہیں حصار ماننا تھا مگر خدا گواہ ہے کہ اس نے کبھی ایسا نہیں چاہا تھا۔

☆ ☆ ☆

صبح وہ جلد ہی آفس کے لیے نکل گیا تھا۔ اس کا اندازہ تھا کہ ابھی کوئی آیا نہیں ہوگا مگر یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ سامنے ہی نرسن بیٹھی ہوئی اپنی چیزوں کو ترتیب سے رکھ رہی تھی۔ معمول کے مطابق وہ اس کو سلام کرتے ہوئے اپنے کہیں کی طرف بڑھ گیا۔

سلام کا جواب دیتے ہوئے نرسن نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی تو وہ مضحک کر رہ گئی۔ وہ بہت پریشان اور آپ سٹ لگ رہا تھا۔ اس کا دل جا ہوا کہ وہ اس کے پیچھے جا کر پوچھے کہ وہ اتنے پریشان کیوں ہے۔ اپنی اس کیفیت پر وہ خود بھی حیران رہ گئی تھی۔ مگر پھر سر جھٹک کر وہ مٹی۔

”میری پریشانی میں اس نے بھی تو میری مدد کی تھی پھر آج اس سے پوچھ لوں گی تو کوئی غلط بات تو نہیں ہوگی۔“ اس نے خود کو تسلی دی۔

”اوپر“ اس نے تہیاری جو ایک اخلاقی قصے سے کی تھی اور تم؟“ دل نے طعنے لگا۔

”نہیں میرے دل میں کچھ نہیں ہے۔“ اس نے بخٹی سے اپنے آپ کو ڈانٹا اور چپکے ہو کر بیٹھی

مٹی۔ ”یہ ابھی ابھی اس کمرے کی طرف تھا جس کی لائٹ ابھی تک نہیں جلائی گئی تھی۔“

”ہر سب کے آنے تک اور کام میں مصروف ہونے کے بعد بھی اس کا دھیان اسی کی لائٹ تھا۔ لاشعوری طور پر وہ خطرہ ہی کہ کوئی اس بارے میں بات کرے۔ مگر کسی نے کوئی ذکر نہیں کیا۔ خود عام بھی جا رہا تھا انداز میں کام میں مصروف تھا۔ مگر اس کی آنکھیں سب کہانی کہہ رہی تھیں۔ جب ہی اس پر انکشاف ہوا کہ وہ اس شخص کی آنکھیں پڑھ سکتی ہے۔ وہ دوسروں کے آنے اکھ پر دے ڈال لے مگر نرسن اس کی آنکھوں میں موجود ہر سوچ کو پڑھ سکتی ہے۔ وہ پھر غمناک رہ گئی۔

پانچ بجتے ہی وہ سب سے پہلے نکل کر بھاگتا تھا مگر آج ساڑھے پانچ ہو گئے تھے وہ ابھی تباہ اپنے کہیں سے نہیں نکلا تھا۔ نہ جانے کیا سوچ کر نرسن نے بھی اٹھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ وہ ابھر کے غیر ضروری کام بننا رہی تھی۔ جب پونے چھ بجے کے قریب وہ جانے کے لیے نکلا وہ مٹی بندی سے سب چیزیں ایسے ہی چھوڑ کر اٹھ گئی۔

”سب آپ ابھی تک یہیں ہیں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”یہی سوال میں آپ سے کروں تو؟“ جو اب وہ اعداد سے مسکرائی تھی۔

”میں تو بس ایسے ہی.....“ وہ آگے کچھ بول نہیں پایا۔ اس کو آگے چلنے کا اشارہ کر کے پیچھے

پلٹ گیا۔

”آپ کچھ پریشان ہیں؟“ بہت جھجک کر اس نے پوچھا۔

”وا ایک دم جھجک گیا۔“

”ہیں۔“ اس او۔ کے۔ کوئی بات نہیں۔“ وہ مسکرایا تھا۔ آج پہلی بار وہ اس کی مسکراہٹ کو اپنے قریب سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے گالوں میں پڑنے والے گہرے ڈبکے سے عجیب اور دلچسپ لطف حجب کیا تھا۔ اس نے بے اختیار نظر سٹھکالیں۔

”آپ کو ٹیوشن کیسے لیے نہیں جاتا؟“ تھوڑی دیر میں اس نے پھر سوال کیا۔ نہ چاہے وہ اس کا دل چاہا اور ہاتھ کا وہ اس شخص سے ہاتھیں کرے کہ وہ اپنا آپ کھول دے۔ اور

”مٹی“ وہ حیرت نظروں سے اچھے دیکھنے لگا۔ وہ کیسے جانتی تھی کہ وہ آفس کے بعد ٹیوشن دے مانے ہا تھا۔ جبکہ اس نے کسی کو کبھی اس بارے میں نہیں بتایا تھا صرف ضم صاحب اور



فیکٹری کے سپرد انٹر مشنل بیگ صاحب جانتے تھے۔ پھر یہ لڑی۔

”آپ کو کیسے پتہ چلا کہ میں؟“ وہ جملہ عمل نہیں کرنے پایا تھا کہ سرین کو اپنی فطرتی کا احساہ ہوا۔ وہ جلدی سے اسے خدا حافظ کہہ کر سامنے سے آنے والی بس میں سوار ہو گئی جبکہ وہ حیرانی سے اسے دیکھتا رہا۔

☆.....☆.....☆

اس دن وہ بہت دنوں بعد فیکٹری کی طرف آیا تھا۔ ساتھی دور کروں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا کیونکہ کے نزدیک اب وہ بہت بڑا آدمی بن چکا تھا۔ وہ ان کی سادہ لوحی پرفنس پڑا۔ سپرد انٹر مشنل بیگ صاحب کے کمرے کی لائٹ چلتی دیکھ کر وہ ہیں آ گیا۔

”میں اندر آ سکتا ہوں سر؟“ دروازے پر کھڑے ہو کر اس نے اجازت طلب کی اور وہ اس کو دیکھتے ہی خوش ہو گئے۔

”ارے تم آ آؤ بھی۔ ابھی تمہارے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ اب تو تم بڑے آدمی ہو گئے ہو۔ ہم لوگ یاد ہی نہیں رہے۔ کیوں؟“ سامنے پڑی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ مسکرائے۔ وہ بھی ہنس پڑا۔

”جانتے دیں سر! کیوں مذاق کر رہے ہیں؟“

”ارے مذاق کی کیا بات ہے۔ تم دیکھنا۔ ایک نہ ایک دن تم بہت آگے جاؤ گے۔ یہ میرا تجربہ کہتا ہے۔“ انہوں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا اور وہ مسکرا کر رہ گیا۔

”عامم! میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا تھا۔ اگر تم نہ اند مانو تو.....“ کچھ لمبے وقفے کے بعد انہوں نے کہا۔

”کیسے سرا میں آپ کی کئی بات کو ماننا نہیں کرتا۔“ اس نے ان کی طرف دیکھا۔

”تمہارا شادی کا کیا ارادہ ہے؟“ انہوں نے آہستہ سے پوچھا۔

”جی سر! شادی؟“ وہ ہکا بکا رہ گیا۔ روٹی، کپڑے اور مکان کی فکر سے نجات ملے تو انسان کچھ اور سوچے۔ جب ہی وہ ان کی یہ بات سن کر حیران رہ گیا۔ ورنہ بات کچھ ایسی تو تھی۔

”ہاں تمہارا شادی کا کیا ارادہ ہے؟“ انہوں نے اپنا سوال دہرایا۔

”سرا آپ تو جانتے ہیں میں ابھی اس پوزیشن میں نہیں ہوں۔“

”بیٹے پوزیشن تو بن چالی ہے۔ اگر کوئی چاہے تو؟“ وہ گہری نظروں سے اُسے دیکھ رہے تھے۔

تری یادوں کے گھار

”سر میں بالکل نہیں سمجھ پا رہا۔ آپ مجھ سے یہ سوال کیوں پوچھ رہے ہیں؟“ وہ واقعی حیران تھا۔ اس سے کبھی کبھی کی ایسے ذاتی موضوع پر گفتگو نہیں ہوتی تھی۔

”عامم میری بھتیجی ہے۔ ماں باپ گزر چکے ہیں۔ میرے ساتھ ہی رہتی ہے۔ مگر عورتوں کی اہمیت تو تم سمجھ ہی سکتے ہو۔ میری بیوی اس کے ہمارے ساتھ رہنے پر خوش نہیں ہے۔ بے چاری فائنل بند کیے رکھتی ہے۔ میں کچھ کہتا ہوں تو اس کی اور زیادہ شامت آ جاتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی شادی کر دوں۔ میری بیوی اپنے بھائی سے اس کا رشتہ جوڑنا چاہتی ہے۔ مجھے وہ لڑکا باطل بھی پسند نہیں ہے۔ عجیب آوارگی ہے اس کے انداز میں۔ میں اس کے لیے تمہارے جیسا لڑکا چاہتا ہوں۔“ وہ تفصیل بتاتے چلے گئے۔ آخری جملے پر وہ اُٹھ چلا۔

”میں؟ سر میرے پاس ایسا کیا ہے جس کی بنا پر آپ یہ سوچ رہے ہیں۔ میرے پاس تو ایک احمک کی نوکری بھی نہیں ہے۔ میں تو آپ کی بھتیجی کو پیٹ بھر کھانا بھی نہیں کھلا سکتا۔“ وہ اُٹھ آیا۔

”بیٹے! صرف پیٹ بھر کھانے والے کی ضرورت نہیں ہے مجھے۔ میں اس کے لیے ایک ٹیبل بچتی اور باکرہ لڑکا چاہتا ہوں۔ ایک ایسا ساتھی جس کے سراپے میں اس کا کردار جھلکا ہو۔ جس کا لہجہ سچا اور نظریں پاکیزہ ہوں۔ ایسے لوگ کبھی نہیں ہارتے۔ آج نہیں تو کل وہ ضرور فائدہ پہنچائے گا۔ میں جانتا ہوں کہ ان ہی میں سے ایک ہو۔ وہ اس کے چہرے پر اپنی نظریں جمائے گا۔“ اس نے کہا۔ اور جہاں تک دوست کی روٹی کھانے کا تعلق ہے وہ خود بھی جاب کرتی ہے اسی فائنل میں۔ تم جانتے ہو گے اُسے۔“

”اسی آفس میں؟“ وہ حیران ہوا۔ ”کون؟“

”سرین نام ہے اس کا۔ ری کپشن پر ہوتی ہے۔“ وہ بتا رہے تھے جبکہ اس کے کانوں میں دن نام کوئی رہا تھا۔

”سرین ان کی بھتیجی ہے۔ جیسی اس کو میرے بارے میں سب کچھ پتا تھا اور شاید اپنے آپ کی وجہ سے وہ اس دن رو رہی تھی۔“ پل بھر میں سب کچھ واضح ہو گیا۔

”سر! سرین جیسی لڑکی سے رشتہ جوڑنا میری خوش نصیبی ہوگی۔ لیکن سر میں واقعی اس پوزیشن میں نہیں ہوں۔ شادی کر کے بیوی کی ذمہ داری اٹھا سکوں۔ آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔“ اس نے لہجہ بڑھایا۔

”بیٹے! اگر تم راضی ہو اور اپنے گھر والوں سے بات کر سکو تو میں انتظار کرنے کو تیار ہوں۔“  
 وہ ابھی بھی اپنی بات پر قائم تھے۔ ”مطلب اگر تمہیں یہ بدشگونہ منظور ہو تو؟“  
 ”سر کچھ بھی بات کرنے سے پہلے میں سرین سے بات کرنا چاہوں گا۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو.....“ اس نے ڈرتے ڈرتے ان کی طرف دیکھا۔ اس کے اس انداز پر وہ ہنس دیے۔  
 ”کیوں نہیں۔ میری طرف سے اجازت ہے۔ تم آج ہی اس سے بات کر سکتے ہو۔“  
 ”لیکن سر میں آفس میں بات نہیں کر سکتا۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں کہیں اور.....“ وہ کہتے کہتے جھجک کر ڈک گیا۔  
 ”ٹھیک ہے بیٹے! مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے۔“  
 ”جینک یووری بی غر!“

”اور گھر سب خبریت ہے؟ بابا کیسے ہیں تمہارے؟“ گفتگو کا موضوع بدل چکا تھا۔  
 شام کو چوتھی کے بعد وہ سرین کی ٹیبل کے پاس آیا۔ وہ اپنی چیزیں سمیٹ رہی تھی۔ آج بھی وہ سفید شلوار اور دوپٹے میں لباس تھی۔ نلکے آسمانی لان کے کڑے پر سفید کڑھالی تھی۔  
 ”ایکسکیوز می س! میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے شائستگی سے اسے مخاطب کیا۔ وہ ایک دم چونک گئی۔

”جی کیسے؟“  
 ”نہیں یہاں نہیں۔ کیا آپ تھوڑی دیر کے لیے میرے ساتھ چل سکتی ہیں؟“ اس نے شائستگی سے کہا۔

”جی..... جی..... جی.....“ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔  
 ”جی۔ ڈونٹ وری۔ میں نے شمشاد بیک صاحب سے اجازت لے لی ہے۔ آپ چاہیں تو ان کو کالٹیک کر کے پوچھ سکتی ہیں۔“ وہ اس کو دیکھ کر وہ گئی۔ ایک لمحہ کو سوچا پھر پرس اٹھا لیا۔  
 ”آئیے۔“ اس نے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔  
 دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے آفس سے نکل آئے۔

”میں آج شمشاد بیک صاحب نے مجھ سے ایک بات کہی ہے۔ کیا آپ اس کے بارے میں جانتی ہیں؟“ وہ آفس کے قریب واقع ایک پارک میں بیٹھے تھے۔ یہ سرین کی تجویز تھی وہ ان دوسری لڑکیوں کی طرح کسی ہوٹل یا کافی شاپ میں نہیں جانا چاہتی تھی۔ جو آفس نام کے بعد کسی نہ

اس کے ساتھ وہاں پائی جاتی تھیں۔  
 ”جی۔“ اس نے پُر سکون انداز میں جواب دیا۔  
 ”آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہے؟“ عاصم نے ایک نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔  
 ”اعتراض کس بات کا؟ آپ میں کس چیز کی کمی ہے جو میں اعتراض کرتی؟“ اس کے اصرار میں ذرا تھراہٹ فرق نہیں آیا تھا۔  
 ”میں آپ جانتی ہیں کہ میرا تعلق کوئی ویل آف جلی سے نہیں ہے۔ ویل آف جلی تو کیا میرا تعلق تو ایک نہایت غریب جلی سے ہے۔ میری یہ جاب عارضی ہے اور آل میرے پاس ایسا کچھ بھی نہیں ہے جس کی بناء پر کوئی مجھ سے شادی کرنا چاہے۔ یا میں کسی سے شادی کا سوچوں۔ کم از کم اس انتخاب پر آپ میری بات سمجھ رہی ہیں ناں؟“

”جی میں بہت اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔ لیکن میں صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ اگر تیار ہو تو آپ کو میرے لیے مناسب سمجھتے ہیں تو میں ایک لفظ بھی نہیں کہوں گی۔ چاہے آپ کے پاس کچھ ہو یا نہیں۔ لیکن اگر میری رائے ماننا چاہتے ہیں تو مجھے صرف ایک ایسا صبر چاہیے جس کے پاس بھلے دولت نہ ہو مگر وہ ایک سچا اور دکھرا انسان ہو۔ عورت کی عزت کرنا چاہتا ہو اور بس۔ آپ میں یہ خوبیاں میں نے دیکھی ہیں۔“ اس نے پُر سکون انداز میں اپنا نقطہ نظر واضح کیا۔

”میں آپ میرے بارے میں سب کچھ جانتی ہیں۔ میں آپ کو صاف صاف بتانا چاہتا ہوں۔ یہ سچ ہے کہ میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ میرے والد قانع کے سر بیٹے ہیں۔ میرا گھر کرانے کا ہے۔ میں گھر کا واحد کٹھن ہوں۔ جبکہ میرے گھر میں والدین کے علاوہ میری راوی اور میرے تین چھوٹے کزن بھی رہتے ہیں۔ جن کی پڑھائی اس وقت میری سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔ میری تنخواہ آٹھ ہزار روپے ہے۔ اس کے علاوہ میں نیوش پڑھاتا تھا جو ابھی کچھ دن پہلے ہی ختم ہوئی ہے۔ اور اب میں دوسری ٹیوشن کی تلاش میں ہوں۔ اس کے علاوہ میں ایک دو بڑی بڑی روکانوں پر حساب کتاب کا کام کرتا ہوں۔“

یوں سمجھ لو جہاں سے چار پیسے جائز طریقے سے مل جائیں وہ کام کر لیتا ہوں۔ میں آپ کو یہ ان لیے بتا رہا ہوں کہ میں نہیں چاہتا کہ آپ اتنا بڑا فیصلہ لائیں جس میں کریں۔ یہ میرے حالات اور میری ذمہ داریاں ہیں۔ میں نے سب کھول کر آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ ہاں ایک بات ضرور کہوں گا کہ حالات خواہ اچھے ہو جائیں یا حریہ مچ جائیں۔ میں اپنی ذمہ داریوں سے کبھی منہ نہیں

وہ اب خاموش ہو چکا تھا۔ نسرین خاموشی سے اس کا ایک ایک لفظ دل میں اتار رہی تھی۔ اور ہر لفظ اس کی عزت بڑھا رہا تھا۔

میں نے سب کچھ آپ کو بتا دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اچھی طرح سے اس بارے میں سوچیں اور پھر فیصلہ کریں۔" اس نے ایک نظر خاموش بیٹھی نسرین پر ڈالی۔

"پلیس؟" وہ نہ سکون انداز میں بولی۔

"جی۔" وہ آنکھ کھڑا ہوا۔

"جانے سے پہلے میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ میرا جواب اب بھی وہی ہے جو پہلے تھا۔ آگے آپ کی مرضی۔" یہ کہہ کر وہ کی نہیں تیز قدم بڑھاتی ہوئی پارک سے باہر نکل گئی۔ جبکہ وہ وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

رات کو جب وہ سونے کے لیٹا تو وہ تنہا نہیں تھا۔ ایک خیال اس کے ہمراہ تھا۔ وہ اُن حالات پر حیران تھا جس لڑکی کو ایک نظر دیکھتے ہی دل نے پسند لی کی سند عطا کر دی تھی وہ اتنی آسانی سے اس کی ہو سکتی تھی۔ مگر اس کے دل و دماغ میں ایک جنگ چھڑ گئی۔

"کیا یہ صحیح ہے؟ ہر لڑکی کا حق ہوتا ہے کہ اسے ایک ایسا شریک سناڑے جو اسے دنیا بھر کی خوشیاں دے سکے۔ میں اس کو کیا دے سکتا ہوں؟ کچھ بھی تو نہیں۔ زندگی محض جذبات کے سہارے نہیں گزرتی۔ بھوک اس دنیا کی سب سے تلخ حقیقت ہے۔ آج اگر وہ مجھ سے متاثر ہو کر یہ رشتہ جوڑ رہی ہے مگر کل؟ کل کیا ہوگا؟ جب اس کو اس گھر میں بے تحاش مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ایک وقت کھانا کھاتے ہوئے دوسرے وقت کھانے کی فکر ستائے گی۔ زیور، پیکر، ہر لڑکی کی خواہش ہوتا ہے۔ میں تو اسے اچھی کو کافی کی آدنی فیشیل جیواری بھی نہیں دے سکتا۔ نہیں۔ میں ابھی کوئی فیش رفت نہیں کر سکتا۔ تھوڑا سوچ بچار کرے گی تو خود ہی مجھ لے گی۔" اس نے کروت بدل لی۔

"اور تم..... کیا تم اپنے دل کو سمجھاؤ گے.....؟" عامر احمد تم لاکھ پر دے ڈالو لیکن تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تمہارے دل میں کہیں نہ کہیں اس کی محبت موجود ہے۔ کیا تم اپنی محبت حاصل کرنا نہیں چاہتے، دل نے اُس کا کیا تو وہ آنکھ بیٹھا۔"

"نہیں۔۔۔ یہ صحیح نہیں۔ محبت خود غرضی نہیں سکتا۔ اگر میں اپنی محبت کو مسائل کے اس انبار میں لے آؤں۔ یہ محبت نہیں خود غرضی چھوگی۔ اگر میں اس سے محبت کرتا ہوں تو یہی چاہوں گا کہ اس کی شادی کبھی بہت اچھی جگہ ہو۔ جہاں اس کو سب کچھ ملے۔ اچھا چاہنے والا شوہر جو اس کی ہر خواہش پوری کرے۔ جس کے گھر میں اسے کسی چیز کے لیے ترسانہ نہ پڑے۔ میں یہ نہیں کر سکتا۔" وہ فیصلہ کر کے چٹ گیا۔

"نسرین! تم اچھا اچھی ہو کہ کوئی بھی تمہیں پا کر خود پر غر محسوس کرے گا۔ مگر میں تمہارے ساتھ یہ بات نہیں کر سکتا۔ اگر میرے پاس ایک گھریلو ملک کی نوکری ہوتی تو شاید میں کبھی پیچھے نہ جتا۔ مگر فحسوس امیرے پاس ایسا کچھ نہیں تھا۔ مگر یہ بھی جگہ ہے کہ میں نے واقعی تم سے محبت کی ہے۔ جس میں اتنی طاقت ہے کہ میں ساری زندگی اسی کے سہارے گزار سکتا ہوں۔" اس نے آنکھیں موند لیں۔

اور وہاں سے بہت دور اپنے گھر کی کھڑکی سے چاند کو بکھتی نسرین سوچ رہی تھی۔

"کیا چیز ہو تم عامر! میں ہمیشہ سوچتی تھی کہ نہ جانے تمہارے اندر کیا متناطیبت ہے کہ ہر کوئی تمہاری طرف کھینچا چلا آتا ہے۔ خود میرا دل کب تمہارا ہو گیا۔ مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔ مگر آج میں جان گئی ہوں کہ وہ کشش..... تمہارے اندر موجود خوب صورت دل پاکیزہ اطوار ہیں۔ جو ہر کسی کو تمہاری طرف متوجہ کر دیتے ہیں۔ آج کے بے رحم معاشرے میں کون ہوگا جو اتنی ذمے داریاں اپنے کندھے پر اٹھائے ہوئے ہوگا۔ کون ہوگا.....؟ جو اپنی محبت کو اتنی آسانی سے قربان کر سکے گا؟

ہاں عامر احمد! کیا میں کبھی تمہیں بتا پاؤں گی کہ میں تمہاری آنکھیں پڑھ سکتی ہوں۔ آج سے نہیں۔ نہ جانے کب سے اور ان ہی آنکھوں کو پڑھ کر میں یہ جان پائی کہ تم بھی مجھ سے اتنی ہی محبت کرتے ہو جتنی میں تم سے۔ مگر تمہارے جتنا بڑا دل نہیں ہے۔ میرے پاس میں تمہیں کھو کر جی نہیں پاؤں گی۔ نہیں جی پاؤں گی تمہیں کھو کر۔ تم جب نظریں اٹھا کر کسی لڑکی کو دیکھتے ہو تو کتنی پائیز کی ہوتی ہے ان نظروں میں اور میرا جی چاہتا ہے کہ تم ساری زندگی مجھے ہی دیکھتے رہو۔ تم اب بات کرتے ہو تو تمہارے لہجے میں سچائیاں جھلکتی ہیں۔ دل کرتا ہے کہ تم ساری زندگی ہاتھ لیتے رہو اور میں تمہیں سنبھالتی رہوں۔ تمہیں بکھتی رہوں۔

ان شفاف آنکھوں کو۔ اس پاکیزہ چہرے کو۔ جب تم مسکراتے ہو تو تمہارے گالوں میں



تری یادوں کے گلاب  
چڑنے والے تصور میں کتنے دل ڈوب جاتے ہیں۔ اگر میرا دل ڈوب گیا تو کیا عجب تم کہتے ہو  
تمہارے پاس کچھ نہیں۔ ٹھیک کہتے ہو تم تو وہ پاس ہو جو خود تو ایک جگر ہو؟ ہے مگر ہر سس ہونے  
والی چیز کو سوتا بنا دیتا ہے اور تم کہتے ہو کہ میں تمہیں کھودوں۔ کبھی نہیں۔ میں تمہیں کبھی بھی کھو نہیں  
سکتی۔ میں رو ہی نہیں سکتی۔ تمہارے بغیر وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

اگلی صبح نرسن کی نیکل کے پاس سے گزرتے ہوئے عامم کے پاؤں رنگ سے مجھے۔ معمول  
کے انداز میں سلام کرتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ نرسن نے اس کا ہتھنا محسوس  
کیا۔ وہ کیسے نہ جان پاتی کہ اس کے دل میں کیا چل رہا تھا۔ سر جھکا کر وہ بھی اپنے کام میں  
مغروف ہو گئی۔ آفس نام شتم ہی ہونے والا تھا کہ چڑاسی نے عامم کے کمرے میں جھانکا۔  
"سرنی! آپ کو ایم ڈی صاحب بخار ہے ہیں۔" وہ جوں جوں کہ سوچوں میں گم تھا ایک  
دم پریشان سا ہو گیا۔

"ایم ڈی صاحب مجھے بخار ہے ہیں مگر کیوں؟" وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"سرنی! بھلا مجھے کیا پتہ کہ وہ آپ کو کیوں بخار ہے ہیں؟ وہ اپنی باتیں مجھے سمجھنا ہی بتاتے  
ہیں۔ کسی وی کمال کر دے او۔" وہ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔  
"واقعی! بھلا اسے کیا پتہ۔" دوسرے جھک کر رہ گیا۔

"بیٹے عامم صاحب! آپ کو یہاں سے بھی دیکس نکالا ملے ہی والا ہے۔ پھر سے وہی  
فیکٹری اور وہی لوگ۔" وہ اپنے آپ پر جفا۔

ایم ڈی کے دروازے پر دستک دی تو وہ اپنا دل کنبی میں دھڑکتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔  
"نہیں....." اندر سے ہار عبا آواز آئی۔

اندر داخل ہوا تو پورا ہینکل جیٹا ہوا تھا۔ ایم ڈی کے علاوہ جنرل فوج اور اکاؤنٹس منیجر  
بھی تھے۔

"تمہیں....." انہوں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ جلدی سے بیٹھ گیا۔

"آپ یہاں اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں کب کام کر رہے ہیں؟" انہوں نے دھننے سے  
اسے دیکھا۔

"جی سر! تقریباً آٹھ مہینوں سے۔"

"ہوں۔ اس سے پہلے آپ فیکٹری میں تھے؟"

تری یادوں کے گلاب

"جی سر!"

"اگر تھے تو وہاں؟"

"سر۔ جنرل لیبر۔"

"آپ کا پورٹ فولیو میں نے دیکھا ہے۔ مگر بجوٹ ہیں؟"

"جی سر!"

"پھر آپ جنرل لیبر میں کیا کر رہے تھے۔ مطلب آپ پڑھے لکھے ہیں کسی ڈسٹنکٹ کی  
لاری میں کیوں نہیں گئے؟"

اس سوال پر وہ بھٹا گیا۔ جی تو جا ہا کہ کہہ دے کہ مجھے شوق تھا ایک اچھی معقول نوکری چھوڑ  
رہا ہوں۔ مگر وہ ایم ڈی تھے۔ یہ جواب صرف دل میں دیا جاسکتا تھا۔

"سر مجھے ضرورت تھی۔"

"آپ اس وقت اس پوسٹ پر ایف ڈاک میں پر تھے؟"

"جی سر!"

"عامم صاحب! آپ ہمارے ساتھ پچھلے آٹھ مہینوں سے کام کر رہے ہیں۔ ہم نے آپ کو  
انہیں طرح آپز رو کیا ہے کہ آپ اس سیٹ کے لائن میں جائیں اور آج ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں  
کہ انہوں نے بات اور دوسری چھوڑ کر اس کو دیکھا۔ وہ ضبط کی آخری منزلوں پر تھا۔

"یہ آرٹیکل انہوں نے مسکراتے ہوئے ایک بند لٹافہ بڑھایا۔ وہ ساکت بیٹھا رہا۔ اس  
نی کہو میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔

انہوں نے دوبارہ کہا تو وہ ہوش میں آیا۔ لرزاتے ہاتھوں سے وہ بند لٹافہ اس نے قیاما  
تھا۔ وہ اپنا ہینٹ لیٹر تھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر لٹکائیں میں آ رہا تھا۔ اس کی کیفیت ایسے صحرانورد  
کی تھی جو زور سے سراب کا تھکا کر کے بے حال ہو چکا ہو اور جب وہ تھک کر گر جائے تو  
اول برس جائیں۔

"مسٹر عامم! ایم ڈی صاحب نے اسے متوجہ کیا۔ وہ ایک دم ہوش میں آ گیا۔

"تھیک ہو سر! تھیک ہو میری بچی۔" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ کتنا کڑا انتظار کیا تھا اس  
کو ایک لمحے کے لیے۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ آپ کی محنت کا نتیجہ ہے۔ ہم آپ کو فی الحال میں ہزار دیں



مذہبی ہوئیں اور جب کھڑی ہی نہ ہوئیں گی تو کیا خاک بس اسٹاپ پر بس کا انتظار کر کے اس عمارت کے استعمال کا موقع مل فراہم کر سکیں گی کہ بھی ہمارا دل گردہ ہے۔" ذریاب کھڑی ہو کر دیوار پر کھٹکھٹا کر بولی۔

"کیسے اس ایم ایس سی کی اسٹوڈنٹ نے کسی تفریح کی آپ کے عمارت کی۔ دیکھ رہی ہیں اماں جی آپ اس کی زبان۔" انیشا مسکرائی۔ "آپ تو کہتی ہیں کہ لڑکیوں کو اتنا نہیں ہونا چاہیے۔"

"اورے ہاں ٹھیک ہے۔" اماں جی نے ذریاب کی طرف متاثرہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اپنے ہی گھر میں تو بول رہی ہے اور کہاں جائے گی بولنے۔ یہی تو زمانہ ہے بیٹا تم لوگوں کے بننے بولنے کا۔" پھر وہ آزدہ لہجے میں بولیں۔

"خدا تم لوگوں کے نصیب اچھے کرے۔ لڑکیاں تو اپنے پیکے میں بس ایک چلتا پھرتا سایہ ہیں۔" اماں جی کی پٹلیں جھجک چلیں۔ ذریاب نے ماحول کی سنجیدگی دیکھ کر فوراً اپنکلا چھوڑا۔

"ارے اماں جی۔ میرا چلتا پھرتا سایہ تو کہیں جاتا تا نہیں۔ یہ تو جھوٹ کی طرح آپ سے ہٹا رہا ہے۔ ہاں اب آپ جلدی سے آپا کے ہاتھ پٹے کر دیں۔ دو سال ہو گئے انھیں ملازمت کرتے ہوئے۔ اب تو ان کا جینز بھی تیار ہو چلا ہے۔"

"بکومت جی تم! انیشا کا چہرہ حجاب سے گلاب ہو گیا۔ پھر وہ سی جلد پٹکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔

"اماں جی آپ نے وہ بھائی صاحب کا رشتہ تو کھٹائی میں سی ڈال دیا اور پشاپ اسکی نرمی جی نہ تھی۔ بس ذرا رنج سا نوالا ہے۔"

"نہیں رنج۔ دھمک کا کیا ہے اللہ نے دیا ہے۔ لیکن بیٹا اتنا بڑا گھر انہیں میں رہ نہیں سکتا۔ میں اپنی حیثیت دیکھ کر سی آگے بڑھنا چاہیے۔" اماں جی نے جھوٹی ہلکی سیستے دیکھ کر ذریاب کا ہاتھ خود سی آواز دینے لگی۔

"رضیہ ہوا۔"

"حاضر سائیں! ذریاب آگے بڑھ کر ہاتھ باندھے سامنے آکھڑی ہوئی۔" رضیہ ہوا ان مرثام سی چلی گئیں ان کے سر میں درد تھا اب یہ ہوا ذریاب حاضر ہے۔" انیشا کھٹکھٹا کر فہمی۔

## اور فضا میں گنگنا اٹھیں

انیشا نے کٹھمی دیکھی اس میں بہت سے بال اٹکے ہوئے تھے سامنے سی ای بیٹھی ہوئی تھیں۔

"دیکھ رہی ہوا اپنے بالوں کا حال۔ سو پار کیا ہے کہ بٹھے میں دو تین بار سر میں تھوڑا سا تیل ڈال لیا کرو اور سیکا کافی سے سردھو یا کرو لیکن انیشا بی بی ہیں کہ جھاڑ جھکاڑ سونگے بال لٹکائے لٹکائے پھرتی ہیں۔ سواگر کی چوٹی آدھی بھی نہیں رہی۔"

"اماں جان اتنا وقت کہاں ملتا ہے کہ ہم یہ سب کھڑاک کریں۔ انیشا کے چہرے پر یک لخت تھکن کے آثار پیدا ہو چکے۔"

"اب دیکھیے کہ کافی سے واپسی ہوتی ہے تو گھر کے کام نکل آتے ہیں پھر کم بخت آنے جانے کا عذاب بھی آپ کو جو روز میں بیٹھنا پڑ جائے تو کانوں کو ہاتھ لگا کر گھر بیٹھے جائیں۔ ایمان سے اماں جی بڑا دل گردہ ہے ہمارا آپ کو نہیں معلوم۔"

"آپا انیشا یہ دل گردے کا عمارہ ہے کیا؟ ہمارے پٹے تو بڑا نہیں۔" ذریاب فوراً بول پڑی۔

"ابھی لیے تو کیا ہے بزرگوں نے بی بی کہ تھوڑا سا ادب بھی پڑھنا چاہیے۔ اب دیکھو یہ عمارہ اگر کہیں کسی محل میں کوئی استعمال کرتا تو تم تو بس ہونٹوں کی طرح منہ کھتی رہ جاتیں۔"

"گاہے کو ہنسنے لگتے رہ جاتے واہ....." ذریاب نے اپنی ہی ہی چٹکتی آنکھیں چھرائیں۔

"آپ ادب کے حوالے سے دل گردے کی طاقت ثابت کرتیں تو ہم سائنس کے ذریعے سے دل گردے کے فوائد ثابت کرتے کہ آفران کی جسم میں موجودگی کا کیا جواز ہے اور اگر یہ دونوں بھی یعنی دل اور گردے صحت مند نہ ہوں تو محال ہے کہ آپ اپنے پیروں پر



تری یادوں کے گلاب

”چلو پھر ہم دونوں ہی مل کر کام سیٹ لیں۔“ اس نے زہباب کے ہاتھ میں ڈش پکڑاتے ہوئے کہا۔

”آپانیٹھا یہ سب میں کرلوں گی۔ آپ اماں جی بھیا کے رشتے کی بات پکی کر لیں۔ اب اس گھر میں بھوکا آنا ضروری ہو گیا ہے۔ ہاں اماں جی تنہائی سے بہت گھبرانے لگی ہیں۔“

”تم بھی ٹھیک کتنی بوزر باب۔ اچھا چلو پہلے میں ذرا ہاتھ دھو لوں پھر اماں جی سے باتیں ہوں گی۔ ہاں یہ بھائی صاحب کہاں رہ گئے۔“

”نیکو تو قسمی ہے ہمارے۔“ زہباب نے منہ بنا کر کہا۔

”اتنی محنت سے تو آج ہم نے کھانا پکا یا اور وہ چلے گئے اپنے دوست کے گھر دعوت اڑانے۔“

”اس کا پروگرام پہلے سے بنا ہوا تھا۔“ اماں جی پولیس۔

”تم نے اس سے پہلے پوچھ لیا ہوتا۔“

”میں ذرا کچھ انکشاف کرنا چاہتی ہوں اپنی قابلیت کا۔ ان سے اس طرح پچکر دکھانے کا وعدہ بھی تو لیا تھا۔“ زہباب جاتے جاتے بولی۔ وہ پھر دروازے پر دھک مچی۔

”آپانیٹھا اگلا پروگرام آپ کے کھانے کا ہے۔ ابھی سے طے کر لیں کہ آپ کیا کھلا رہی ہیں اگلے ہفتے۔“

”واہ ابھی سے کیوں بتائیں۔ ہم ایک نئے ڈش کھلائیں گے۔ بس اتنا بتا دیجئے ہیں کہ اس میں جدت ہوگی۔“

”سمجھتی ہیں۔“ زہباب نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”پرس خوب بھاری ہو رہا ہے نا آپ کا تنخواہ لی ہوگی۔“

”جی نہیں محترمہ تنخواہ کا معاملہ تو کھائی میں پڑا ہوا ہے۔ کل نیچر ڈکا ایک وفد ڈائریکٹر تعلیمات سے بھی ملا تھا، دیکھیں کب معاملہ بننا ہے۔ یہ تو اپنی پارٹ ٹائم ٹیوشن کا نذرانہ ہے چھ۔“

”میں نے کتنی بار تم سے کہا ہے کہ یہ ٹیوشن وغیرہ چھوڑ دو۔ لی ایڈ کیا کیا تم نے کس مشین کی طرح ٹھٹھکی ہو۔“ اماں جی نے غصے سے کہا۔

”اماں جی میں وقت ضائع کرنے کی قائل نہیں۔ ہم سب کی محنت نے ہی اس گھر میں

تری یادوں کے گلاب

”نہیں کے دروازے کھول دیئے ہیں۔“ انیشٹا نے اماں جی کے گلے میں ہاتھ ڈال دیں۔

”اب آپ تو بس بھائی جان کی شادی کا معاملہ نسا دیں پھر ہماری اس چھوٹی سی جنت میں بہا رہی بہار ہوگی۔“

”اماں نے انیشٹا کے ماتھے پر پیار کرتے ہوئے اسے اپنی گود میں لٹالیا اور بولیں۔

”ایک آدھ دن بعد تم چھٹی لے لو تو ہم بیگم زبیدہ کے ہاتھ جا کر لڑکی دیکھا آئیں۔ انھوں نے ایک لڑکی دکھانے کو کہا ہے۔“

”اماں جی آپ بیگم زبیدہ کے بچہ میں تو نہ پڑیں۔“ انیشٹا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”یہ شادی کے ارے تو پیسے اٹھنے کے کاروبار میں لگے ہوئے ہیں۔“

”ارے نہیں بی۔ اب دیکھو اٹھار صاحب کی دو لڑکیوں کی شادی آخر بیگم زبیدہ ہی نے کرائی ہے۔“

”ہمیں تو انھوں نے اب تک پچکر ہی لگوائے ہیں بس۔“ انیشٹا نے بھڑکائی سے کہا۔

”بھئی کسی جج کی لڑکی دکھائی ہے تو کبھی کسی سی ایس پی آفیسر کی بہن اور آپ بڑے گھر کی لڑکی کے لیے مرضی نہیں ہوتیں۔“

”چند اکاشف میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ اپنی چار سے زیادہ بیویاں کر میں بیٹا کون نہیں چاہتی۔ مجھے نہیں چاہیے یہ دولت دولت۔ میں تو بس سیدھی سادی گھر لڑکی چاہتی ہوں تاکہ میرے گھر میں پرانا جتنا رہے اور پھر جوڑ سنا سناؤں پر لگے ہوتے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو یہ مرحلہ بھی طے ہوتا ہے گا۔ تم پر سون کی چھٹی لے لو تو ہم جا کر لڑکی دیکھ آئیں۔“

”اماں میں بھی چلوں گی۔“ زہباب بولی۔

”بائی تم کیا کر دگی جا کر۔ کوئی جمع لگاتا ہے۔ بس میں اور انیشٹا چلے جائیں گے۔“

”اور لی زہباب۔“ انیشٹا بولی۔

”وہ جو آپ کھانے کے بعد ایک ایک پیالی چائے پلا کر کرتی ہیں وہ کیا ہو گئی؟“

”اللہ آپانیٹھا ہم بہت تھک گئے ہیں آج۔“ زہباب نے منہ بنایا۔

”مرضی خدا کی۔“ انیشٹا نے مصنوعی آواز بھرتے ہوئے کہا۔

”آج اللہ میاں نے مقدر میں چائے نہیں لکھی۔“

”چلو میں بنائے دیتی ہوں۔“ اماں بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

ہاوی قوت بھی اُجاگر کر رکھی ہے تاکہ زندگی کے کسی بھی سوز پر ان کا عمل انفرادی سوچ کا حامل نہ ہو۔  
لیونگ انجی سوچ کے بغیر انسان کی شخصیت نامکمل رہتی ہے۔

عابدہ بیگم کو اماں کا یہ انداز بھانپا گیا اور پھر روز بروز بعد ہی وہ بیگم زبیدہ کے ہمراہ اماں جی کے گھر میں موجود تھیں۔ انھوں نے انیشا کو مانگ لیا اور اماں جی بھونچکا سی رہ گئیں۔ وہ شروع ہی سے اپنی برابری کے لوگوں میں رہنے کی قائل تھیں اور عابدہ بیگم لاکھوں کی جائیداد کی مالک تھیں جس کا حجاب وارث ان کے بعد ان کا انکوتا عاقل تھا۔ شوہر کے اچانک انتقال کے بعد عاقل بی بی اب ان کی کل کائنات اور مرکز زندگی تھا۔ وہ چاہتیں تو رئیس ابن رئیس کی بیٹی بیاداتیں لیکن انھیں محض عاقل کی بیوی کی ضرورت نہ تھی انھیں ایک بہو بھی چاہیے تھی جو انھیں سمجھ سکتی۔ ان سے نباہ کر سکتی اور اماں جی سے ملنے کے بعد انھیں اماں جی کی بہت سی خوبیاں انیشا میں نظر آئیں لیکن اماں جی تھیں کہ کسی طرح اس رہنے پر راضی ہوتی نظر نہیں آتی تھیں۔

عابدہ بیگم نے نماز عارنا نہیں بلکہ سچ سچ عی جی اپنی جوتیاں گھسوالیں۔ وہ پہلی بار اپنی کار میں آئیں اور اس کے بعد ان کی کار بھی اماں جی کے دروازے پر نہیں دیکھی گئی۔ وہ اماں جی کے پاس آتے وقت کار کو آدھ میل پر سے چھوڑ دیتیں اور پیدل آئیں۔ پھر ان کی وہابی بھی اس طرح ہوتی بلکہ خراں کی یہ اور اماں جی کے دل میں اثر گئی۔ انھوں نے ڈنگا تے دل سے حافی بھرتی اور پھر چند معمولی جڑوں اور ہلکے پھلکے فروز کے ایک سیٹ کے ساتھ ماسا کی ڈیروں دعاؤں کے سائے تلے انھوں نے انیشا کے کوپیا کے گھر سدھار دیا۔ یہی عابدہ بیگم کی بھی خواہش تھی۔ انھوں نے جیز لینے سے سختی سے انکار کر دیا تھا اور اماں جی کے سامنے ہاتھ تک جوڑ لیے۔ اماں جی کو بیٹی کی سسرال کی خوشنودی بھی عزیز تھی اور پھر ان کے لئے سب سے بڑی دولت تو عاقل تھا انیشا کی زندگی کا رفیق اور نمونہ۔

اس محل نما کوٹھی میں آکر انیشا گھبرا گئی۔ اس نے اب تک امارت کی صرف شہرت سنی تھی یا ایسی شاندار کوشیاں فلموں میں دیکھی تھیں۔ اس نے تو کبھی بھول کر بھی ایسا کوئی خواب نہیں دیکھا تھا جہاں قدموں تلے تھلیں فرش بچے ہوتے ہیں اور خواب گاہیں روایتی شہزادوں کے کمروں کی طرح آراستہ ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی وہ محسوس کرتی کہ وہ واقعی بیداری کے عالم میں نہیں لیکن ابھی اس کے دلہنپن کے دن ختم نہیں ہوئے تھے اور خوابیدگی کا یہ عالم اسے بہت بھلا لگ رہا تھا مگر یہ خواب تھا تو وہ چاہتی تھی کہ وہ اس خواب سے کبھی نہ جاگے لیکن وقت کو کبھی قرا نہیں ہوتا۔ وہ کبھی ختم نہیں

”اے اماں جی آپ۔۔۔“ انیشا بھی بڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔  
”اماں جی پھر میں ہی بتائے دیتی ہوں۔“ زور یاب نے مری ہوئی آواز میں کہا۔  
”کوئی بھی نہیں۔ تم دونوں جاؤ کرے میں۔“ اماں جی نے حکم لگایا۔ اب کس کی مجال تھی جو چوں بھی کرے۔ تھوڑی دیر بعد چائے پیتے ہوئے انیشا سوچ رہی تھی کہ اللہ میاں نے ماں کے پاؤں تلے جنت بلا وجہ تو نہیں رکھی اور کیا آسمان والی جنت اس جنت سے زیادہ دلکش ہو سکتی ہے جس میں وہ سانس لے رہی ہے۔

اور واقعی اماں جی کے تدبیر اور سوچہ بوجھ نے اس چھوٹے سے گھر وندے کو ایک جنت کا روپ دے رکھا تھا۔ جہاں دولت کی ریل ٹیل نہ تھی لیکن طنائیت کا بیش بہا خزانہ تھا۔ سکون اور مسرت کے خوشگوار جھونکے تھے کہ ہر فرد اپنی نیند سوتا اور اپنی نیند جاگتا۔ اماں جی نے گھر کے ہر فرد میں اپنی اپنی ذمہ داری کا بھرپور احساس اُجاگر کر رکھا تھا اور ایک جگہ بھی ادھر سے ادھر نہ ہوسکا۔ کاشف نے اپنی تعلیم ختم کر کے ملازمت ڈھونڈ لی اور اپنی جہد و جد سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ انیشا نے تعلیم ختم کر کے ملازمت نہ ملنے تک نیوٹن کر کے اس گھر وندے کو سہارا دینے رکھا اور زور یاب اب اپنی تعلیم کی تکمیل کے آخری مراحل سے گزر رہی تھی اور اب اماں جی کی خواہش تھی کہ پہلے انیشا کی ذمہ داری سے فارغ ہو لیں تو پھر انیشا اور زور یاب کا اصرار تھا کہ آئینہ میں پہلے بھابی کے کھنڈے کا چاند چمکے۔ چنانچہ بیگم زبیدہ کے تعاون سے لڑکیاں دیکھی جا رہی تھیں اور اب کہ جب بیگم زبیدہ انھیں لڑکی دکھانے لے گئیں تو صورت حال کچھ اچانک ہی بدل گئی۔ اماں جی کو گھر اند بھی پسند آ گیا اور لڑکی بھی۔ بس بات یہاں اگئی کہ کاشف میاں لڑکی کی تصویر دیکھ کر حافی بھرتی تو نہ مٹھا کر دیا جائے۔ لیکن شادی سال بھر بعد ہونے چاہی تھی۔

اماں جی اپنی ہونے والی سحرمن قارحہ بیگم سے ان ہی مسائل پر گفتگو کر رہی تھیں۔ اس موقع پر قارحہ بیگم کی ایک دور کے رشتہ کی بہن عابدہ بیگم بھی موجود تھیں۔ اماں جی چاہتی تھیں کہ قارحہ بیگم سال بھر کی مدت میں کچھ کی کر دیں۔ جب عابدہ بیگم ہنس کر بولیں۔  
”بہن پہلے آپ کاشف میاں کا عقد یہ تو لے لیں۔ ابھی تو یہ مرحلہ بھی باقی ہے۔“ اماں جی نے غصے سے کہا۔

”عابدہ بیگم! تو آپ صرف رکی کاروائی سمجھیں۔ خدا کے فضل سے میں نے اپنے بچوں میں خود بخوبی کے احساس کے ساتھ ساتھ ذمہ داری اور خود اعتمادی کا بھرپور جذبہ اور حالات سے

روہ جاتا اور اس کے دلہنا پے کا وقت بھی گزر گیا۔ جب اس نے دھیرے دھیرے گھر کی دیکھ بھال کے کاموں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ عابدہ بیگم بھی چاہتی تھیں۔ نوکروں کی چاہے ایک فوج سی کیوں نہ ہو لیکن گھر والی کی توجہ سے بغیر گھر گھر کے بجائے مسافر خانے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ دولت کی فراوانی کے باوجود عابدہ بیگم کی سرگرمیاں گھر کی چار دیواری تک محدود تھیں۔ انھیں بکریوں اور پارٹیوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی وہ نام نہاد سوشل ورک کی بھی قائل نہ تھیں۔ ان کے نزدیک صحیح معنوں میں سوشل ورک یہی تھا کہ غور قوتوں میں اپنی ذات کو بگھنے اور پچھانے کا شعور پیدا ہو جائے۔ اس کے بعد عورت چاہے کسی سڑک کی پتھریلی زمین پر بیٹھ کر روزگار حاصل کرے یا اسکرین کے جگمگاتے پردے پر اپنے فن کا مظاہرہ کرے، اس کی شخصیت میں ایک وقار ہوگا۔ دودھ دار جو دیکھنے والی لگا ہوں میں ہوں کی چنگاڑیوں کو پیدا کرنے کے بجائے احترام کے دھجے دم چرائے روشن کر دیتا ہے۔

انیشتا اور مانگ نادلوں اور کہانوں کی ہیروئن کی طرح بے پناہ حسنین نہ تھی۔ نہ ہی قدرت نے اسے باوای آٹھیں عطا کی تھیں۔ چلتے وقت اس کی کمر میں تل بھی نہیں پڑتے تھے۔ لیکن چال میں ایک دم دار عورت کا سا وقار ضرور موجود ہوتا تھا۔ پلکیں بھی اتنی لمبی نہ تھیں کہ وہ دھواں فوٹو پارٹیاں سے تھک جاتیں لیکن وہی پلکیں اپنے سے بڑے کو سامنے دیکھ کر احترازاں تھک جاتیں تاکہ نگاہوں کو بے باکی سے اٹھنے کا موقع نہ ملے۔

خودداری اس کے کردار کا سرمایہ تھی۔ لیکن خودداری کی حد تک نہیں۔ یہی اماں جی کی تربیت تھی وہ جانتی تھی کہ شادی کے بعد کی زندگی کیسی آزمائش کی زندگی ہوتی ہے۔ ایسے لمحے بھی آتے ہیں کہ عورت کو دنیا میں ہی ملے صراط کی دھار پر چلنے کی لذت سے آشنا ہونا پڑتا ہے اور ثابت قدم رہنے پر پید دنیائی جنت نظر آنے لگتی ہے۔

انیشتا کو بھی ایسے ہی آزمائشی لمحوں سے پار ہا کرنا پڑا۔ عاطف اس کا محبوب تھا لیکن شوہر پہلے تھا اور شوہر کے حواجز کو کھٹا کھٹا آسان بھی نہیں ہوتا۔ عاطف کو اپنے کاروبار کے مسائل سے بہت کم فرصت ملتی۔ لیکن جو وقت بھی ملتا وہ اسے انیشتا کی معیت میں گزارتا۔ علاوہ کھردہ داری دعوتوں کے کلب میں پارٹی ہو یا دیگر تفریبات انیشتا عاطف کے ہمراہ ہوتی اور عابدہ بیگم کے لیے یہ لمحے بڑے صبر آزما ہوتے۔ اب بیٹے کے قرب کی ایک اور حصہ دار بھی تھی جو ان کی خدمت گزار اور اطاعت شعار بھی تھی۔ لیکن یہ سب ہوتے ہوئے بھی وہ ان کے بیٹے کی محبت کی ”تقسیم کار“ بھی

تری یادوں کے گلاب

تھی۔ جس کے وجود نے ان کے بیٹے کی محبت کا ہزارہ کر دیا تھا۔ اور یہی چیز عابدہ بیگم کے دل میں غیر شعوری اور غیر ارادی طور پر انیشتا کے لیے ایک جذبہ حسد و رقابت پیدا کر رہی تھی۔ لیکن وہ بڑی مدبر خاتون تھیں۔ اپنے ان جذبات و احساسات کو قابو کیے رہیں۔ پھر بھی کچھ ایسے لمحے آ جاتے کہ غیر اختیاری طور پر ان احساسات کی چنگاڑیاں بارگاہِ کاف کے ایک کچلے سے جھونکے سے ہی انیشتا تک پہنچ جاتیں اور وہ محسوس کرتی کہ اسے ایک غلط اور نامناسب سلکھاس پر بیٹھا دیا گیا ہے۔ ایک کائنات بھر تاج ہے اس کے سر پر کہ جس کے کائناتوں کی جھین اس کا سکون درہم برہم کئے ہوئے ہے۔

عاطف کی مصروفیات کچھ ایسی تھیں کہ کبھی وہ سر شام گھر آ جاتا اور کبھی رات گئے۔ پھر کاروباری سلسلے میں اسے اکثر شہر اور ملک سے بھی باہر ہونا پڑتا۔ یہ عرصہ انیشتا کے لئے صبر آزما رہتا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ عابدہ بیگم اس سے کچھ کچھ کھینچتی ہی تھیں لیکن یہ دوری اور یہ قائلے قاطعی گرفت بھی نہ تھے۔ کیونکہ اس تناؤ میں بھی ان کا وہ یہ شکایتی نہ تھا۔ بس اک خاموشی سی تھی جس پر خود انھیں بھی اختیار نہ تھا۔ انیشتا عاطف کی غیر موجودگی میں ان سے زیادہ سے زیادہ قریب رہنے کی کوشش کرتی لیکن ساس کے سرور ڈیہ سے اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ ایک ٹھنسی محسوس کر رہی تھی اور جب اسے بے اختیار اپنا وہ گھر یاد آتا وہاں یہ آسانئیں تو میسر نہ تھیں لیکن سکون تھا، ہر وقت کی تپہ ناست اور قہقہوں کی ٹھنکناہٹ دن بھر کی محنت کی گرو کی طرح جھار دیتی اور پھر اماں جی زر پاب ڈالنے ہی ہاتھ کی تپنی ہوئی چائے کی ایک گرما گرم پیالی ہونٹوں سے لگاتے ہی اعصاب کا سارا بیخ بیاں سے اٹھتی ہوئی بھاپ کی طرح غائب ہو جاتا۔

اور اب۔۔۔ اب اسے ملازمت کی اور جسم توڑ محنت کی کہاں ضرورت تھی۔ وہ ایک بڑے گھر کی بیوہ تھی۔ گھر کی دیکھ بھال، کمروں کی آسائش کی نگرانی آنے والے مہمانوں کی دعوتوں کے انتظام کے باوجود بھی اس کے پاس اتنا وقت بچ جاتا کہ وہ نئی طرح جمائی کا شکار رہنے لگی اور یہ تپائی اس کے اندر کی جمائی تھی۔ جب اسے ماحول کو تبدیل کرنے کی سوجھی اور وہ بازار جا کر اپنی زندگی کی چیزیں خرید لاتی۔ پھر اس نے اپنی خواب گاہ کے ساتھ ساتھ ڈرائنگ روم میں بھی کچھ تبدیلیاں کیں۔ دیواروں پر آج کل کی تصویروں کو بدلا۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے پردے تبدیل کیے۔ میزوں سے پرانی طرز کے گلدان ہٹائے اور نئے گلدانوں میں پھول سجادی تھی کہ وہ نہایت پڑی۔ دروازے پر عابدہ بیگم کھڑی تھیں۔



”اماں بیگم۔“ وہ ایک دم سے بوکھلا گئی۔ پھر خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

”آپ کو پسند آئی یہ ترتیب۔“ اس نے سہا ہوا گلدان ان کی طرف کرتے ہوئے رادطلب لگا ہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

”میں نے وہ پرانا گلدان مہمان خانے کی میز پر رکھوا دیا ہے۔“

”ہاں اچھی ترتیب ہے، غصا ہے اس میں۔“ عابدہ بیگم نے غصہ ظہر کر کہا۔ ”لیکن کبھی کبھی یہ ترتیب دوسروں کی زندگی کو بے ترتیب کر دیتی ہے۔“ انہوں نے سلتکی آنکھوں سے انیشا کی طرف دیکھا اور پھر تند و تیز ہوا کے جھوٹے کی طرح دروازے سے باہر نکل گئیں۔

انیشا جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی رہ گئی۔ گلدان کے پھول اسے منہ چرات نظر آئے اور سرسراتے ہوئے پودوں کی سرگوشیاں جیسے اس کی ذات کا تسخیر آزاری ہوں۔ وہ وہیں صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔ عابدہ بیگم کے کہے ہوئے جملے اس کے دماغ میں ہتھوڑے برساتے رہے۔ وہ ان کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ یہ تو سمجھ گئی تھی کہ انھیں یہ ترتیب پسند نہیں آئی ہے اور اس کا دل رکھنے کی خاطر انھوں نے اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حکم کھلا اپنی ناپسندیدگی کا اظہار بھی نہیں کیا۔ لیکن وہ کچھ وہ کہہ گئیں تھیں اس کے پس منظر میں کیا تھا؟

پھر اس کے دماغ میں جیسے ایک خیال لپکا، جیسے اچانک بلب نوٹنے سے ایک جھماکا سا ہوتا ہے اور پھر مہیب تاریکی چھا جاتی ہے۔ اب اسے ان کے مہلوں کے کمرے میں منظر میں اپنے ماضی کی کم مائیگی کے سانپ پھن اُٹھارتے اور اسے ڈستے نظر آتے۔ تب اس کا وجود ایک شادی کر بے نوٹ نوٹ کر کھرنے لگا۔

لیکن پھر رات کے کھانے پر اس نے دیکھا۔ وہ عابدہ بیگم اس شخصیت سے مختلف تھیں جو اس نے شام دیکھی تھی۔ وہ سر نہ کھائے، چمچے اور کائے سے کھلتی رہی۔ بھوک تھی، کی ب اور عابدہ بیگم بڑی شفقت سے ایک ایک ڈش اس کے آگے رکھ کر اسے پیٹ بھر کھانے پر اصرار کرتی رہیں۔ جیسے وہ آج کل میں ہی تو یہاں کہ اس گھر میں آئی ہو۔ رات گئے تک وہ اس متضاد طرز عمل کا تجزیہ کرتی رہی۔ اُبھرتی رہی۔ لیکن اس کے اعصاب کا تاؤ بڑھتا ہی گیا۔

دوسرے دن وہ عابدہ بیگم اس سے پھر دور تھیں۔ قاصدے بڑھ گئے تھے۔ لیکن انیشا نے ان فاصلوں کو کم کرنے کا حکم ارادہ کر لیا۔ اسے معلوم تھا کہ عابدہ بیگم کے ملنے والے تو ان گنت ہیں لیکن ان کی جیتی سی سیلیاں بس دو تھیں ہی ہیں۔ اس نے ایک دم تک لے کر عابدہ بیگم کی لائیلی میں ان

سب کو مدعو کر لیا اور دعوت دیتے وقت ان سے ان کے پسندیدہ کھانوں کے نام معلوم کر کے وہ سب خود اپنے ہاتھوں سے پکائے۔ ان سب کو اچانک وارد ہوتے دیکھ کر عابدہ بیگم متحجب بھی ہوئیں لیکن باتوں کا جو سلسلہ چلا تو ان کی ساری دھشت دور ہو گئی۔ کھانے کی میز پر ان کی شائستگی دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اپنے چمچے ہوئے دلوں کی گرفت میں ہوں۔ وہ چمچے ہوئے دن جب کوئی غم پاس نہیں جھٹکتا۔ جب چمچوں میں وقت آوارہ پرند کی مانند آواز چلا جاتا ہے۔

عابدہ بیگم کو ہنسنے چھٹکلاتے دیکھ کر انیشا ایسے خوش تھی جیسے اس نے اپنے سر پر رکھے ہوئے کائنات کے تاج میں پھول کھلائے ہیں اور اب اس سلطنت میں حاکم اور عوام کے درمیان فاصلوں کی ساری پٹائیں کاٹ دی گئیں ہوں۔

دوسرے دن عاتف دورے سے لوٹا تو عابدہ بیگم کی تنہائیوں کے پھول پھر سے شاداب ہو گئے اور انیشا نے محسوس کیا جیسے ان کے چہرے کی جھریاں شادمانی کے ہاتھوں اپنی شکست خوردگی کی شرمساری کا احساس لئے رات ہی رات میں غائب ہو گئی ہوں۔ اور ان کی عمر کے طویل دور میں سے اچانک ہی کئی سال کم ہو گئے ہیں۔ اب زندگی کے وہی معمولات تھے اور وہی شب و روز لیکن یہ معمولات زیادہ عرصے قائم نہ رہ سکے۔ انیشا نے اپنے اور ان کے درمیان فاصلوں کی جوتھائیں کاٹ دی تھیں۔ اب وہ ایک ایک کڑی کی صورت میں جڑ کر ایک مخلوق بن چکی تھیں۔

انیشا خود اب زندگی کے ایک نئے دور سے گزر رہی تھی وہ تخلیق کے مقدس فرض کی ادائیگی کے ابتدائی مراحل میں تھی۔ اور جنت اس کے قدموں تھے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ ایک فوٹو آرٹسٹ کی کسٹڈی کی کیفیت سے دو چار تھی چنانچہ اس کے اپنے مزاج کی شائستگی اس سے رنجی جا رہی تھی۔ ایسے میں گھر کا گھبراہٹوں اس کے لیے جان لیوا بن رہا تھا۔ وہ اب اپنے منکے میں بانے سے بھی گریز کر رہی تھی کہ وہاں جا کر اس کا بی پھر یہاں آنے سے ایک خدی بیچ کی طرح انکاری ہو جاتا تھا اور جب وہ یہ جبر لوٹ آتی تو دونوں اسے اپنی منتشر سوچ اور بکھرے وجود کو سینے میں لگ جاتے۔ کبھی بے چارگی تھی کہ سب کچھ میسر ہوتے ہوئے بھی ایک خلا محسوس ہوتا۔ جو کسی طرح نہ ہونے میں نہیں آتا تھا۔ بعض اوقات وہ عابدہ بیگم کے وجود کو بکھر نظر انداز کر کے مکمل طور پر عاتف کے وجود میں ڈوب جاتا چاہتی۔ لیکن ان ہی لمحوں میں اسے جیسے عابدہ بیگم کی نظریں منہ بیتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ پھر اس کے سامنے اماں جی کا چہرہ ابھرتا وہ اسے کچھ یاد دلار باہر اور

آواز قدیموں سے پہنچی اور چوکھٹ سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔  
 وہ میرے خدا! اس کے جسم میں لڑش سی ہونے لگی۔ اپنے خستہ اعصاب پر قابو پا کر وہ  
 رات دل سے کمرے میں داخل ہوئی اور پھر اس نے گھٹ سے سوچ آن کر دیا۔ پلک جھپکنے میں  
 باہر اچھل گیا جیسے سورج کمرے میں اتر آیا ہو۔ روشنی میں اس نے دیکھا عابدہ بیگم اپنی مسبری پر  
 لی ہوئی تھیں۔ ان کی بڑی بڑی روشن آنکھیں اس وقت آنسوؤں سے دھندلائی ہوئی تھیں اور  
 بے ہوش کچھ کہنے کے لیے کھلے۔ لیکن آواز گھٹ کر رہ گئی۔  
 ”ای جان آپ..... آپ مجھ سے کچھ غنا ہیں.....؟“ انیشا کی آواز رندہ گئی۔ وہ دودھ کران  
 بدستوں میں بیٹھ گئی اور پھر ان کی گود میں سر رکھ کر رونے لگی۔  
 عابدہ بیگم نے اس کے سر چھتا دیا اور پھر اس کے سر اٹھا کر چہرہ اپنی طرف کر کے اپنے  
 پے سے اس کے آنسو پونچھ ڈالے۔

”ای جان آپ کو مجھ سے کیا شکایت ہے؟ خدا کے لیے کبہ دیجئے ورنہ میں گھٹ گھٹ  
 امر جاؤں گی۔ مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو معاف کر دیجئے۔ ای جان آپ کو خدا کا  
 نام..... آپ.....“  
 ”جی.....“ انہوں نے انیشا کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔  
 ”میں تجھ سے ناراض نہیں..... تو نے مجھے کون سا دکھ دیا ہے۔“ ان کے ہونٹوں پر ایک  
 لی غمراہ دیکھ گئی۔

”میں تو..... میں تو اپنے دکھ کے بوجھ سے ٹھک گئی ہوں۔“ وہ دھیمے دھیمے بول رہی تھیں  
 وہ ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے سن رہی تھی۔

”دس سال ہو گئے ہیں اس بوجھ کو اٹھانے ہوئے۔ عاقل اس وقت ستر سال کا تھا جب  
 لی ایران دنوں اور تہاراتوں کی ابتدا ہوئی تھی۔ وہ جو زندگی کی آخری سانسوں تک بھانے کا  
 وہ کیے ہوئے تھے وہ ایسے چپ چاپ چل دیئے کہ مجھے خبر تک نہ کی۔ وہ جو شکست کے لقمہ کو  
 اپنی قرار دیتے تھے موت سے شکست کھا گئے اور مجھے یادوں کے کھنڈرات میں بھٹکنے کے لیے  
 باہر زہر دیا۔ میں ٹھکانا نہیں چاہتی تھی اس لئے کہ ان کی روح ان کا وجود عاقل کے روپ میں مجھ  
 ہم آج تک تھا اور مجھے اس روپ کو پروان چڑھانا تھا۔ چنانچہ میں نے ان کھنڈرات میں ان کی  
 لی یادوں کے چراغ روشن کرنا شروع کر دیئے۔ میں ہر شب ایک چراغ جلاتی تھی اور تنہائی

تری یادوں کے گلاب۔  
 وہ سب کچھ بھول کر عابدہ بیگم کے آس پاس ان کے حکم کی منتظر آئے تھیں۔ لیکن ان کی خاموشی اور کیم  
 ان کی دو اور دو چاروائی گفتگو اس کے حوصلے پست کر دیتی۔  
 اور آج جب وہ اس صورت حال سے بہت گھبراہٹ ہو چکے تھے کمرے سے باہر نکل کر باغ کا  
 طرف جانے لگی۔ برآمدے سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھا عابدہ بیگم وضو کر رہی تھیں۔ وہ  
 غالباً مغرب کی نماز ادا کرنے کی تیاری کر رہی تھیں۔ ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا لیکن شام  
 سرگئی دھندلکات کی سیاہی میں جذب ہونے جا رہا تھا۔ انیشا دھیمے قدیموں سے ملنے ہوئے بار  
 کے ایک گوشے میں آگئی اور خند خند کی گھاس پر چڑھ پھرا کر بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں آفتی کے پار  
 ڈوبے ہوئے سورج کے منظر میں کھوئی ہوئی تھیں کہ عابدہ بیگم کی آواز نے اسے چونکا دیا۔  
 ”لیکن اندر آ جاؤ یہ وقت یہاں بیٹھنے کا نہیں۔“ خنکی شروع ہو گئی ہے۔“ انھوں نے ہالائی  
 منزل کی میز چیاں چڑھتے ہوئے کہا۔

انیشا نے گردن موڑ کر انھیں لوہر پاتے ہوئے دیکھا۔ حکم کی تعمیل کے لیے اس کے سر اپنے  
 میں حرکت ہوئی لیکن کسی اندرونی قوت نے اسے جکڑے رکھا اور وہ وہیں بیٹھی رہ گئی اور پھر وہ اس  
 وقت تک بیٹھی رہی جب تک کہ سورج کی آخری کرن تک معدوم ہو گئی۔ باغ میں بار کی جھل جھل بجی  
 تھی۔ اس نے ہمت جمع کی اور اٹھنے کو کھنکی کہ باغ کا یہ گوشہ یکا یک روشن ہو گیا۔ اس نے پلٹ کر  
 دیکھا طائر نے برآمدے میں گئے ہوئے سوچ بڑا کاٹھن دیا تھا۔ برآمدے سے پرے سارے  
 کمرے روشن تھے۔

”بند کرو اسے۔“ وہ بیزار سی ہوئی۔  
 ”اور کافی بنا کر میرے کمرے میں لے آؤ۔“

آن کی آن میں باغ کا یہ گوشہ پھر تاریکی میں ڈوب گیا۔ برآمدے میں مدھم پاور کے  
 بلب سے روشنی چمن چمن کر باغ کے کچھ گوشے نور کر رہی تھی۔ انیشا دھیمے قدیموں سے چلتی  
 ہوئی برآمدے تک پہنچی تو ہالائی منزل کی میز چیموں کے قریب اس کے قدم آپ ہی آپ ڈک  
 گئے۔ بالکل اچانک غیر ارادی طور پر اس کی نظریں اوپر اٹھ گئیں۔ اوپری منزل پر جیسے سناٹا سا  
 چھایا ہوا تھا۔

یہ آج ای جان کے کمرے میں اندھیرا کیوں ہے؟ اس نے اپنے آپ سے پوچھا اور اس  
 کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ ہولے ہولے سے میز چیاں ملے کرنے لگی۔ عابدہ بیگم کے کمرے تک وہ

کے اس کھنڈر کو روشن کرتی تھی۔ ایسی ہی شامیں ہوتی تھیں جب ڈوبتے سورج اور چلتے چراغ آ روشنی میں دور دروازے ہی سے مجھے آواز دیتے ہوئے اندر داخل ہوتے تھے اور پھر مزہ مچانے اور کپڑے بدلنے تک وہ اپنے روز کے معمولات سناتے تھے۔ ایک ایک بات۔ چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی ساری باتیں جیسے لطیفہ سنا رہے ہوں۔ چٹکے چھوڑ رہے ہوں۔ ہاں ایسی ہی شامیں ہوتی تھیں جب وہ اکثر میرے لئے کوئی نہ کوئی تھکا لاتے۔ چاہے وہ چند پھول ہوں۔ ایک خوبصورت سارنگین ٹھکانا سارو مال ہو۔ دل پسند خوشبو ہو۔ انگور کی بو یا میری مخصوص پسندیدہ مسٹاک اور وہ یہ چیزیں سامنے والے مینٹل پر اس کے اس گوشے میں چپکے سے رکھ دیتے وہ وہاں..... انھوں نے مینٹل پر اس کے اس گوشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میری نظر اچانک اس چیز پر پڑتی میں ان سے پوچھتی اور وہ بڑی خوبصورتی سے اس سے اپنی لاطینی کا اظہار کرتے۔ محبت کا یہ انداز کیسے جلا یا پاسکا ہے بیٹے۔ یادوں کے یہ چراغ کیسے بجھائے جاسکتے ہیں۔ تمہیں یاد ہے وہ گھدانا جو تم نے مہمان خانے میں رکھوا دیا تھا۔ وہ انھی کی یادگار تھی۔“ پھر وہ ایک لمبی آواز بھر کر چپ ہو گئیں۔ اسی لمحے مجھے سے عاتف کی آواز آئی۔

”انیٹا پلیز کہاں ہو تم.....؟“

”جاؤ لیکن عاتف آگیا ہے۔“ عابدہ جیم نے اپنے ہاتھ آہستگی سے اس کے ہاتھوں سے چمڑائے۔ علیحدہ ہوتے ہوئے ان ہاتھوں میں اب ایک لمبی کی پکپکامت تھی۔ پالنا جملانے والے یہ ہاتھ گویا اپنی شگفتگی اور حسی دہشی کے خاموش شاکی ہوں اور اگر انھیں زبان مل جاتی تو یہ کہہنا مٹتے۔

”جاؤ لیکن عاتف آگیا ہے۔ اب سے تمہاری ضرورت ہے۔“

انیٹا چپ چاپ بیٹھا تر آئی۔

”بھئی حد کر دی تم نے..... اب ایسے استقبال کرو گی۔ آؤ ادھر پہلے۔“

عاتف اسے کمرے میں لے جانے لگا۔

”شش.....“ انیٹا نے اس کی بے تلی کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر باغ میں گھسٹ لے گئی۔

”بھئی یہ سب کیا ہے؟“ عاتف کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھجھلا گیا۔

”عیاف پلیز ایک منٹ.....“ انیٹا نے جلدی جلدی گلاب کے چند پھول توڑتے ہوئے اہستہ سے کہا۔ اس گھبراہٹ میں اس کے ہاتھوں میں کئی کانٹے چھب گئے لیکن جیسے وہ پیار کے کانٹے ہوں جو زخم دینے کے بجائے ٹھنڈک پہنچا رہے تھے۔ پھر اس نے رات کی رانی کے پھولوں کا ایک گچھا توڑا اور اپنے بالوں سے ریڑ نکال کر انھیں کچکا کر کے لپیٹ دیا اور عاتف کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولی۔

”امی جان بہت تھکا ہیں عاتف۔ یہ تنہائی آپ ہی دور کر سکتے ہیں۔ یہ پھول لے جائیے اور ان کے کمرے میں مینٹل پر اس کے دائیں گوشے میں رکھ دیجئے گا اور پھر آج کے دن کی ساری روراد بھی انھیں سنائے گا یہ بہت ضروری ہے، بہت ضروری عاتف صرف آج ہی نہیں روزانہ..... جب بھی ممکن ہو۔“

”لیکن کیوں.....؟“ عاتف حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”ابو..... آپ کے ابو بھی یہی کیا کرتے تھے۔“ انیٹا نے اس کی طرف بہت پیار سے دیکھا اور نکھری جھکا لیں۔

”تم انیٹا.....“ وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا اور چھلانگیں لگاتا ہوا بیڑیاں چڑھ گیا۔

انیٹا وہیں رہنے پر تک محسوس ہوئی۔ اوپر سے اسی جان اور عاتف کی باتوں کی آواز آرہی تھی۔

وہ آپ ہی آپ مسکرا دی جیسے اس کے کانٹے کا پوجہ آ کر گیا ہو اور وہ کبھی بھٹکی ہو۔

☆.....☆.....☆



## شبِ غم کی ظلمتیں

تاکہ، فاخرہ اور انیلہ..... چوہدری افتخار کی تین بیٹیاں تھیں۔

ان کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ ایک فرم میں نوکری کرتے تھے۔ تین بیٹیوں کے باپ تھے۔ فاخرہ بی اے کے آخری سال میں تھی۔ تاکہ ایف اے میں تھی۔ اور انیلہ نے میٹرک کا امتحان دیا تھا۔ ماں باپ بیٹیوں کیلئے فکر مند ہو گئے تھے۔

فاخرہ کا رزلٹ نکلا اور وہ پاس ہو گئی۔ کوئی خاص پوزیشن نہیں ملی تھی، آگے پڑھنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ نہ تو اس کے سامنے تعلیم کا کوئی مقصد تھا اور نہ کوئی خصوصی دینی صلاحیتیں کہ کسی خاص شعبے کی طرف توجہ دی جاتی۔ ہاں، ابو نے اس سے ضرور پوچھا تھا۔

”بتاؤ بیٹی! اب تمہاری کیا خواہش ہے؟“

”آپ پوری کر دیں گے ابوی؟“ اس نے پوچھا۔

”پوری پوری کوشش کروں گا بیٹی!“

”تو ابوی مجھے نوکری کروادیں۔ میں نوکری کرنا چاہتی ہوں۔“ اس نے کہا۔ اور ابوی کا چہرہ پیکا پڑ گیا۔

پھر دو بولے۔ ”فاخرہ بیٹی! میں فرسودہ خیالات کا انسان نہیں ہوں۔ لیکن بڑا دل ضرور ہوں۔ اپنے ارد گرد بکھرے ہوئے ماحول کو دیکھتا ہوں اور اس پر گہری نظر دیکھتا ہوں۔ میں اس جنم میں اپنی عزت کو نہیں جھونک سکتا اور پھر تمہیں اس کی کیا ضرورت ہے۔ بس خدا سے دعا کرو کہ وہ مجھے تم تینوں کے فرض سے سبکدوش کرے۔ اس خیال کو ذہن سے نکال دو۔ بس عزت کے ساتھ میرے گھر سے چلی جاؤ۔ یہی میرے لیے تمہارا انعام ہوگا۔“

وہ خاموش ہو گئی۔ بے کاری کا دور شروع ہو گیا۔ گھر کے کام کاج بہنوں کی تعلیم میں مدد۔

تری یادوں کے گلاب

بس اس کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ اس نے اپنے آپ کو ان معمولات کا عادی بنالیا۔ بیٹی کے والدین جس انداز میں رشتے تلاش کر سکتے تھے، کر رہے تھے۔ دہلی دہلی زبان میں لوگوں سے تذکرے جاری تھے۔ حسرت بھری نگاہیں ہر طرف اٹھ رہی تھیں۔ عمرنگی جاری تھی۔ فاخرہ کے بعد بھی دو بیٹیاں ہوئی تھیں۔ ایک کی فکر سے نہات ملے تو دوسریوں کی فکر کی جائے۔ انہی دنوں فاخرہ کی ایک دور کی عزیز سیالکوٹ سے آئیں کانی مرے کے بعد آئیں تھیں۔ گھر میں خوشیاں بکھر گئیں۔ بزرگوں میں ہر موضوع پر بات ہوئی تو فاخرہ و فیروہ کی شادی کا تذکرہ بھی نکل آیا۔ فاخرہ کی اسی کیلئے یہ سب سے پرکشش موضوع تھا۔ انہوں نے اچھا رشتہ نہ ملنے کا رد دیا۔ اور فاخرہ کی عزیز دوستی سوچ میں ڈوب گئیں۔

”آپ کی نگاہ میں کوئی اچھا لڑکا ہو تو.....“ اسی نے سلسلہ منقطع نہ ہونے دیا۔

”وہی سوچ رہی تھی۔ ایک لڑکا ہے تو صحیح لیکن میں ان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی۔ ہمارے بڑوں میں رہتے ہیں۔ وہ لوگ لڑکے کے بھائی بھادج ہیں۔ لڑکا خود لندن میں رہتا ہے۔ ان دنوں آیا ہوا ہے۔ اس کی بہن نے مجھ سے کہا تھا کہ کوئی خوبصورت لڑکی نگاہ میں ہو تو بتاؤں۔ مگر اس وقت مجھے تمہاری بیٹیوں کے بارے میں خیال نہیں آیا۔ تم کہو تو خط لکھو انہیں؟“

”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے آپ کی بیٹیاں ہیں۔ فوراً کوشش کریں۔“ افتخار صاحب نے درمیان میں دخل دیا۔ اور ان خاتون نے حای بھری۔

دوسرے دن ہی ایک تفصیلی خط لکھ دیا گیا۔ افتخار صاحب نے اپنے دفتر کا فون نمبر بھی احتیاطاً لکھ دیا تھا۔ اور ان کی یہ احتیاط کام آگئی۔ پانچویں دن انہیں دفتر میں فون کال موصول ہوئی۔ سیالکوٹ سے تھی۔ افتخار صاحب نے دفتر کے دل سے فون ریسیو کیا۔

”افتخار صاحب بول رہے ہیں؟“

”جی ہاں! آپ کون صاحب؟“

”میرا نام رب نواز ہے۔ چوہدری زمان صاحب کی اہلیہ نے مجھے خط لکھا تھا۔ میں نواز کا بڑا بھائی ہوں۔ جی“

”اوہ..... رب نواز صاحب! میں پہچان گیا آپ کو۔ کہتے کیسے حراج ہیں آپ کے؟“

”خدا کا شکر ہے جی۔ تو جی ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ بچے کو ہم یہاں سے چل دیں اور اتوار کی شام کو کراچی پہنچ جائیں۔ انوار کو بھی ساتھ لے آئیں گے۔ وہاں بات ہو جائے گی۔ اسے

"ضرور..... ضرور۔ آپ کوئی ٹرین سے آئیں گے۔ ہم آپ کو ریسو کرنے۔"

"اوپنٹس جی آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم ہوگی میں ٹھہریں گے وہاں ہماری واقفیت بھی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم ہوگی میں ہی ٹھہریں گے۔"

"رب نواز بھائی مگر ہوتے ہوئے آپ....."

"نہیں جی کوئی بات نہیں۔ ہم وہاں پہنچ کر آپ سے خود لیں گے۔ اچھا جی، خدا حافظ۔"

رب نواز نے کہا اور فون بند کر دیا۔

افتخار صاحب جیسے ہی کیفیت کا شکار ہو گئے تھے۔ ان لوگوں کو گھر میں ٹھہرانے کی پیشکش ضرور کی تھی لیکن غور و فکر بھی تھے۔ اسے معمولی سے گھر میں لندن پلٹ لڑے کو کہاں ٹھہرائیں گے۔ جگہ ہی کہاں تھی۔ لیکن اخلاقیات کا تو کہنا ہی پڑا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی وہ عزیزہ شاہانہ بھی یہیں تھیں۔ کچھ اور پریشانیوں بھی ذہن میں رہی تھیں۔ اگر ان لوگوں نے بہت جلدی کی تو.....؟ گو دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے بہت سی چیزیں گھر میں جمع کر لی تھیں تھیں۔ لیکن یہ چیزیں اس شادی کے کام نہیں آسکتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ لڑکا لندن واپس جائے گا اور ان چیزوں کی اسے وہاں ضرورت نہیں ہوگی اسے جو کچھ دینا پڑے گا۔ نقد ہی دینا پڑے گا۔ اور یہ نقد.....

شام تک دفتر بیٹھے ہوئے افتخار صاحب یہی سب کچھ سوچتے رہے تھے۔ انہوں نے اپنے سارے وسائل کے بارے میں سوچا تھا۔ اور کسی قدر مطمئن ہو گئے تھے۔ اگر وہ زیادہ لاچکی نہ ہوئے تو پھر مشکل نہ ہوگی۔ لیکن ساری باتیں صاف صاف کر لینا بہتر ہوگا۔ تاکہ بعد میں کوئی بہرحال نہ ہو۔ پھر انہوں نے دوسرے انداز میں سوچا۔ اور دل میں ایک بوک سی اٹھی۔ جگر گوشت اتنی دور چلی جائے گی۔ کہ ایک خواب کی مانند ہو جائے گی۔ اس کا تصور تو کیا جاسکتا ہے۔ اس سے ظاہر نہیں جاسکتا..... پیشیاں خواب ہی تو ہوتی ہیں۔ ساری زندگی پرورش کرو اور پھر کسی اجنبی کے حوالے کر دو۔

گھر پہنچے تو خوش بھی تھے اور افسردہ بھی۔ پہلے بیگم سے اس کا لنے بارے میں تذکرہ کیا۔ پھر شاہانہ بیگم سے۔ دیر تک رب نواز کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ "بیٹے کی شام کو سات بجے کے قریب ایک طویل القامت شخص نے چودھری افتخار کے مکان کے دروازے پر دستک دی۔ چودھری صاحب واپس آ چکے تھے اور اس بات کے منتظر تھے کہ کیا لکھت سے آنے والوں کی کوئی

الاعار ملے۔ انہوں نے فوراً دروازہ کھولا۔ طویل القامت شخص نے انہیں سلام کیا اور افتخار صاحب نے بارے میں پوچھا۔

"میں ہی افتخار ہوں۔ اور آپ شاید رب نواز صاحب ہیں۔"

"خوب پہچانتی! میں رب نواز ہی ہوں۔"

"تشریف لائیے۔ ہم لوگ اس وقت آپ کے بارے میں ہی گفتگو کر رہے تھے۔" رب نواز اندر آ گیا۔ حتی المقدور اس کی خاطر عمارت کی کچی تھیں۔ ذرا آہستہ سے کابلے تکلف سافٹ تھا۔ وہ بٹ کر اس نے ناشتا کیا پھر بولا۔

"بھائی جی! ہماری پڑوسی ہیں جی! ان کا شکریہ کہ انہوں نے یہ بات چلائی پر ایک مشکل ہے۔ چودھری جی۔"

"کیا رب نواز بھائی؟"

"لڑکا لڑکی کو دیکھ گئے۔" رب نواز نے کہا۔ افتخار صاحب اس بات پر ذرا سا خاموش ہوئے تو ان کی بیگم بول پڑیں۔

"ہم اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے رب نواز بھائی۔ کیا آپ کی بیگم بھی آئی ہیں؟"

"ہاں جی! وہ ہوئی ہیں۔"

"وکل دو پیر کا کھانا آپ ہمارے گھر میں ہی کھائیں۔ ایوانی کو بھی لیتے آئیں۔ اور اپنی بیگم کو بھی۔ لیکن ان باتوں سے پہلے ہم آپ سے کچھ اور باتیں بھی کرنا چاہتے ہیں۔"

"یو لو بھائی جی! رب نواز نے کہا۔"

"دیکھیے رب نواز بھائی ہم معمولی سے لوگ ہیں۔ خانہ دانی شرافت کے علاوہ ہمارے پاس اور کوئی چیز نہیں۔ انوار لندن میں رہتے ہیں۔ اگر ان کے خیالات اونچے ہیں تو پھر ہمارے لیے یہ

شادی کرنا مشکل ہو جائے گا۔ ہم لڑکے کو صرف تین لاکھ روپے نقد دے سکتے ہیں۔ جو بے شک اس زمانے میں کچھ بھی نہیں ہیں۔ لیکن بس یہی ہماری پونجی ہے۔"

"اوجی بھائی جی! انوار کے پاس سب کچھ موجود ہے۔ خدا کے کرم سے وہ کسی بھی ہم سے ہادی کر سکتا تھا پر لڑکا شریف ہے اپنے ہی دس کی کوئی شریف لڑکی چاہتا ہے۔ باقی اسے اور کسی بچی کی پرواہ نہیں ہے۔ پھر بھی میں اس سے بات کر لوں گا۔"

"آپ ضرور یہ باکر لیں۔ ہم اپنی حیثیت سے اوجی اذان نہیں چاہتے۔"

”ٹھیک ہے جی۔ اور کچھ۔“

”شادی کتنے دن بعد کرنی ہوگی؟“

”دس بارہ دن کے اندر اندر میں تاریخ کو سے لندن پہنچتا ہے۔“

”لڑکی کو وہ ساتھ لے جائے گا۔“

”نہیں جی۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ وہاں جا کر وہ یہ بھیجے گا جب لڑکی جائے گی۔“

”ہوں۔ ٹھیک ہے۔ کل آپ لوگ آئیں۔ باقی باتیں کل ہوں گی۔“ بیگم افتخار نے کہا۔

اور کافی دیر رکنے کے بعد رب نواز چلا گیا۔ یہ تمام باتیں غارہ کے کانوں میں پہنچ رہی تھیں۔ اور وہ

انگشت بدلتی تھی کہ یہ اس کے والدین کیا کر رہے ہیں۔ کیا اپنے ملک میں لڑکوں کی کمی ہے۔ آج

نہیں تو کل کوئی نہ کوئی لڑکا مل جائے گا۔ کیا میں اتنی بوجھ ہوں کہ وہ ساف مری کیلئے میرے مگرے

دور رہنا چاہتے ہیں۔ وہ دل ہی دل میں گھٹ رہی تھی۔ وہ لندن نہیں جانا چاہتی تھی۔ لیکن اس میں

اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ والدین سے بات کر سکتی۔

دوسری طرف افتخار صاحب اس موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ ”مگر ابھی رخصت نہیں کرنا

تو پھر شادی کی کیا ضرورت ہے۔ منگنی ہو جائے اس کے بعد۔“

”کیسی غصہ کی باتیں کر رہے ہیں افتخار بھائی! منگنی کی کیا حیثیت ہوتی ہے۔ ایسے لڑکے

بار بار کہاں ہاتھ آتے ہیں۔ آپ کیسے دھرے پر پانی پھیریں۔ نکاح کر کے رخصت کر دیں

تھوڑے دن بعد انوار غارہ کو بلا لی لے گا۔“

”نہیں۔ بہن یہ ممکن نہیں ہے۔ میں اس بات پر کسی قیمت پر تیار نہیں ہوں گا۔ اگر نکاح

ضروری ہے تو اس نکاح کر لیا جائے۔ رخصت بعد میں ہوگی۔ اگر وہ لوگ اس پر راضی ہوں تو ٹھیک

ہے۔ ورنہ اللہ مالک۔“

”ٹھیک ہے۔ بات کر لیں آپ۔“ شاہانہ نے کہا۔

غارہ کی خواہش تھی کہ وہ کم از کم شاہدہ سے مشورہ کر لے۔ شاہدہ اس کی سہیلی تھی اور کافی

چالاک بھی تھی۔ لیکن جرأت نہ ہوئی اور پھر اسے طلب کر لیا گیا۔ ڈرائیگ روم میں داخل ہوئی تو

سب باتیں کرتے کرتے خاموش ہو گئے۔ اب نواز تھا۔ اس کی بیوی تھی۔ جو پورے ایک صوفے

پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اور شکل و صورت سے بے حد خرافات نظر آرہی تھی۔ اور انوار تھا۔ ایک خود دار اور

وہ خاموش بیٹھتی۔ رب نواز کی بیوی نے کہا۔ یہ پھر بڑ پنا سے اس سے چند ایک باتیں

کی۔ پھر اسے وہاں سے اٹھنے کی اجازت مل گئی۔ انوار کو دیکھ کر اس کے دل میں کوئی احساس نہیں

جاگا تھا۔ دو تین گھنٹے وہ لوگ رے کے اور پھر چلے گئے۔ شام کو رب نواز۔ افتخار صاحب کو ہوگئی آنے

کی دعوت دی تھی۔

گھر والوں کو لڑکا پسند آیا تھا۔ بالکل ایسا تھا جیسے لندن میں رہنے والے پتہ پتی ہوتے

ہیں۔ شام کو افتخار صاحب ہوگئی بیٹھے تو رب نواز نے کہہ دیا کہ لڑکی پسند ہے۔ اور ایک صفحہ

کے بعد نکاح کر لیا جائے۔ انوار خود بھی موجود تھا۔ افتخار احمد صاحب نے دل کی بات کہہ دی۔

”رخصتی کا کیا پروگرام ہوگا؟“

”بس جی ہم لڑکی کو رخصت کر کے سیالکوٹ لے جائیں گے پھر جب انوار چلا جائے گا تو

وہ بھی یہاں رہے گی۔ کبھی سیالکوٹ۔ ایک آدھ مہینے کی تو بات ہی ہے۔“

”نہیں جناب! یہ ممکن نہیں ہے۔ میں ابھی لڑکی کو رخصت نہیں کروں گا۔ رخصت اسی

وقت ہوگی جب انوار ویزا سمجھیں گے۔“

”یہ کیا بات ہوئی جی! اس سے کیا فائدہ نکاح تو ٹیلی فون پر بھی ہو سکتا ہے۔“ رب نواز

نے کہا۔

”رہنے دو بھائی اس میں حرج کیا ہے۔ چوہدری صاحب کی یہی خواہش ہے تو ہمیں کیا

اعتراف ہو سکتا ہے۔“ انوار نے کہا۔

”ٹھیک ہے جی۔ تم دونوں کی مرضی ہے تو مجھے کیا اعتراض۔“ رب نواز نے کہا۔

”اس کے علاوہ رب نواز بھائی! آپ نے انوار کو میری وہ بات بھی بتادی تھی؟“

”ہاں۔ بتادی ہے۔ وہ تین لاکھ؟“

”جی۔“

”چوہدری صاحب! اگر اس میں بھی آپ کو کوئی پریشانی ہو تو میں غلوں سے کہہ رہا ہوں کہ

اس کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کی عزت اب ہماری عزت ہے۔“ انوار نے کہا۔ اور چوہدری

افتخار خوش ہو گئے۔

داماد نہایت نیک طبیعت اور عظیم الطبع ہے۔ وہاں سے لوٹے تو بہت مطمئن اور خوش تھے۔



تری یادوں کے گلاب

”اوہ..... بات تو تشویشناک ہے۔ چاہاجی نے سیالکوٹ جا کر ان کے بارے میں چھان بین بھی نہیں کی؟“

”تم سیالکوٹ جانے کی بات کر رہی ہو۔ یہاں ایک بیٹے کے اندر اندر یہ سب کچھ ہوا ہے۔ کوئی معلومات نہیں لی گئیں۔“ قاخرو نے بتایا۔

شاید سوچ میں ڈوب گئی۔ پھر گردن ہلکا کر بولی۔ ”بہر حال خدا بہتر کرے گا۔ ویسے بڑے فراخ ہوتے ہیں ہیں آج کل۔ ایسی ایسی باتیں سننے میں آتی ہیں کہ دو گھنٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہر شخص یکساں نہیں ہوتا۔ خدا کرے باہر کی زندگی تمہیں راس آئے۔“

کھاج خوب دھوم دھام سے ہوا۔ سیالکوٹ سے صرف چار آدمی آئے تھے۔ شکل و صورت سے وہ اچھے لوگ نہیں لگ رہے تھے۔ لوگ دہلی دہلی زبان میں ان پر تبصرے کرتے۔ لیکن انوار ان لوگوں سے مختلف معلوم ہوتا تھا۔ کھاج کے دوسرے دن انوار سیالکوٹ چلا گیا۔ قاخرو کو شادی، شادی ہی نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ تمنا نے اس کے ذہن میں کیسے کیسے خیالات جاگزیں ہو رہے تھے۔ اس نے لاکھ کوشش کی کہ خود کو انوار کی طرف مائل کرے لیکن اس کا تصور ہمیشہ اجنبی لگتا تھا۔ ان احساسات نے اس کی صحت پر برا اثر ڈالا تھا۔

شاہانہ بیگم چلی گئیں تھیں۔ اور گھر کے مشاغل معمولات پر آگئے تھے۔ لیکن قاخرو کو اب ایک مہمان جیسی حیثیت حاصل تھی۔ بیٹنیں اسے کوئی کام کرنے نہیں دیتی تھیں اور حسرت سے دیکھتی رہتی تھیں۔ اسی نے ایک دن اس کی اس کیفیت کو محسوس کر لیا۔ اور پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں۔

”قاخرو بیٹی! اس قدر غمزدہ نہیں رہتے۔ والدین کے گھر سے تو بیٹیاں کا تعلق واجباً سا ہوتا ہے۔ ان کا اصل گھر تو سسرال ہی ہوتا ہے۔ خدا کے فضل سے تمہاری تو عقد پر جاگ اٹھی۔ لندن میں رہ کر کرتیش کرو گی۔ اپنی بہنوں کیلئے دعا کرنا اللہ انہیں بھی پار لگا دے۔“

قاخرو کے مضبوط بندھن ٹوٹ گیا۔ ایسے جھک جھک کر روئی کہ ادھی پریشان ہو گئیں۔ وہ خود بھی رو رہی تھیں۔ اور ان کے ساتھ تانکہ اور اخیلا بھی رو رہی تھیں۔ ”ایسی تو کوئی بات نہیں کی تھی میں نے ادھی! ایسا بوجھ تو نہیں تھی میں آپ پر۔ اتنی پریشانی کیا تھی میرے بارے میں؟ آپ نے مجھ سے میرا وطن کیوں چھین لیا۔ آپ نے مجھے خود سے اتنی دور کیوں کر دیا کہ میں آپ لوگوں کی صورتوں سے ترس جاؤں۔ آخر ایسا کون سا جرم کیا تھا میں نے؟ چند روز اور گزر جاتے۔ مجھے آپ کے

تری یادوں کے گلاب

بتائیں۔ جو رب نواز اور انوار سے ہوئی تھیں۔ لیکن تمنا نے کیوں قاخرو کو اطمینان نہیں تھا اس نے بھی ایک ہی نگاہ انوار کو دیکھا تھا لیکن ہزاروں میں دور کا یا شہدہ تھا۔ وہ ایک اجنبی کے ساتھ اپنوں سے اتنی دور چلی جائے گی۔ بس یہ احساس اس کیلئے بہت تکلیف دہ تھا۔

ایک بیٹے کا وقت ہی کتنا ہوتا ہے۔ ادھر اتھری میں سارے انتظامات ہو رہے تھے۔ خاندان میں دعوت نامے تقسیم ہو گئے تھے۔ خاندان والوں کو تو کسی اعتراض کا موقع درکار ہوتا ہے۔ جس نے کبھی ایک ہی بات کہی۔ نہ ذات، نہ برادری، کوئی دور کی جان پہچان بھی ہے۔ چہ دہری افتخار تو جس لندن کے نام پر دیکھ گئے اور حقیقت بھی یہی تھی۔ سیدھے سادھے افتخار صاحب ایک تو بیٹیوں کے بوجھ کے خوف کا شکار، حالات خراب ضرور ہیں لیکن بیٹیاں اب ایسا بوجھ بھی نہیں ہوتیں کہ انہیں کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا جائے۔ دوسری بات یہ کہ لندن کا نام بھی بہت سمور کن تھا۔ ولایت میں عام لوگ تو شہر رہتے۔ پھر انوار کی شان و شوکت بھی انہیں پسند آئی تھی۔ خاندان والوں کی باتوں کی انہوں نے کوئی پروا نہیں کی۔ جس کا جہول چاہے کہے۔ کسی کی زبان کس نے روکی ہے۔

شادی کا دعوت نامہ شاید کو بھی گیا تھا۔ دوسری چند سہیلیاں بھی شریک ہوئی تھیں۔ مائیں میں سہیلیاں ہی پاس ہوتی ہیں۔ اور ان کی چیمیز چھڑا دی اس تقریب کا حسن و بالا کرتی ہے۔ ”تو تو بڑی چورنگی قاخرو! سب سے پہلے ہاتھ مار دیا۔ ارے ہم تو تجھ سے دو تین سال بڑے ہی ہوں گے۔ مگر بھاری کسی کو پروا ہی نہیں ہے۔“ شاید وہ نے کہا۔

رات گئے وہ سب جانے لگیں تو قاخرو نے شاید وہ سے رات کو رک جانے کی خواہش ظاہر کی۔ شاید کے ساتھ اس کا ایک بھائی آیا تھا۔ اس کی اجازت سے شاید وہ رک گئی۔ رات کو تنہائی ملی تو قاخرو نے دل کی بات اس سے کہی۔ ”شاید وہ میں اس شادی سے خوش نہیں ہوں۔“

”کیوں؟“ شاید وہ تھک پڑی۔

”ان لوگوں کو کوئی نہیں جانتا۔ ہماری ایک دور کی رشتے دار سیالکوٹ میں رہتی ہیں۔ یہ لوگ ان کے بڑے ہیں۔ وہ خود بھی انہیں زیادہ نہیں جانتیں۔ اور انوار۔ انوار تو رہے ہی لندن میں ہیں۔ ان کی فطرت کے بارے میں تو کوئی بھی کچھ نہیں جانتا۔ میں اپنا وطن چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی۔ شاید وہ ایک بالکل اجنبی شخص کے ساتھ اپنوں سے اتنی دور۔“

تری یادوں کے گلاب

قدسوں ہی میں جگہ مل جاتی تو۔۔۔ تو کیا حرج تھا۔ ای؟ میں اتنی دور نہیں جانا چاہتی۔ میں لندن نہیں جاؤں گی۔۔۔

ای چند ساعت کیلئے تو پریشان ہو گئی تھیں۔ لیکن پھر انہوں نے خود کو سنبھالا اور پولیس۔۔۔ خدا کیلئے عقل کی بات کرو۔ کسی بد شکوئی کر رہی ہو۔ سینکڑوں رشتے ہوتے ہیں۔ لڑکیاں تو خوش ہوتی ہیں اس بات پر کہ انہیں باہر کی دنیا دیکھنے کو ملے گی۔ رہی والدین کی بات تو بیٹی! شادی کے بعد والدین کی حیثیت ثانوی رہ جاتی ہے۔ شوہر کو خوش رکھو گی تو وہ تمہارے جذبات کا بھی خیال رکھے گا۔ سال میں ایک آدھ بار مل جانا کرنا ہم سے۔" اسی نے بڑے کرب سے کہا۔

جب فارغہ کو احساس ہوا کہ والدین بھی کتنے مجبور ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جو بچپن سے اب تک اس کی ایک لمحے کی جدائی بھی گوارہ نہیں کر سکتے تھے۔ اب اس کے لیے مہر کرنے کو تیار تھے۔ بہر حال تقدیر میں جو کھٹکا ہوتا ہے، وہی ہوتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فارغہ خود کو آنے والے وقت کیلئے تیار کرنے لگی۔ انوار کے تین خط آئے تھے۔ اس دوران رب نواز نے اس کے بعد ایک بار بھی رابطہ قائم نہیں کیا تھا۔ افکار صاحب نے اسے دو تین خط لکھے تھے۔ مگر ان کا بھی جواب نہیں ملا تھا۔ انوار کو گئے ہوئے دوسرا مہینہ شروع ہو گیا تھا اور افکار صاحب کسی قدر بے چین ہونے لگے تھے۔ لیکن مہینے کے آخری دنوں میں انوار نے ویزا بھیج دیا۔ اس کے ساتھ لی آئی اسے کاکٹ بھی تھا۔

انوار نے خط میں لکھا تھا کہ کسی قسم کی فکر نہ کی جائے۔ وہ فارغہ کو لندن ایئر پورٹ پر ویسٹ کرسے گا اور یہاں آنے میں اسے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ روانہ ہونے سے قبل اسے ٹیلی فون پر اطلاع کر دی جائے۔ مگر میں ایک بار پھر الجھل پیدا ہو گئی تھی۔ فارغہ کی رخصتی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ بالآخر والدین اور چند قریبی اقارب نے آنسوؤں اور دعاؤں کے ساتھ اسے رخصت کر دیا۔

ہوائی جہاز میں پہلا سفر اور وہ بھی تھا۔ فارغہ کیلئے عجیب تھا۔ ابتدا میں وہ ایک خوفزدہ رہنے کی مانند رہی لیکن تعلیم یافتہ تھی۔ اس نے خود اعتمادی کو واز دی اور خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نئی زندگی کو اب غلوں سے قبول کرنا تھا۔ پرانے ساتھی چھڑ گئے تھے۔ نئے ساتھیوں کو اپنا تھا۔ جیسے بھی ہوں خود کو ان کے مطابق بنانا تھا۔ خیالات اور احساسات کی وہی فراوانی تھی کہ وطن میں سفر محسوس بھی نہیں ہوا اور ہالہ خروہ لندن ایئر پورٹ پر اتر گئی۔ بجلی بجلی سی

تری یادوں کے گلاب

نہاں ہی۔ ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھ رہی تھی۔ انوار کو اس نے ایک مرتبہ سرسری نگاہ دیکھا تھا۔ لیکن اس کی صورت ذہن میں تھی وہ اسے ایئر پورٹ پر مل گیا۔ ابھی لیکن آئندہ ہر نئی زندگی کا ساتھی۔ فیروں کے درمیان وہ اسے اپنا ساتھیوں ہوا۔ ایک خوبصورت تماشے کے دن میں وہ بہت حسین لگ رہا تھا۔

فارغہ کی بے چینی کسی قدر کم ہو گئی۔ انوار کے ساتھ اس کے چند پاکستانی دوست بھی آئے تھے۔ لیکن اس میں کوئی عورت نہیں تھی۔ ان دوستوں نے اسے پھولوں کے ہار پہنائے اور گلے سے پیش کیے۔ وہ بھی انہیوں کے اتار قبیب نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے پسینہ پسینہ ہو گئی۔ لیکن ضبط کیے رہی۔ اسے یہ ماحول سمجھا تھا۔ ایک لمبی شاندار کار میں وہ انوار کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ڈرائیور افریقی نژاد تھا اور اس نے کار اشارت کر کے آگے بڑھا دی اور تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک نرسورت فلیٹ میں داخل ہو گئی۔ جو خوب سجھا ہوا تھا۔

یہاں کا اپنا گھر تھا۔ اس دوران انوار سے اس کی کوئی گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ شاید وہ خود بھی کم کو انسان تھا۔ اس کے دوست دوسرے کمرے میں ٹیپ ریکارڈ بجاتے رہے اور۔۔۔ یاد۔۔۔ کرتے رہے۔ یہ آوازیں اس کے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ اور وہ ان کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

اس کے بعد ایک مقامی لڑکی اس کے پاس آ گئی۔ جس نے اپنا نام انکھلا بتایا تھا۔ اس نے سسکراتے ہوئے اسے دوسرا لباس پہننے کی پیشکش کی۔ وہ بہت آسان انگریزی بول رہی تھی۔ نت سمجھنے میں کوئی وقت نہیں ہو رہی تھی۔ لباس تبدیل کرنے میں اس نے فارغہ کی مدد کی۔ فارغہ نے خاموشی سے لباس تبدیل کیا۔ انکھلا نے اپنے کام کے علاوہ اس سے کوئی گفتگو نہیں کی تھی۔ اس لیے فارغہ بھی خاموش رہی۔ یوں بھی وہ ابھی بہت جھجک محسوس کر رہی تھی۔ انکھلا کے جانے کے بعد انوار اس کے پاس پہنچا۔ انوار نے بھی نیا سوٹ پہن لیا تھا۔ گرے رنگ کے جدید طرز کے۔ دن کے کار میں تین کپیاں آڑی ہوئی تھیں۔

"میرے دوستوں نے آپ کے اعزاز میں ڈنر کا بندوبست کیا ہے۔ فارغہ! تھوڑی دیر بعد ہمیں چلنا ہے، آپ تیار ہیں؟ اور اس نے گردن جھکا دی۔" بہت خوب ہر چند کہ اس ڈنر میں شریک زیادہ تر لوگ پاکستانی ہیں جو شرقی روایات سے واقف ہیں لیکن میں نے انہیں یہ بھی بتا دیا کہ آپ اماماء اللہ تعلیم یافتہ ہیں اس لیے شرم کے اس انداز میں تھوڑی سی کس کر دیں۔ کیا

خیال ہے انوار نے کہا اور وہ آہستہ سے مسکرا دی۔

”شکر یہ..... بس چند منٹ کے بعد وہ لوگ ہمیں لینے آئیں گے۔ میں باہر ان کا انتظار کر رہا ہوں۔“ انوار نے کہا اور پھر باہر نکل گیا۔

فاخرہ عقب سے اسے دیکھتی رہی۔ تندرست ہاتھ پاؤں کا ایک جامد زیب انسان۔ اس کا شوہر۔ اس کی آئندہ زندگی کا ساتھی۔ اس کا محافظ۔ اس سے اتنی اجنبیت مناسب نہیں یہ نہ ہو کہ اسے میری کوئی بات بُری لگ جائے۔ میرے اور اس کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہونا چاہیے مجھے خود کو سنبھالنا چاہیے۔ ہر چند کہ یہ سب کچھ میرے لیے اجنبی ہیں۔ لڑکیاں تو چٹائی شرمائی گھروں سے رخصت ہوتی ہیں۔ سچ پر ان کا تعارف اس اجنبی سے ہوتا ہے۔ پہلی بار رونمائی ہوتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ تکلف کے پردے اٹھتے ہیں۔ لیکن یہاں کوئی سچ نہیں تھی۔ یہاں تو رنگ ہی بدلا ہوا تھا۔ ٹھیک بھی ہے۔ یہ یورپ ہے۔ جہاں چراغ میں شادیاں ہوتی ہیں۔ اور دلہا، دلہن لوگوں کی مہار کھادیاں وصول کرتے ہوئے ہفتی صون پر چلے جاتے ہیں۔ میرے لیے بھی یہی طرز زندگی ہے اور مجھے بھی وہی کرنا ہے جو یہاں کی روایات میں شامل ہے۔

چنانچہ دوسری بار جب انوار اسے لینے آیا تو اس کے انداز میں وہ جھجک نہیں تھی۔ چپے ایک کار موجود تھی جس میں انوار کا ایک پاکستانی دوست اس کا منتظر تھا۔ اس نے اتر کر کھلی کار کا دروازہ کھولا اور فاخرہ انوار کے ساتھ بیٹھ گئی۔ کار لندن کی کبرزدہ سڑکوں پر دوڑنے لگی۔ فضا میں ایک خوشگوار خشکی تھی اور موسم بے حد حسین تھا لندن کی جگہ گاتی سڑکیں۔ طے کرتی ہوئی کار گولس ٹائی ہوٹل کے وسیع پارکنگ لائن پر رک گئی۔ یہاں بھی کچھ لوگ استقبال کے لیے موجود تھے۔ مقامی اور غیر مقامی لوگ۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ ان میں کوئی بھی پاکستانی عورت نہیں تھی۔ البتہ مقامی عورتوں اور لڑکیوں کی تعداد اس بارہ کے قریب ہوگی۔

گولس کی مکمل چھت پر انتظام تھا۔ یہاں انوار نے اس کا تعارف اپنے دوستوں سے کروایا اور انہوں نے اسے ختمے پیش کیے۔ فاخرہ نے گردن خم کر کے ان کا شکر یہ ادا کیا تھا۔ آرکسٹر ایڈم سردوں میں انگریزی دھنیں پیش کر رہا تھا۔ لوگ اپنی اپنی میزوں پر بیٹھ گئے تھے اور ان کے سامنے شراب کے برتن جمادیے گئے تھے۔ فاخرہ نے یہ برتن دیکھے تو اس کا دل دھک سا ہو گیا۔ اگر شراب کے یہ برتن اس کی میز پر بھی آجائے تو۔

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ شراب کے بعد رقص کا ایک پروگرام ہوا۔ اور پھر وہی یاد ہو شروع ہو گئی

یورپ کی روایت سے وابستہ ہے۔ پھر ایک پر تکلف ڈنر ہوا اور ڈنر کے بعد تھوڑے سے تفریحی پروگرام۔ رات بارہ بجے کے قریب یہ پارٹی ختم ہوئی۔ اور اس کے بعد وہ انوار کے ساتھ اس کار میں واپس چل پڑی۔ یہاں اٹھلا موجود تھی۔ جس نے اسے شب خوابی کا لباس دیا اور اس کے بعد مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ پھر ایک خوب صورت گاؤں میں ملبوس انوار اس کے پاس پہنچ گیا۔

”وطن سے دور ہو کر ہمیں ان لوگوں کی روایت اپنانا پڑتی ہیں فاخرہ۔ جن کے درمیان ہم ہوتے ہیں جنہیں یہ سب اجنبی اجنبی سا لگ ہوگا۔ لیکن یہ یہاں کی تہذیب میں شامل ہے اور ہمیں ان ہی لوگوں کے ساتھ زندگی بسر کرنا ہے۔ اس لیے ان باتوں کو محسوس نہ کرنا۔ مجھے معلوم ہے کہ ابتدا میں جنہیں تکلیف ہوگی۔ لیکن رفتہ رفتہ ان تمام باتوں کی عادی ہو جاؤ گی۔ تاہم اپنے وطن کی روایات کے طور پر تمہاری حسین معیت کا اعتراف اور اس کا خراج، یہ ایک تحفہ جو میری طرف سے تمہاری نذر ہے۔“ انوار نے ایک حسین ہار اپنی جیب سے نکالا اور فاخرہ کی گردن میں ڈال دیا۔

فاخرہ سچائی سی ٹھنکی رہی۔ تب انوار نے کہا..... ”دیکھیں محترمہ فاخرہ! بات دو غریب الوطنوں کی ہے۔ دونوں ہی ایک کیفیت کے شکار ہیں۔ پھر کیوں نہ درمیان سے یہ تکلف ہٹا دیا جائے۔“ اور فاخرہ نے مسکراتے ہوئے گردن جھکا دی۔ یہ بتائیے آپ کو یہ سب کچھ کیسا لگا۔“

”بہت عجیب.....“ فاخرہ نے کہا۔

”یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا۔ یہ ایک سچا جواب ہے۔ جس سے آپ کی شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ ماحول دلکش ہے۔ مجھے پسند ہے۔ جنہیں بھی یقیناً پسند آئے گا۔ بس خود کو اس ماحول میں ضم کرنا ضروری ہے۔ زندگی کے بارے میں میرے کچھ نظریات ہیں۔ فاخرہ! جن کے بارے میں آہستہ آہستہ جنہیں معلوم ہو جائے گا۔ میں زندگی کو جو ملے اقدار کی ری میں باندھ کر رکھنا پسند نہیں کرتا۔ میں ان ناکام لوگوں کی فہرست میں شامل نہیں ہوں۔ جو پہلی ناکامی اور کم ہمتی کو اخلاقیات سے منسوب کر دیتے ہیں۔ میں تو زمین کے مختصر شب و روز عیش و عشرت سے گزارنے کا قائل ہوں۔“

”جی“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”بھئی کچھ اور بھی تو کہو..... اپنی بات کرو۔ میں منتظر ہوں۔“

”کیا کہوں.....“ وہ ہنسنے لگی۔

”میرے بارے میں پوچھو اپنے بارے میں بتاؤ۔ ہم دونوں ابھی ایک دوسرے کے



تری یادوں کے گلاب

رشتوں کی تخلیق بھی قدرت نے خوب کی ہے۔ دو انجینی ہستیاں چند وعدوں کے ساتھ ایک دوسرے کی زندگی میں داخل ہوتی ہیں اور پھر مرکز اور جاتی ہیں۔ سارے رشتے نامہ پڑ جاتے ہیں پھر نئے رشتوں کی تخلیق ہوتی ہے اور دونوں ان رشتوں کا فرض نبھانے لگتے ہیں قاخرہ نے اپنے کمر کو اپنائیت کی نگاہ سے دیکھا۔ اپنے بالکل نزدیک سوئے ہوئے اس انجینی کو دیکھا جواب انجینی نہیں تھا۔ اس کی ذرات کا گھس تھا۔ اور پھر وہ مسکراتی ہوئی ہاتھ روم میں چلی گئی۔  
دل میں احساس کی رنگینیاں لئے ہوئے جب وہ ہاتھ روم سے نکلے تو انوار جاگ چکا تھا۔ وہ بستر میں گھسا اخبار دیکھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر مسکرایا اور اخبار رکھ دیا۔ وہ اس سے نگاہیں نہیں ملا رہی تھی۔

”تشریف رکھیے خاتون! آپ صبح بخیر کی عادی ہیں؟“

”جی ہاں۔“

”میں دیر تک سو رہا ہوں لیکن آج آپ کی وجہ سے جاگ گیا ہوں۔“

”شکریہ۔ دفتر۔ میرا مطلب ہے آپ کی کاروباری مصروفیات کس وقت شروع ہوتی ہیں؟“

”فون کی گھنٹی بجتے پھر کاروبار شروع ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ گھنٹی کئی کئی دن نہیں بجتی اور بعض اوقات ایسے بجتی ہے کہ پھر گنتی ہی نہیں۔ ویسے چند روز کے لیے میں نے اپنے کرم فرماؤں سے معذرت کر لی ہے کہ یہ گھنٹی نہ بجائیں۔ کیونکہ میں قاخرہ کی مسین آواز میں اس حرکت آواز کا تحمل نہیں ہو سکتا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور وہ بھی مسکرا دی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ بلا وجہ خوفزدہ تھی۔ انوار تو بے حد دلکش ہے۔ اس کی حقیقت تو روح کی گہرائیوں میں سرور گھونکتی ہے۔

”ناشتا کس وقت؟“

”صبح کو صرف چائے ناشتا دس بجے تک لیکن ابھی تم اس کی گھڑت کرو۔ نو بجے چائے آ جائے گی۔ دراصل میں نے اٹھلا کو یہ ہی ہدایت دی تھی۔ میرا خیال تھا کہ آپ بھی نو بجے سے پہلے نہیں جاگیں گی۔“

”میں چائے بنا لاتی ہوں۔“

”رہنے دو ڈارنگ! تمہاری قربت چائے سے کہیں زیادہ لذت آمیز ہے۔“ اس نے

بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ میں ایک دوسرے سے واقف ہونا چاہئے۔“

”آپ کے والدین؟“ قاخرہ نے خود کو گھٹکھٹکے کیلئے تیار کر لیا۔

”دیکھی ہی نہیں۔“

”کیوں؟“ وہ تعجب سے بولی۔

”بچپن ہی میں سرمے تھے۔“

”پھر آپ کی پرورش؟“

”ایک بچانے کی تھی۔ بچا کا بھی انتقال ہو گیا۔“

”رب نواز بھائی آپ کے۔“

”کوئی نہیں بس شاسانی ہے۔ دو بھی اس طرح کے میرے بچا رب نواز کے پڑوسی تھے۔“

”ارے تو وہ آپ کے سگے بھائی نہیں ہیں۔“ اسے سخت حیرت ہوئی تھی۔

”نہیں قاخرہ البتہ ان کے اور میرے درمیان تحائف کا رشتہ ضرور برقرار ہے۔ میں جب

بھی لندن سے جاتا ہوں ان دونوں میاں بیوی کیلئے بہت کچھ لے جاتا ہوں۔ تحائف محبت کی بنیاد بن جاتے ہیں۔“

”تعجب ہے۔“

”آپ یہاں کیا کاروبار کرتے ہیں؟“

”مختلف۔ امپورٹ ایکسپورٹ بھی کرتا ہوں۔ سمندری جہازوں کے ڈرائیوے جو مال باہر

سے آتا ہے اور یہاں سے باہر جاتا ہے۔ اس کی ٹوڈنگ اور ان ٹوڈنگ کے ٹھیکے بھی لیتا ہوں۔“

”کوئی دفتر ہے آپ کا؟“

”نہیں اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ بس مختلف کمپنیوں سے رابطہ ہوتا ہے۔“

”یہ کاروبار آپ کے لیے اطمینان بخش ہے۔“

”مکمل طور پر۔ عرصے سے کر رہا ہوں۔“ اس نے جواب دیا اور قاخرہ خاموش ہو گئی۔ اس

سے زیادہ اور کیا گفتگو کرتی؟ پھر انوار اس سے اس کے بارے میں پوچھنے لگا اور دفتر دفتر قاخرہ اس

سے بے تکلف ہو گئی۔ والدین کی جدائی کا جو بوجھ انجینی ماحول میں آنے کی کوفت اس کے وجود

میں تھی۔ وہ آہستہ آہستہ زائل ہونے لگی اور دوسری صبح وہ مطمئن تھی۔ اس کے اندر ایک خود اعتمادی

ابھر آئی تھی۔

فادر کا ہاتھ پکڑ کر مسیری پر بٹھالیا۔ اور فادرہ بری طرح جھینپ گئی۔ "آپ کے آج کیا پروگرام ہوں گے خاتون؟" انوار نے پوچھا۔

"آپ کے امکانات کی تفصیل۔" اس نے جواب دیا۔

"ہوں۔ سوچ لیجئے۔ اتنی سعادت مندی منگی نہ پڑ جائے۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

"آپ کی خوشی میری زندگی ہوگی۔" وہ شرمیں لہجے میں بولی۔

"تمہارے یہ الفاظ میں نے ذہن میں محفوظ کر لیے ہیں۔" اس نے فادرہ کی کھائی پکڑ

کر جھٹکا دیا اور فادرہ خود ہی اپنے الفاظ کی گرفت میں آ گئی۔ بھلا ہوا لکھنا کا اس نے فوراً مداخلت کی تھی۔ دروازے پر دستک دے کر اس نے اندر آنے کی اجازت مانگی تھی اور انوار نے گہری سانس لے کر اجازت دے دی تھی۔ فادرہ نے بے اختیار آنکھیں کی کوشش کی لیکن انوار نے اس کی اس کوشش کو کامیاب نہ ہونے دیا اور وہ بے بس ہو گئی۔ اٹھٹھٹھا چائے کی ٹرافی دھکیلی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔

"صبح بخیر حضرات!" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور ٹرافی میں سے ایک ٹولہ صورت بگڑتے نکال کر مسیری کی سائینڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ فادرہ کسمار رہی تھی۔ اسے انوار کی اس حرکت پر تعجب ہوا تھا۔ اس کے نزدیک تو شہر اور بیوی کی قربت تو ایک مقدس راز ہوتا ہے جو ہمیشہ ان دونوں کے درمیان رہتا ہے۔ لیکن انوار کی نگاہ میں اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ کیا یہ بھی یورپ کی تہذیب کا کوئی اہم جزو ہے۔

"صبح بخیر کس اٹھٹھا! آج آپ نے بھی کچھ جلدی کر دی۔ خیریت تو ہے؟" انوار بولا۔

"مجھے آپ لوگوں کے جاننے کی آہٹیں مل گئیں تھیں۔ میں نے سوچا ان پر سرٹ لمحات میں چائے کی گری بھی شامل کر دوں۔" اس اٹھٹھا نے ہنستے ہوئے کہا۔ اور چائے بناتے لگی۔

"آپ کیلئے شکر؟" اس نے فادرہ سے پوچھا۔

"صرف ایک چمچ۔" فادرہ کو مضاس کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ خود شہد میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ انوار نے جواب دیا اور فادرہ نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپایا۔

اٹھٹھا چائے رکھ کر چلی گئی تو انوار اسے چیمیز نے لگا۔ فادرہ نے اس سے اس بات کی شکایت نہیں کی تھی۔ وہ انوار کے مزاج کو سمجھنے میں بڑی محتاط تھی۔ چائے کے دوران بھی چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتے لگیں۔ پھر انوار نے کہا۔ "اٹھٹھا کو میں نے یہاں تین ماہ کیلئے آججج کیا ہے۔

ترکی یادوں کے گلاب

ایک ماہ اور چودھن ہو چکے ہیں۔ باقی رہے ایک ماہ چوبیس دن۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس دوران اس سے بہت سی باتیں سیکھ لو۔ اب یہ تمہاری ذہانت ہوگی کہ کس طرح اس سے اپنا مطلب نکال لینی ہو۔ میرا خیال ہے کہ اس مختصر وقت میں اس کے ذریعے اپنی انگریزی بہتر بنا سکتی ہو اور یہاں نے آداب سے پوری طرح واقفیت حاصل کر سکتی ہو۔ کیا خیال ہے؟"

"ٹھیک ہے۔ میں ایسا ہی کروں گی۔ لیکن یہ تین ماہ والی بات میری سمجھ میں نہیں آتی؟" وہ بولی۔

"بھئی لندن میں مگر غلطی لازم نایاب ہیں۔ کچھ ایسے ادارے ہیں جہاں لوگوں کی وقتی ضرورت ہماری مفاد سے لے کر پوری کر دیتے ہیں۔ اٹھٹھا ایسے ہی ایک ادارے کی رکن ہے۔ اگر ہم نے اسے مستقل ملازم رکھا تو ہماری آمدنی کا ایک بہت بڑا حصہ اس کی نذر ہو جائے گا۔ کیا خیال ہے۔ اگر تمہاری خواہش ہو تو؟"

"ہرگز نہیں۔" وہ جلدی سے بولی۔ "میں کس لیے ہوں۔"

"بالکل یہ چھوٹی سی دنیا اب تم ہی نے سنبھالی ہے۔ میں اٹھٹھا سے تو یہ فائدہ ہو جائے گا کہ وہ روزمرہ کی ضروریات سے تمہیں آگاہ کر دے گی۔"

"اس حد تک تو ٹھیک ہے۔" فادرہ نے گردن ہلا دی۔

دس بجے تھے۔ انوار اس کے بعد دن بھر کا پروگرام طے ہونے لگا۔ لندن کے حسین شب و روز کی ابتدا آج ہی دن دوپہر کو ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

فرانکلن اسکوائر بجلی کی دھوپ میں نہایا ہوا تھا۔ چوک کے وسط میں استودہ بلند و بالا ستون کی پوٹی پر کھڑے لارڈ ٹیلن کی ٹوپی دھوپ میں چمک رہی تھی۔ نیشنل گیلری کے یونانی ستونوں اور بیسٹ پال گرا کے گنبد سے اترے والے کپڑے لوگوں کے التفات سے محفوظ ہو رہے تھے۔ ایک جانب ایک بڑے فوارے کے وسط میں ایک دیو زاد چھلی کا مجسمہ ٹھہرے پھلائے منہ سے گیلیوں پانی اٹک رہا تھا۔

منگی چھت کی خوب صورت کار میں یہ بجلی کی دھوپ ذرا بھی ناگوار نہیں گزر رہی تھی۔ فادرہ جیسے خواہوں کے جہان میں آ گئی تھی۔ اسے یہ خواب بڑا عجیب لگ رہا تھا۔ اس کی سوچیں پار پار بٹک جاتی تھیں۔ کہیں اس خواب سے آنکھ نہ کھل جائے۔ چائے تو اسی گھر کے دروازے کے

دورماں ہو جہاں اس نے طویل زندگی گزاری تھی۔

اس احساس کے ساتھ اسے اپنی کیفیت کا تجزیہ کرنا مشکل ہوتا تھا۔ آیا کوئی کیفیت اس کیلئے خوشگوار ہے۔ انوار اسے لندن سے روشناس کروا رہا تھا۔ اور تمام دن وہ خوبصورت جگہوں کی سرکرتے رہے۔

دو پہر کا گھانا ایک خوبصورت چھوٹے سے رستوران میں کھایا گیا۔ اور یہاں دیر تک بیٹھ کر اب تک کے سڑکی تھکن دور کی گئی۔ اس کے بعد وہی آوارہ گردی شام پانچ بجے فلیٹ پر واپس ہوئی۔ دونوں ہی تھکے ہوئے تھے۔ اسٹھلانے بتایا کہ مسٹر اکبر علی کا فون آیا تھا۔ انہوں نے کہا ہے کہ آپ جس وقت بھی آئیں انہیں فون کر لیں۔

”ٹھیک ہے۔“ انوار نے کہا۔ اور فون کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے نمبر ڈائل کیے۔ ریسیور کان سے لگا یا۔ چند ساعت گفتگو کرنے کے بعد یوں۔ ”بھئی بیگم قریب ہی موجود ہیں۔ آج سارا دن آوارہ گردی رہی ہے۔ ذرا ان سے معلوم کر لوں اس کے بعد ہی جواب دے سکوں گا۔“ انوار نے کہا۔ اور ماڈتھ جیس پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”اگر ممکن نہ ہوگی ہوتو رات کی دعوت قبول کر لیں۔“ اکبر میرا دوست ہے اس کی خواہش ہے کہ رات کا کھانا ہم اس کے ساتھ کھائیں۔“

”میں کیا تاؤں جیسے آپ پسند کریں۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ نہیں ڈارلنگ اب میری پسند آ رہی ہے۔ آدمی تمہاری، اگر ممکن نہ محسوس کر رہی ہو تو ٹھیک در نہ معذرت کر لیں گے۔“

”نہیں ممکن ہو کوئی خاص نہیں۔“

”بس ٹھیک ہے۔ قبول کیے لیتے ہیں۔“ اس نے کہا اور پھر ماڈتھ جیس سے ہاتھ ہٹا کر بولا۔

”ٹھیک ہے اکبر ہم رات نو بجے پہنچ جائیں گے۔ اوکے۔“ اور اس نے فون بند کر دیا۔ ”یہ اکبر بھی منجھا ہے۔ ایک وقت کئی کئی لڑکیوں سے عشق کر رہا ہے اور ہر ایک سے شادی کا وعدہ کر رہا ہے۔ مجھے تو خطرہ ہے کہ کسی دن سب کچھ ہو گئیں تو اس کے سر پر ایک بال نہیں بچے گا۔“

”ایسے لوگوں سے بھی آپ کی دوستی ہے۔ نہ تو لوگوں کی صحبت بھی بُری ہوتی ہے۔“

فاخرہ نے کہا اور انوار آنکھیں بند کر کے ہنسنے لگا۔

”اچھا ملائی جی۔ لباس کا انتخاب کر لیں کون سا لباس زیب تن کریں گی۔ ارے ہاں فاخرہ!

دل شاپنگ کریں گے۔ مس اسٹھلانے انہیں چھوڑے لباس کی فہرست مہیا کر دیں گی۔ ان میں سے اپنی ہند کے لباس منتخب کر لینا۔ اس وقت کوئی اچھا سا لباس نکال لو۔“

”بہتر۔“ فاخرہ نے کہا۔

اس وقت کیلئے اس نے شام کے وقت کی مسابقت سے گھرے نیلے رنگ کی ساڑھی منتخب کی اور پھر مس اسٹھلانے کی مدد کے بغیر ایک اپ کیا۔ ایک اپ کا اسے خاص سلیقہ تھا۔ انوار اسے دیکھ کر خوش ہو گیا تھا۔ اور اس نے بہت سے خوشی کلمات کہے اور بولا۔

”بھئی مجھے بھی لباس کا مرض ہے عمدہ لباس پہننے کا شوق مجھے بچپن ہی سے ہے۔ اس سلسلہ میں بڑے بڑے واقعات ہوئے ہیں۔ یوں سمجھو کہ میں نے لباس چوری بھی کیے ہیں۔ لیکن بس چند گھنٹوں کیلئے۔ اس کے بعد اسے اسی مشقت سے انہیں واپس بھی رکھا آیا ہوں جس مشقت سے انہیں چرایا تھا۔ کسی وقت یہ واقعات تفصیل سے سناؤں گا۔“

☆ ☆ ☆

اکبر صاحب حیثیت انسان معلوم ہوتا تھا۔ خوبصورت برآمدے میں اس نے ان دونوں کا استقبال کیا۔ اس کے ساتھ ایک خوبصورت لڑکی بھی تھی۔ جس کا تعارف اس نے مس ایلچی کے نام سے کر لیا تھا۔

”بہت جلد میں تمہیں مس ایلچی سے شادی کی خوشخبری سنانے والا ہوں۔ ویسے انوار، بھابی کو دیکھ کر میری نیت خراب ہو گئی ہے۔“ آخری القاط اس نے اردو میں کہے تھے۔

”اے مسٹر۔۔۔۔۔ القاط کے انتخاب میں سلیقہ برتو۔“ انوار نے ہنسنے ہوئے کہا۔

”سوری۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے۔ اپنا ویس اپنا ویس ہی ہوتا ہے۔“ اکبر نے فاخرہ کو اوپر سے چپکے دیکھتے ہوئے کہا۔

فاخرہ کو اس کی نگاہیں اوپاش محسوس ہوئی تھیں۔ اسے یہ محسوس نہیں آیا تھا۔ اس نے اس سے ذرا بھی بے تکلفی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ کھانا کھایا گیا اور تھوڑی دیر کی خوش گپوں کے بعد انوار نے رخصت کی اجازت چاہی۔ اکبر انہیں باہر تک چھوڑنے آیا تھا۔ فاخرہ نے احتیاطاً اکبر کے بارے میں کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ البتہ انوار اکبر کے بارے میں بہت سی باتیں بتاتا رہا۔ اکبر کی حکمرانہ حرکتوں کو وہ شرارتوں سے تشبیہ دے رہا تھا۔ اور فاخرہ کو ایک ناگوار سا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے دل میں سوچا کہ ظاہر ہے کہ انوار بھی ایسے ہی لوگوں کی صحبت میں رہا ہے۔ اس سے قبل اس کی



گھرانی کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ اب اس کے دوستوں کا انتخاب میں کروں گی۔ اور اسے ایسے گلیا کردار کے ٹوکوں سے بچاؤں گی۔ اس نے اس بات پر انوار کی طرف سے ذل خراب نہیں کیا تھا۔ دوسرے دن تقریبات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس دن وہ شام کے سرگرمی دھندلوں میں گھر سے نکلے تھے۔ مشہور زمانہ پکاؤنی سرکس کے گرد لاکھوں روشنیاں بج رہی تھیں۔ پکاؤنی میں امروز کے جیسے کے گرد پیوں کا مسکن تھا۔ جہاں سے ناقوس کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ اور ان آوازوں کے درمیان بری کرشنا، ہرے رام کا چاپ ہور ہوا تھا۔ سفید سل کے لڑکے لڑکیاں ہندوؤں پر ہمسوں اور دیوداسیوں کا روپ دھارے فٹ پاتھ پر تاج رہے تھے۔ اور لڑکوں کے سرمذے ہوئے تھے۔ بعض کے سروں کے درمیان چوٹیاں بھی نظر آرہی تھیں۔ ان بہرہویوں نے سفید دھوتیاں اور کھڑکیوں پر بن رکھی تھیں۔ ہاتھوں میں گھنٹیاں اور گلے میں ڈھونگیاں ڈال رکھی تھیں۔ جنہیں بجا بجا کر وہ لندن کے ہندو مند کیلئے چندہ جمع کر رہے تھے۔

بے انتہا خوبصورت دوکانیں اور شور و ساز بازار میں بکھرے ہوئے تھے۔ یہ شور و حراستے حسین تھے کہ ان کے سامنے سے نظر چر کر گزر جاتا ہے حد مشکل تھا۔ راگیروں سے فٹ پاتھ اٹنے پڑے تھے۔ اسی بھڑ میں انوار نے فاخرہ کیلئے زبردست خریداری کی اور لاکھوں روپے کے لمبوسات، زیورات اور دوسری آرائشی چیزیں خرید لیں۔ نمبر اینڈ نمبر اور لارڈ اینڈ لیلڈی کے لمبوسات کی دوکانوں سے اس نے کافی خریداری کی اور جب فاخرہ روپائی ہو گئی تب کہیں دو وہاں سے نکلا۔

”آپ نے اس وقت شدید زیادتی کی ہے۔“  
”کیوں؟“

”کیسے کیسے لباس خریدنے لے کیا میں یہ لباس پہنوں گی؟“  
”یہ تو آنے والا وقت بتائے گا۔ لندن انجینوں کو اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔“  
”لیکن مجھے اپنا رنگ پسند ہے۔“

”چلو تھیک ہے۔ دل چاہے تو ان لباسوں کو پہن لینا اور نہ شافرز اسٹریٹ میں حسین ترین ساز حیاں اور شلوار سوٹ بھی لیا جائیں گے۔“ انوار نے کہا۔  
اور یہ عورتی رقم پر ہار ہوئی؟

”ہوئے دو چار کمائے والا میں ہوں۔“ جیسے فکر کیوں ہے؟

ترکی یادوں کے گلاب

”میں جناب آپ کمانے والے ہیں تو میرا فرض آپ کی کمائی کو سنبھالنے کا ہے۔ اب آپ اس بے دردی سے خرچ نہیں کریں گے۔“ وہ بولی اور انوار نے ایک تہقہ لگا دیا۔  
”بہتر ہے جناب آئندہ خیال رکھیں گے۔“ اس نے کہا۔ اور بات آئی گئی ہو گئی۔ بہر حال انوار کے اس اعزاز سے بھی فاخرہ نے یہی نتیجہ نکالا کہ وہ اسے خوش دیکھنا چاہتا ہے۔

ایک ماہ اسی طرح گزر گیا کہ فاخرہ کو احساس بھی نہ ہو سکا۔ لندن کی کھر زدہ شامیں، بارشیں، جو کسی وقت بھی ہو جاتی تھیں اور ان میں موسم کا تھیں نہیں ہوتا تھا اور تفریح کا ہیں جہاں جا کر وہ ایسی مشکل ہو جاتے۔ انوار اسے پورے لندن سے روشناس کر رہا تھا۔ اس نے یہاں کے ٹائٹ کلب، کبھرے ہال اور آجیہاؤس بھی دکھائے تھے۔ جہاں قدم رکھنے سے بھی شرمندگی ہو۔ عزائیت اور فاشی کے ایسے مظاہرے کہ فاخرہ کی آنکھیں بند ہو جاتیں تھیں۔ ان مظاہروں کے بعد وہ شوہر سے آنکھ ملانے کے قابل بھی نہیں رہتی تھی۔

ایک بار اس نے شکایت کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”انوار! میں ایسی جگہوں پر جانا پسند نہیں کرتی۔ جہاں تفریح اور رقص و موسیقی کے نام پر انسانیت کی تذلیل کی جاتی ہو۔ آپ مجھے ان جگہوں پر نہ لے جایا کرو۔“

”اوہ..... فاخرہ! انسان کو زندگی کی تمام حقیتوں سے روشناس ہونا چاہئے۔ میں تمہارا شوہر ہوں۔ ان جگہوں پر تمہارے ساتھ ہونا ہوں۔ پھر تمہیں کس بات کی فکر ہے۔ یعنی انسان کو کشادہ ذہن ہونا چاہئے۔ یہ دنیا نویست ہمیں کیا دیتی ہے۔ یہ اس جہان کی حقیقتیں ہیں۔ آنکھیں بند کر لینے سے بلی نہیں بھاگتی۔ تمہیں ان ساری تقریبات میں دلچسپی لینا چاہئے۔ کیونکہ میں انہیں پسند کرتا ہوں۔“

انوار نے یہ الفاظ نرم لہجے میں کہے تھے۔ لیکن اس میں حق شوہریت چھپا ہوا تھا۔ یہ الفاظ حکم کی حیثیت رکھتے تھے۔ ایک لمبے کیلئے فاخرہ گم م ہو گئی۔ انوار ان چیزوں کو زندگی کی حقیقت بتا رہا تھا۔ جو زندگی کا مذاق اڑاتی تھیں۔ لیکن اس سلسلے میں کوئی بحث کر کے وہ انوار کے دل میں کوئی ہال ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے وہ خاموش ہو گئی۔

تب انوار نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”تم خود کو میری مرضی پر چھوڑ دو فاخرہ! میں تمہیں ایک جدید اور ماڈرن لڑکی بنا دوں گا۔ تمہیں نہیں معلوم کہ میرے دوست تم پر کیسے کیسے تھرے کرتے ہیں۔ تمہارا نام لے کر ان کے لہجوں میں حسرت جھانکتی ہے۔ بس تمہاری سی کی ہے۔ جو دور

تو جیسے گی۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ ایسی بچیوں پر تم تنہا عورت نہیں ہوتیں۔ دوسرے لوگ بھی اپنی دوستوں اور بھائیوں کے ساتھ آتے ہیں۔ آخر وہ بھی انسان ہیں۔ ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں اگر اس کی دلچسپیاں نہ پاتا ہیں گے تو ان کے درمیان اجنبی بن کر رہ جائیں گے۔ سمجھ نہیں تم؟

اس نے گردن ہلا دی۔ اس کے دل نے ان باتوں کو ذرا برابر بھی قبول نہیں کیا تھا۔ لیکن.....

انوار اس دوران صرف تین بار پورے دن گھر سے غائب رہا تھا۔ ایک رات کو اس نے فون کر دیا تھا کہ وہ گھر نہیں آئے گا اور یہ رات اس نے تنہا گزاری تھی۔ اس اختلا بھی رات کو کہیں جلی گئی تھی۔ پوری زندگی میں یہ پہلی رات تھی وہ نہ وہ کبھی تنہا نہ رہی تھی۔ چار بجے تک وہ نہ سو سکی تھی۔ دوسرے دن صبح ہی صبح انوار واپس آ گیا۔ لیکن یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ساری رات جاگ رہا ہو۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ اور کپڑے تھکے تھے۔

”کیا آپ رات بھر نہیں سو سکے؟“ اس نے پوچھا۔

”کہیں ڈارنگ۔ ساری رات جہازوں کے درمیان گزاری ہے۔ اجازت دو تو سو جاؤں۔“

”ناشتا کر لیں۔“

”بالکل جی نہیں چاہ رہا ہے۔ پلیز تم ناشتا کر لیتا۔ میں سونے جا رہا ہوں۔“

”لباس تو بدل لیں۔“

”ایں۔۔۔ ہاں لباس بدلے دو۔“ انوار نے کہا۔

وہ جھٹکا جھٹکا سا تھا۔ قاہرہ نے سوچا کہ رات بھر جاننے کی وجہ سے اس کی یہ کیفیت ہے۔

اس نے بڑے پیار سے انوار کو سلا دیا تھا۔ کمرے کی جتیاں بجھا کر اس نے کھڑکیوں کے پردے مگر دیئے تاکہ وہ سکون سے سو جائے۔ انوار کا اتارا ہوا لباس لے کر وہ باہر نکل آئی۔ لباس پر وہ جیسے تھے اور ان سے عجیب سی بوا رہی تھی۔

نہ جانے کیسی بو ہے۔ اجنبی اجنبی سی۔ جیسے کسی دوا کی بو ہو۔ بہر حال یہ انوار کا کاروبار تھا۔ وہ کیا کر سکتی تھی۔ اس نے ذہن میں کسی بات کو کوئی جگہ نہیں دی۔ دوپہر کو انوار چاچا۔ تو وہ تازہ دم ہو چکا تھا۔ غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر ان دونوں نے لچ کیا اور لچ پر انوار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اب تم بناؤ تنہا رات کیسے گزری؟“

”نہایت تکلیف دہ۔ میں زندگی میں کبھی تنہا نہیں رہی۔“ اس نے جواب دیا۔

”لیکن اب آپ ایک ذرا در خاتون ہیں۔ اب تو اکثر آپ کو تنہا رہنا پڑے گا۔ میری

مصرفیات ہی ایسی ہیں۔“

”ٹھیک ہے عادت ڈال لوں گی۔ یہ اختلا بھی مجھے جانتی تھی کہیں جلی گئی ابھی تک نہیں آئی۔“

”ممکن ہے وہ اب نہ آئے۔“

”کیوں؟“

”میں نے جیسے بتایا تھا ناں کہ وہ صرف تین ماہ کیلئے آئی تھی۔ اس کا عرصہ تقریباً پورا ہو چکا

ہے۔ ویسے میرا مشورہ ہے کہ اب دوسروں کے سہارے چھوڑ دو۔ خود اعتمادی پیدا کرو۔ دوست

بناؤ۔ لندن کی زندگی میں یہ بہت ضروری ہے۔“

”لیکن میں دوست کیسے بناؤں؟“

”بھئی اتنے لوگوں سے ملی ہو۔ ان میں سے کوئی تمہارے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ انہیں

میں سے انتخاب کر لو۔ وقت کاٹنے کی فن کی تو بات ہے۔“

”آپ اپنے دوستوں کی بات کر رہے ہیں؟“

”ہاں۔“

”لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کے ساتھ اس کی فیملی ہو جبکہ لندن میں بے شمار

پاکستانی گھرانے بھی رہتے ہوں گے۔“

”فیملی نہ ہو خود تو ہیں۔ دوستوں کیلئے ضروری نہیں کہ مرد اور عورت کی تخصیص کی جائے۔“

انوار نے رد واری میں کہا۔ جیسے یہ کوئی خاص بات نہ ہو۔ لیکن وہ ششدر رہ گئی تھی۔ اسے یہ الفاظ

ایک شہر کے الفاظ محسوس نہیں ہوئے تھے۔ وہ تحیرانہ انداز میں انوار کو گتھی رہی۔ ایک لفظ بھی نہیں

نکل سکا تھا اس کے منہ سے۔

”آج ساؤتھ ہی چل رہے ہیں۔ لندن سے تیس میل کے فاصلے پر ایک بڑا فضا مقام ہے۔

تیار ہو جاؤ۔“

”بہتر۔ میں گھر چلا آتی ہوں۔“ قاہرہ نے کہا۔

”نکل لکھو۔ میں پوسٹ کر دوں گا۔“ انوار نے کہا۔ اور پھر گھڑی دیکھ کر بولا۔ ”وہ لوگ

مقصود یہ تھا کہ وہ تیار ہو جائے۔ اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ لیکن انوار کے الفاظ اب بھی اس کے ذہن میں دھمک پیدا کر رہے تھے۔ اس نے اسے اپنے دوستوں سے دوستی کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ ٹھیک ہے۔ ماحول آدمی کا حلیہ بدل دیتا ہے اس کا خمیر تو نہیں بدل دیتا۔ یہ بات ایک پاکستانی شخص کے ہونوں سے کیسے نکل سکتی ہے۔ وہ اپنی افتادہ کیسے بدل سکتا ہے۔ لیکن انوار نے یہ کہا تھا۔ اس نے یہی سنا تھا۔

ٹھیک تین بجے گاڑیاں فلیٹ کے نیچے آ کر کھیں۔ چھ پور میں لڑکیاں اور چھ پاکستانی مردانہ کر اندر آ گئے۔ ان میں اکبر بھی تھا اور اس کے ساتھ جولاڑی تھی وہ پہلی لڑکی نہیں تھی کوئی اور تھی۔ چائے کا تقاضا ہوا اور وہ جلدی جلدی چائے بنا گئی۔ پھر چائے پینے کے بعد وہ سب چل پڑے۔ انوار کی کار میں صرف وہ تھی۔ انوار خود ڈرائیو کر رہا تھا لیکن وہ بھی جھمی سی تھی۔ انوار نے درمیان میں اسے نوکا بھی۔ "بہت خاموش ہو؟ ناخروہ؟"

"کوئی خاص بات نہیں۔" وہ بولی۔

حالا کہ خاص بات تھی۔ انوار کے یہ سارے دوست ہی اسے لے لٹکے لگ رہے تھے۔ کسی کے چہرے پر شرافت نہیں تھی۔ ان میں سے کسی کے ساتھ اس کی بیوی نہیں تھی۔ یہ سب لڑکیاں گرل فرینڈ تھیں۔ اور پاکستان میں گرل فرینڈ کا تصور ذرا مختلف ہوتا ہے۔ انوار کو اسے ان لوگوں میں شریک نہیں کرنا چاہئے تھا۔ وہ اس کی عزت تھی۔ وہ تو اس کی بیوی تھی۔ اس کا مقام ان لڑکیوں سے کہیں بلند تھا۔ لیکن انوار نے یہ بات ایک بار بھی نہیں سوچی تھی۔ انوار نے اسے وہ مقام نہیں دیا تھا۔ اس نے خود کو سنبھال لیا۔ لیکن انوار کو یہ خاموشی گراں نہ گزری۔

☆ ☆ ☆

یہ ایک حسین ترین قصبہ تھا۔ جہاں گاڑی سڑ کر رہی تھی۔ رستے بھر برے بھارت کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور اس کے بعد سندھ کی نمی کا احساس ہوتا تھا۔ اس پارک کے ارد گرد اتحاد قہود خانے پھیلے ہوئے تھے اور میلہ سالہا ہوا تھا۔ جگہ جگہ بیویوں کا مجمع لگا ہوا تھا۔ وہیں ایک دور افتادہ مقام پر منصوبی آبشار کے نزدیک ٹھہرے گئے۔ منصوبی آبشار کا پانی بندی سے کڑا تھا۔ ایک چھوٹی سی ندی بننا شروع ہو کر چلا جاتا تھا۔ اس کی پھواریں دور دور تک بکھری رہی ہیں۔ سات خیمے لگائے گئے تھے۔ ہر جگہ اپنے اپنے خیمے میں تھا۔ وہ لوگ بچکانہ خوش فطریوں

میں معروف ہو گئے۔ حالانکہ ان کی عمریں ایسی نہ تھیں۔ لیکن وہ سب کچھ بھول گئے تھے۔ لڑکیاں ان کے ساتھ تھیں۔ "آؤ ناخروہ۔ ان سب میں شریک ہو جاؤ۔" انوار نے کہا۔

"میں آپ کے ساتھ ہوں۔" وہ چنچنی چنچنی آواز میں بولی۔

انوار نے اس کی دھڑکی ہوئی آواز پر توجہ نہیں دی۔ یہاں سارے ہی خباثت جمع ہو گئے تھے۔ سکھ آندہ ایک گٹار لے آیا تھا۔ جس کے کسی تار سے اس کی کوئی واقفیت نہیں تھی۔ لیکن وہ گٹار بجا رہا تھا اور سید لڑکیاں اس کے گرد جمع ہو کر رقص کر رہی تھیں۔ قہقہہ لگا رہی تھیں۔ پھر اکبر دونوں ہاتھ بلند کر کے ان کے ساتھ ہانپنے لگا اور اس کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگ بھی اس میں شامل ہو گئے۔ لیکن جب انوار بھی ان کی طرف بڑھا تو اس نے انوار کی آستین پکڑ کر کھینچ لی۔ ایک سوہوم سے آکر اسے پرکھ رہا تھا۔ انوار ان جیسا نہیں ہے۔ وہ ناخروہ کا شوہر ہے۔ ایک سنجیدہ اور شریف نوجوان۔

دوسرے لمحے انوار نے اسے بھی اس مجمع میں محسوس کیا۔ وہ اس کی کمر پکڑ کر اٹھنے لگا۔ "انوار" وہ کسمپاسی۔ لیکن انوار نے اسے نہ چھوڑا۔ تو وہ زور سے گرجی۔ "انوار۔"

دور رک گیا۔ صرف ایک لمحے کیلئے اس نے رک کر اسے دیکھا۔ پھر چٹکیاں بجاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اسے یہ سب دیکھنے لگ رہے تھے۔ جو اپنا مذاق اڑا رہے تھے۔ ناچنے والوں نے اب جڑوں کی شکل اختیار کر لی۔ انوار کیڑا کے ساتھ تھا۔ اور اسے دیکھ کر اس کا دم گھٹا جا رہا تھا۔ شمشیر عقب سے اس کے پاس پہنچ گیا۔ اور اس کی پتلی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے آگے دھکیلتے لگا۔ جب ہی نبھانے کہاں سے اس کے بدن میں یہ قوت آ گئی۔ نبھانے کہاں سے اس کے اندر یہ جرات آ گئی۔ اسنے زور سے خیمہ مارا تھا اس نے شمشیر کے گال پر کھو کر گرے کرتے بھا۔ چٹاخی کی آواز گٹار کی آواز پر بھاری پڑ گئی۔ گٹار رک گیا۔ سب رک گئے اور اسے دیکھنے لگے۔ شمشیر کو دیکھا تو وہ اپنا گال بھلا رہا تھا اور اس کا گال سرخ ہو گیا تھا۔

اس وقت اکبر علی نے ایک بلند بانگ قہقہہ لگایا اور پھر کانے لگا۔ "پاکستانی لڑکی ابتداء میں تھپڑی مارتی ہے۔" بھونڈا اور بے ٹکا گانا تھا۔ لیکن سکھ آندہ نے اسی پر گٹار کے سرگاتا شروع کر دیے اور لڑکیاں تھرکتے لگیں۔ رقص پھر شروع ہو گیا۔ لیکن انوار اس رقص میں شریک نہیں ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر غصے کے آثار تھے۔

ناخروہ وہاں نہ رہی اور اپنے خیمے میں آ گئی۔ اس کی آنکھوں میں تاریکیاں گردش کر رہی



تھی یادوں کے گلاب  
 تھیں۔ معاشرہ کے کچھ اصول بھی ہوتے ہیں۔ دوسرے میں آٹا کھو جانا بھی تو ممکن نہیں ہے۔ اس  
 کا خیال تھا کہ انوار بھی اس کے پیچھے آجائے گا۔ لیکن کافی دیر گزر گئی انوار نہیں آیا۔ شاید رات ہو  
 گئی۔ پھر رات گہری ہو گئی۔ اس کا بدن دکھ دیکھا تھا۔ جب انوار نیچے کے دروازے میں داخل ہوا۔  
 ”روشنی جلاؤ۔ تاریکی کیوں کر رکھی ہے۔“ اس کی آواز بری طرح لڑکھاری تھی۔  
 فاخرہ کے پورے بدن میں خوجہ نیاں کاٹنے لگیں۔ انوار کی آواز ابھی تھی۔ اس سے قبل  
 اس نے یہ آواز نہیں سنی تھی۔ ”انوار۔“ اس نے اندھیرے میں اس کی کلائی پکڑی۔ اس کی آواز  
 سسکی بن کر مطلق سے نکلی تھی۔

”کون؟“ کبوترین، مایا۔ کون ہے؟“ انوار نے اسے ٹٹولتے ہوئے پوچھا۔

”میں تمہاری بیوی ہوں انوار۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔“ وہ رو پڑی۔

”بیوی؟“ انوار نے کہا۔ اور اس کے لہجے میں تعجب تھا۔ جیسے اس لفظ پر اسے حیرت ہوئی  
 ہو۔ ”اوہ۔۔۔۔۔ کون یہ تم ہو۔“ اس نے بے سکتے انداز میں ہنسنے ہوئے کہا۔ اور یہ سن کر نام فاخرہ کے  
 دل میں بھالوں کی طرح لگے۔ انوار کے بدن سے ہوا اٹھ رہی تھی۔ ایسی ہی بو جیسا اس نے اس کے  
 کپڑوں میں محسوس کی تھی۔ تو وہ بھی شراب کی بو تھی۔

ساری رات ایک لمبے کیلئے بھی آنکھ نہ لگی۔ وہ انوار کے بارے میں سوچتی رہی اور حیران  
 ہوتی رہی۔ انوار کی محبت میں اسے کچھ بھی یاد نہ رہا تھا۔ وہ سب کچھ بھول گئی تھی۔ لیکن آج رات  
 اسے سب یاد آئے تھے۔ یہاں انوار کے سوا کون تھا؟ کوئی بھی تو نہیں۔ لیکن انوار۔۔۔۔۔  
 دوسری صبح انوار سوتا رہا پھر جاگ گیا۔ آنکھیں کھول کر اس نے فاخرہ کو دیکھا۔ دیکھا رہا۔  
 اور پھر ایک گہری سانس لے کر اٹھ گیا تھا۔ فاخرہ نے اس سے کچھ نہیں کہا تھا۔ انوار نیچے سے باہر  
 نکل گیا۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد واپس آ گیا۔

”ناشتہ کلاؤ۔“ اس نے بھاری آواز میں کہا۔ اور وہ جلدی سے اٹھ گئی۔ اس نے وہ پکٹ  
 نکالنے لیے جو وہ ساتھ لائے تھے۔ پکٹوں میں باسی کھانا تھا۔ انوار کھانے لگا۔ اور اسے یونہی بیٹھے  
 دیکھ کر بولا۔ ”کھاؤ ناں۔“

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ وہ کمزور آواز میں بولی۔ کھانا تو اس نے رات کو بھی نہیں کھایا تھا۔

”فاخرہ۔۔۔۔۔“ وہ کشت لہجے میں بولا۔ ”کھانا کھاؤ۔“ لہجہ فیصلہ کن تھا۔

وہ خونخوہ ہو گئی اور پھر اس کے ساتھ یہ بے عز کھانا تازہ ہر مار کرنے لگی۔ اسے اپنی بے بسی پر

تھی یادوں کے گلاب

وہ آ رہا تھا۔ وہ خود کو تنہا محسوس کر رہی تھی۔ کھانے سے فارغ ہو کر انوار نے اسے تیار ہونے کو کہا۔  
 اور اس نے گردن ہلا دی۔

تیس میل کا سفر طے کرنے کے بعد وہ واپس فلیٹ پہنچ گئے۔ فاخرہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا  
 تھا کہ آخر یہ لوگ وہاں کیوں گئے تھے؟ نہ تفریح ہوئی نہ بیرونی سیاحت۔ بد مزگی البتہ ہو گئی تھی۔  
 پھر انوار نے اس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ فلیٹ پر آ کر پہلے اس نے غسل کیا۔ پھر دوسرے  
 کمرے میں جا کر سو گیا۔ اس دوران وہ بیٹھی سوچتی رہی تھی۔ انوار کے بارے میں کسی بڑے  
 انداز میں سوچنا بھی اب اس کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ اس کے دل میں انوار کی محبت تھی۔  
 ایک شرمیلی عورت کی مانند اس نے انوار کو اپنا سب کچھ تسلیم کر لیا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ پیار  
 سے انوار سے بات کرے گی۔ اسے سمجھائے گی۔ ظاہر ہے وہ یہاں کے ماحول میں ڈوبا ہوا  
 ہے اسے یہ سب کچھ یوں برائیں لگتا کہ اس نے ایک طویل زندگی لندن میں گزار دی ہے۔ اس  
 کی نہ ہاں ہے نہ بہن جو اسے عورت کی عظمت کا احساس دیتا۔ پھر اس نے کھانا تیار کیا اور انوار  
 کو بچانے پہنچ گئی۔

لیکن وہ جاگ رہا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر سرکرائی لیکن انوار سنجیدہ ہی رہا۔ ”کھانا نہیں کھائیں  
 گئے۔“ اس نے صمت سے پوچھا۔

”بھوک نہیں لگ رہی۔ تم نے کھالیا؟“

”آپ کے بغیر کیسے کھاتی“

”میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

”حاضر ہوں۔“

”تم نے ششیر علی منہ پر تھپڑ مار کر میری سخت توہین کی ہے۔“

”اس نے میرے بدن کو چھوا تھا۔ انوار۔“

”تقص کیلئے۔“ انوار بولا۔

”لیکن انوار! عورت کا بدن صرف اس کا سوہرہ چھو سکتا ہے۔“

”پاکستان میں۔ لیکن یہاں کی ریت دوسری ہے۔“

”ہم پاکستانی ہیں انوار۔“ وہ بولی۔

”ٹھیک ہے لیکن اب ہم یہاں کے پتھر میں سانس لے رہے ہیں۔ یہاں کا کھار ہے

تری یادوں کے گلاب

ہیں۔ کسی کے گھر میں رہ کر اس کے اصولوں سے بغاوت نہ پاسی ہے۔  
 ”ممکن ہے لیکن یہ میری رگ و پے میں کمی ہوئی ہے۔ میں اسے نظر انداز نہیں کر سکتی۔  
 اس نے جواب دیا۔

”خواہ میرے دوست مجھ پر نہیں؟“

”میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں جن لوگوں کو تم دوست کہتے ہو۔ وہ اچھے انسان نہیں ہیں۔“

”فاخرہ! یہ میرے بہت پرانے ساتھی ہیں۔ تم نے ڈیڑھ ماہ میں انہیں پہچان لیا۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ میں نے انہیں عورت کی آنکھ سے دیکھا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی شریف  
 انسان نہیں۔“

”میں بھی انہی میں شے ہوں محترمہ! آپ کو اپنے اندر تہذیبیاں پیدا کرتی ہوں گی۔ آپ  
 اسے براہم سمجھ سکتی ہیں۔ چاہئے کھانا لے آئیے۔“ انوار نے کہا۔

وہ اٹھ گئی۔ اس نے سوچا تھا کہ انوار سے بہت سی شکایتیں کرے گی۔ اس سے باز پرس  
 کرے گی کہ اس نے شراب کیوں پی۔ لیکن انوار کی گفتگو سے اس نے اندازہ لگا لیا کہ انوار اس  
 سلسلے میں قائل نہیں ہوگا۔

کھانا کھانے کے بعد انوار چلا گیا اور وہ بہت سے فیصلے کرتی رہی۔ آخری فیصلہ اس نے یہ  
 کیا کہ تھوڑی سی پلک پیدا کر کے پیار سے انوار کو رونا راست پر لانے کی کوشش کرے گی۔ خود بھی  
 اس کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ رات کو انوار واپس آیا تو اس کی کیفیت بھی بدلی ہوئی تھی۔

”یہ خط آیا ہے تمہارا۔ کل تم بھی خط لکھ دو اپنے گھر۔ میری بہت سی شکایتیں لکھ دینا۔“ اس  
 نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”خدا نہ کرے۔ مجھے اگر آپ سے کوئی شکایت ہوگی تو وہ میرے اور آپ کے درمیان  
 رہے گی۔“ اس نے کہا۔

افتخار احمد کا خط آیا تھا۔ جس میں لاتعداد دعائیں تھیں۔ اس کی جہائی کے آنسو تھے۔ لیکن یہ  
 تحریر ابوی نہیں تھی۔ انیلا اور نائلہ کی بھی نہیں تھی۔ وہ ان تینوں کی تحریر پہچانتی تھی۔ بہر حال یہ کوئی  
 قابل توجہ بات نہیں تھی۔ اس نے دوسرے دن جواب لکھ کر انوار کو دے دیا۔ انوار نے کہا۔ کہ وہ  
 اس خط کو پوسٹ کر دے گا۔ لیکن انوار کے ذہن میں نہانہ کیا تھا۔ گھر سے باہر آ کر اس نے الفاظ  
 کھول لیا اور خط پڑھنے لگا۔ خط میں اس حسین زندگی کی روداد تھی۔ جو وہ وہاں گزار رہی تھی۔ اپنی

تری یادوں کے گلاب

دنوں کے تذکرے تھے۔ انوار کی تقریبیں تھیں لیکن انوار نے وہ خط پوسٹ نہیں کیا۔ اس نے اس  
 خبر کو اپنے ہاتھ سے لکھا۔ اور اس میں کچھ جملوں کا اضافہ کر دیا۔ نائلہ اور انیلا کیلئے کچھ تحائف بھیجنا  
 پڑا تھا۔ لیکن اس میں مشکلات ہیں۔ اس لیے یہ ڈرافٹ بھیج رہی ہوں۔ انہیں اس کی پسند کی  
 چیزیں اس رقم سے دلوا دیں۔ فاخرہ نے اس غلطی کا پتہ بھی لکھا تھا۔ جسے انوار نے بدل دیا اور پھر  
 ادا پوسٹ کر دیا۔

وقت گزرتا رہا۔ کافی دنوں تک کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ سوائے اس کے کہ  
 انوار نے اب کبھی کبھار گھر میں شراب کا استعمال شروع کر دیا تھا۔ ایک بار جب فاخرہ نے  
 اعتراض کیا تو وہ ہنس کر بولا۔ ”اس سے وہی لوگ نفرت کرتے ہیں جنہوں نے کبھی اسے  
 استعمال نہیں کیا۔ تم اسے ایک بار پچھ لو۔ اس کے بعد جو تم کو بھی منظور ہوگا۔“ اور فاخرہ کانوں  
 کو ہاتھ لگا کر رہ گئی۔

پاکستان سے افتخار احمد صاحب کے خط آتے رہتے تھے۔ ایک بار بھی انہوں نے یہ نہیں لکھا  
 تھا کہ فاخرہ پاکستان آنے کی کوشش کرے۔ فاخرہ بھی ہر خط کا جواب دیتی تھی۔ لیکن یہ خط اصل نہ  
 ہوتے تھے۔ انوار پاکستان سے آنے والے ہر خط کا مضمون بدل دیتا تھا۔ اور فاخرہ کے جو خط  
 پاکستان جاتے تھے۔ ان کی تحریر بھی انوار کی ہوتی تھی۔ ان تحریروں کے ساتھ کبھی کبھی کچھ قومات  
 کے ڈرافٹ بھی ہوتے تھے۔ انوار کی مصروفیات کی داستان ہوتی تھیں۔ اپنی حسین زندگی کی کہانی  
 ہوتی تھی۔ لندن کے قصبے ہوتے تھے وغیرہ وغیرہ۔

پھر ایک دن انوار نے کہا کہ وہ دو تین دن کیلئے دوسرے ملک جا رہا ہے کچھ کام سے۔ اکبر  
 علی سے کہہ دیا ہے کہ وہ گھر کا خیال رکھیں۔ تم بھی ان سے تعاون کرنا کوئی جہالت نہ ہونے پائے۔  
 ”علی اکبر صاحب کی کیا ضرورت ہے۔ تم میری طرف سے بے فکر رہو انوار! میں یہ وقت  
 گزار لوں گی۔“

انوار بری طرح چڑ گیا۔ ”فاخرہ! میری کسی بات سے اختلاف کے یہ آخری الفاظ ہونے  
 چاہئیں۔ اس کے بعد کوئی اختلافی بات کہی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“ اس نے غرائی ہوئی آواز  
 میں کہا۔ اور غصے میں پاؤں پٹختا ہوا باہر چلا گیا۔ اس نے کپڑے وغیرہ بھی نہیں لئے تھے۔  
 رات ہو گئی لیکن وہ واپس نہ آیا۔ ہاں نوبے تک بیٹی تو اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔  
 اس کے ذہن میں انوار ہی تھا۔ لیکن اکبر علی صاحب کو کچھ کہہ کر وہ ایک لمحے کیلئے ساکت رہ گئی۔

۔ ہند جوڑے یہ کون سی خاص بات ہے۔ کیوں آپ اس بات کی قائل ہیں۔  
 ”کون سی بات کی.....؟“

”یہ سی کردہوتوں کی ہر چیز اپنی ہوتی ہے۔“ اکبر علی نے کہا اور فس پڑے۔ اس ہنسی میں  
 بیگانیت تھی ان جملوں میں کینگی جیسی ہوتی تھی۔ فارغہ خوف سے کانپنے لگی۔ کئی منٹ وہ ساکت و  
 ہادہ بیٹھی رہی پھر اکبر علی کی آواز ابھری۔ ”تو کیا فیصلہ کیا آپ نے؟“  
 ”کس بارے میں؟“ وہ خواب کے عالم میں بولی۔  
 ”فیوآن چلیں؟“ اکبر علی نے پوچھا۔

اکبر علی صاحب آپ کا دماغ خراب معلوم ہوتا ہے۔ انوار نے آپ جیسے کہنے انسان پر غلط  
 بھروسہ کیا ہے۔ اٹھیے لکل جائے یہاں سے۔ ورنہ میں آپ کا دماغ درست کر دوں گی۔  
 ”ارے آپ تو برامان نہیں۔ میری تو خواہش تھی کہ آپ.....“ جب کی بات ہے۔ اسے  
 عرصے میں آپ اس ماحول کو نہیں سمجھ سکیں۔ سحر۔ یہ سی زندگی ہے۔ اس زندگی سے لطف  
 اٹھائیے۔ جس طرح آپ کا شوہر اٹھا رہا ہے۔ آپ کیا سمجھتی ہیں وہ فرانس میں ہے۔ یا کسی  
 دوسرے ملک گیا ہے۔ آئیے میں دکھاؤں آپ کو کہ وہ کہاں ہے؟“  
 ”کہاں ہے انوار؟“ فارغہ نے پوچھا۔

”نیکو کے قلیف پر۔“ انھوں اس کی دوست ہے اور میں انوار کی اجازت سے یہاں آیا  
 ہوں۔ سمجھیں آپ۔ آپ کے انوار نے مجھ جیسے کہنے انسان پر بھروسہ کر کے کوئی احسان نہیں کیا مجھ  
 پر۔ بلکہ میں آپ کی مدد میں اسے ایک لاکھ روپے دے چکا ہوں۔ تقریباً اتنی ہی رقم اس نے شمشیر  
 سے وصول کی ہے اور اب وہ آپ کے تیسرے سوے کی فکر میں ہے۔ کجنت ہمیشہ ہی ایڈوائس  
 سوارے کرتا ہے۔ چنانچہ اسی وقت آپ کو میرے احکامات پر عمل کرنا ہوگا۔“

فارغہ کے کانوں میں جھٹلا ہوا سیرا تر رہا تھا۔ اس کے پورے وجود میں آگ سبک اٹھی  
 تھی۔ اس کی سوانیت خاکستر ہو گئی تھی۔ مجازی خدا کا بت پاش پاش ہو گیا تھا۔ چاروں طرف اس  
 کے کانوں میں بھیا تک قہقہے ابل رہے تھے۔ اسی طوفانی کیفیت میں وہ اٹھی اور دروازے سے باہر  
 نکل گئی۔ لیکن جس جا کر اس نے میزی کاٹنے والی لمبی چھری اٹھائی اور باہر نکل آئی۔ لیکن جس امداد  
 سے وہ باہر گئی تھی۔ اس سے اکبر علی کا ماتھا ٹھکا تھا۔ اور وہ بھی اس کے پیچھے باہر نکل آئے تھے۔ اور  
 جب انہوں نے اس کے ہاتھوں میں چھری دیکھی تو بے اختیار ان کے حلق سے ایک آواز نکل گئی۔

”ہیلو بھائی۔“ اکبر علی نے کہا اور اندر گھس آیا۔ ان کے لباس سے خوشبو نہیں اٹھ رہی تھی  
 وہ دروازے کے پاس سے ہٹ گئی۔

”کیا ہو رہا ہے؟ سحر۔“ اکبر علی ڈرائنگ روم کی طرف چلتے ہوئے بولے۔  
 اس نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ انوار کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے  
 تھے۔ ”تم بھی ان سے تعداد کرنا کوئی جہالت نہ ہونے پائے۔ میری بات کے اختلاف کے یہ  
 آخری الفاظ ہونے چاہئیں۔“ وہ سکتے کے عالم میں تھی۔ اکبر علی کے ساتھ ساتھ وہ ڈرائنگ روم  
 میں چلی آئی۔ اکبر علی اسے اپنے باپ کا گھر سمجھ کر آرام سے بیٹھ گئے۔

”کھانا تو کھا لیا ہوگا آپ نے؟“  
 ”جی ہاں۔“ اس نے ہنسنے کہا۔  
 ”تو پھر تیار ہو جائیں۔“ اکبر علی صاحب بولے۔  
 ”کیا مطلب؟“

”آئیے آپ کو لندن کی اصل رہنمائیاں دکھائیں۔“ فیوآن میں گئی ہیں کبھی آپ میرا خیال  
 ہے نہ گئی ہوں گی۔ وہاں کی ایک رات ہی انوار کی ایک صفحے کی آمدنی کے برابر ہوتی ہے۔ آئیے ہم  
 آپ کو وہاں لے چلیں۔“

”وہ کس خوشی میں۔ اکبر علی صاحب!“ وہ طعنیہ انداز میں بولی۔  
 ”آپ کی رفاقت کی خوشی میں۔“ اکبر علی نے اسے بھونکی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ”آپ کسی کام سے آئے ہیں اکبر صاحب!“  
 ”ہاں بھئی۔ ہمیں آپ کا دل بھلانے کی ذمہ داری دی گئی ہے بتائیے کیا کریں آپ  
 کے لئے۔“

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ انوار کہاں گئے؟“  
 ”بھروس۔“  
 ”لیکن گھر سے تو انہوں نے کوئی سامان نہیں لیا۔“  
 ”آپ نے ہراسہ کر دیا ہوگا۔“  
 ”لیکن اس طرح.....؟“

”بھئی اس کے بہت سے دوست ہیں دوستوں کی ہر چیز اپنی ہوتی ہے۔ لے گیا ہوگا کہیں



انہوں نے اس طرح باہر جانے والے راستے کی طرف چلا جگ لگائی کہ گرتے گرتے پہنچے۔ لیکن کسی نہ کسی طرح وہ دروازے سے باہر نکل گئے۔

فاخرہ نے بھوکے شیرینی کی طرح دروازے تک ان کا پیچھا کیا تھا۔ لیکن وہ دروازے سے باہر نہیں نکلی تھی۔ اس کے سارے بدن میں قہر قرار تھا۔ وہ خود کو بھیڑیوں کے گھیرے میں محسوس کر رہی تھی۔ تنہا جان اور چاروں طرف بھیڑیوں کے قہقہے۔ جن کی صورتیں تو انسانی تھیں لیکن فطرت بھیڑیوں کی ہی تھی۔ انہی میں اسے انوار بھی نظر آ رہا تھا۔

دیر تک وہ غصے سے لرزتی رہی اور پھر اپنی بے بسی کا خیال آیا تو اس کی آنکھیں برسے لگیں۔ ایسی بلک بلک کر روتی کہ درد و غم ہمارے پکھل گئے۔ "ہائے ابھی آپ نے باپ ہونے کا حق نہیں نبھایا۔ آپ نے اس بوجھ کو جنم میں جھونک دیا۔ ایسا تو کوئی نہیں کرتا۔ کچھ تو معلوم کرتے ہیں لوگ اس کے بارے میں منہ بنی دیتے ہیں۔ یوں تو میں پکھل جاتے کسی کی شان دیکھ کر۔ اپنی بھی تو ایک آن ہوتی ہے۔ ہائے ابھی۔"

نہ جانے کب تک وہ روتی رہی۔ رونے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ دل کا بوجھ ہلکا ہوا تو اس نے دوسرے انداز میں سوچا۔ ممکن ہے وہ کبھی صفت انسان جھوٹ بول رہا ہو۔ لیکن ہے اس نے انوار کے خلاف یوں ذہر مارا کہ اسے انوار سے ہانپی کرنا چاہتا ہوتا کہ اپنے مذموم ارادوں میں کامیابی حاصل کر سکے۔ اور اس بات کا امکان تو ہے۔ کیا انوار ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا اس کی شخصیت اتنی کمزور ہو سکتی ہے؟ چل کے کام لیتا چاہئے۔ انوار کی حقیقت معلوم کرنا چاہئے۔ وہ سوچ رہا تھا ذلیل تو نہیں ہو سکتا۔ اس خیال سے دل کو کچھ حادس ہوئی تھی۔

ساری رات جاتے گزر گئی۔ دل میں ہنگاموں کی خیالات تھے۔ بڑبڑوں دوسرے تھے۔ انوار کی شخصیت کے چند روپ سامنے آ چکے تھے۔ گرین قہجے کی وہ رات جس میں اس نے شمشیری پر قبضہ کر کوئی توجہ نہیں دی تھی اور ایک غیر لڑکی کی ہانپوں میں رہا تھا اور اس نے شراب بھی پی لی تھی۔ اور پھر ۶ نکلا۔ ۶ نکلا سے تو وہ بہت بے تکلف تھا۔ سہانگ رات کی وہ صبح جب اسٹینا چائے لے کر آئی تھی اور انوار نے اس کا کوئی احساس نہیں کیا تھا۔ یہ باتیں۔ امید کے اس کچے دھماکے کو بھی تو زری تھیں۔ جس کا سرا اس نے ایک منوہم ہی آس پر پکڑ کر رکھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود۔ اس کے باوجود۔

تین دن گزر گئے اور تین دنوں میں وہ خیالات کی سولی پر لگی رہی تھی۔ انوار اگر لندن

میں ہی تھا۔ تو کیا اکبر علی نے اس سے ملاقات نہیں کی ہوگی۔ اسے تفصیل نہیں بتائی ہوگی۔ وہ اس تفصیل کو سن کر یہاں ضرور آتا۔ مجھ سے باز پرس کرنے غصے کا اظہار کرنے خدا کرے یہ سب جھوٹ ہو۔ اس طرح ہی انوار کی آنکھیں کھل جائیں۔

ان تین دنوں میں اس نے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ بھوک اڑ گئی تھی۔ بس جب زیادہ حالت خراب ہونے لگتی تو چائے بنا کر پی لیتی۔ چوتھے دن صبح پانچ بجے کسی نے تیل بجائی۔ اس نے دروازہ کھولا تو انوار کھڑا تھا۔ وہی سوٹ پہنے ہوا تھا۔ جو وہ گھر سے پہن کر گیا تھا، جواب دیا گیا ہو گیا تھا۔ اس کے کاندر سے پراہیک انیر لائن کا بیک لٹکا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ سکر پایا۔

"ہلو انوار لنگ کیا حال بنایا ہوا ہے۔ یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" اس کی مسکراہٹ عکس گئی اس نے بیک ایک طرف رخ دیا۔ نور آگے بڑھ کر اس نے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ "فاخرہ انوار لنگ کیا ہوا تمہیں؟" وہ۔۔۔۔۔ خدا کی پناہ کہیں اس دن کا قصہ تو نہیں چل رہا ابھی تک؟

فاخرہ کا کچی چاہتا تھا کہ انوار سے لپٹ کر اتار دے کہ اندھی ہو جائے۔ لیکن اس نے ضبط کیا۔ اگر یہی انسان ہے جس کی تصویر پیش کی گئی ہے تو اس سے زیادہ قابل نفرت اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اور کسی قابل نفرت انسان سے بھی لپٹ کر رو بھی انسان کی تو ہیں ہے۔ اس لیے اس نے خود کو سنبھالا۔

"کہاں سے آ رہے ہو۔ انوار؟" اس نے سر دھجے میں کہا۔

"بھری سے۔ کیا تھکس ڈیر کل ہی آ جاتا۔ لیکن کام ختم نہیں ہوا تھا۔ لڑائی بھڑائی اپنی جگہ لیکن تم سے دور رہنے کو کس کا دل چاہتا ہے۔ اور۔۔۔" وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر آگے بڑھا۔ "تو جناب! جب تک ہم فصل کریں۔ ہمارے لیے مودہی کافی تیار ہو جائے۔ غلے کی سرکار؟" اس نے پوچھا۔

"میں لاتی ہوں۔" وہ دستور سر دھجے میں بولی۔

انوار مسکرا ہوا تھا جسٹل خانے کی طرف بڑھ گیا۔ لیکن کی طرف جاتے ہوئے وہ بیک اپنے ساتھ لے گئی تھی اور پھر کافی کیلئے پانی رکھ کر اس نے پھرتی سے بیک کھولا۔ جیلری کے چند بکس۔ ایک خوبصورت سا زمی اور اس انیر لائن کا ایک استعمال شدہ گٹ جس کا یہ بیک تھا۔

جیلری کے بکس اس نے کھول کر نہیں دیکھے۔ برقی رفتار سے بیک بند کر کے چلی اور اسے اسی جگہ رکھ دیا جہاں سے اٹھا یا تھا۔ جسٹل خانے سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ اور اس کے

تری یادوں کے گلاب

ساتھی انوار کے تنگنائے کی۔ وہ کس قدر مطمئن ہے۔ اگر اکبر علی سے اس کی ملاقات ہوگئی ہوتی تو وہ اتنا خوش نظر نہ آتا۔ اور پھر یہ کس۔۔۔ یہ بیک؟

اس کے کانوں میں چاندی کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ کینٹ اکبر علی نے جھوٹ بولا تھا۔ اپنی مطلب برداری کے لیے اسے یہ اذیت ناک دھوکا دیا تھا۔ جھوٹ ہو خدا کرے یہ سب جھوٹ ہو۔ اس نے جلدی جلدی کافی بیانی۔ اور فرانی دھکیلتی ہوئی اندر لے آئی۔ انوار تولیہ کے گاؤں میں پلٹا ایک کمری پر بیٹھا ہوا تھا۔

”بہت بہت شکریہ۔“ اس نے بیانی لیتے ہوئے کہا۔ ”پھر اس کے چند گھنٹوں لے کر بولا۔  
بھئی بس اب لڑائی ختم ہو جانی چاہئے۔ یوں بھی کسی مسلمان کو تین دن سے زیادہ دل میں کینٹ نہیں رکھنا چاہئے۔“

”آپ کہاں گئے تھے انوار؟“ اس نے پھر دی سوال کیا۔

”کم از کم یہ بات جہیں معلوم ہے۔“

”اس بے سروسامانی کے عالم میں؟“

”ہاں۔۔۔ بعد میں افسوس ہوا۔ رات کے پہنچنے کے پکڑے بھی نہیں تھے۔ میں نے خود سے کہا۔ انوار صاحب تم کو یہ سزا ملنی ہی چاہئے۔ بس میں نے تمہاری طرف سے سزا دے دی۔“  
اس نے کہا اور پھر بیانی رکھ کر دور دکھا ہوا بیک اٹھا لیا۔ اسے کھول کر چھوڑی یا کس نکال لیے۔  
”حضور کی خدمت میں یہ چند چیزیں۔“ اس نے کب کھول دیے۔ بے انتہا خوبصورت سیٹ تھے جن سے آنکھوں میں چمکا چوند ہو رہی تھی۔

”بھئی لاخروہ اب ٹھیک ہو جاؤ۔ یاد مرہ نہیں آ رہا ہے۔“

”انوار میں آپ سے چند باتیں کرنا چاہتی ہوں۔“ لاخروہ نے بدستور سنجیدگی سے کہا۔

”اتنی سنجیدگی اور اتنے خشنہ لہجے میں کوئی بات نہیں سنوں گا۔“

”انوار براؤ کم میرے وجود میں کھوجن ہو رہی ہے۔ تم اکبر علی سے کیا کہہ کر گئے تھے؟“

”تمہارے بارے میں؟“

”ہاں۔“

”بھئی میں اس سے کہہ گیا تھا کہ میرے جانے کے بعد ڈرامہ گر کا خیال رکھنا۔ جہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو فراہم کر دے۔“

”اور۔“

تری یادوں کے گلاب

”بس اور کیا؟“

”اسی رات اکبر علی آیا تھا اور تمہارے دوست نے بڑے عجیب انکشافات کیے۔“ لاخروہ نے اسے پوری تفصیل بتادی اور انوار کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

وہ خاموشی سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ لاخروہ چند ساعت کیلئے حیران رہ گئی۔

پھر وہ خود دوسرے کمرے میں پہنچ گئی۔ انوار کپڑے ہمکن رہا تھا۔ ”کہاں جا رہے ہو انوار؟“ اس نے پوچھا۔ لیکن انوار نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لباس پہن کر اس نے ایک الماری کھولی۔ اور پھر

اس خفیہ دراز سے ایک پستول نکال کر اس کا جیب پر بھرنے لگا۔ لاخروہ کو یہ بات پہلی بار معلوم ہوئی تھی

کہ انوار کے پاس پستول بھی ہے۔ لیکن وہ انوار کی عکسین خاموشی سے غور فرما رہی تھی۔

”میں اس وقت جہیں کہیں نہیں جانے دوں گی انوار۔“ وہ اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

”میں اس کیسے کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس نے میری دوستی کا مذاق اڑایا ہے۔ اس نے

میرے ساتھ کا خون کیا ہے۔“ انوار غرایا۔

”نہیں۔۔۔ انوار تمہیں میری قسم پستول رکھ دو اور لعنت بھیجو اس بد بخت پر۔ تمہاری آنکھیں

کھل جائیں۔ یہی کافی ہے۔ خدا کی قسم انوار مجھے سارے جہان کی دولت مل گئی۔ مجھے کسی سے انتقام

نہیں لینا۔ میں نے اپنی حفاظت کی ہے۔ خدا نے میری حفاظت کی ہے۔ بس ہمیں اور کچھ نہیں

چاہئے۔ ہم غیر ملک میں ہیں۔ یہاں تمہارے علاوہ میرا کون ہے۔ خدا غواست۔ خدا غواست۔ تمہیں کچھ ہو گیا۔“

”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا لاخروہ کہ وہ میری شخصیت کو اس طرح مسخ کرنے کی کوشش

کرے گا۔“

”جانے دو اس کینٹ بزدل کو۔ میرے ہاتھ میں چھری دیکھ کر ہی حواس خراب ہو گئے

تھے اس کے۔“ اس نے انوار کے ہاتھ سے پستول لے کر رکھ دیا۔ اسے اس کمرے سے نکال

لائی۔ اس کے سارے وجود پر سرت بھری کپکپاہٹ طاری تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ اس

کے قبا بے سہارا بدن کو کسی مضبوط ستون کا سہارا مل گیا ہو۔ ہاں شوہر سے زیادہ مضبوط ستون

اور کون سا ہو سکتا ہے۔

بڑی مشکل سے اس نے انوار کا غصہ ٹھنڈا کیا۔ باتیں ہوتی رہیں۔ انوار نے اس سے وعدہ

کیا کہ وہ اپنے سارے دوستوں کو چھوڑ دے گا۔ اب ان سے کوئی رابطہ نہیں رکھے گا۔ اور وہ نہال

تری یادوں کے گلاب

ہوئی۔ وہ پہر کو اس نے خود ہی سیر کا پروگرام بنایا اور انوار کی خوشی کیلئے شام کی سیر پر جاتے ہوئے اس کی پسند کا نیم عریاں لباس پہنا جو اسے خود پسند نہیں تھا اور جسے ہاکیں کر اسے شرم آتی تھی لیکن انوار خوش ہو گیا تھا۔

وہ گھومتے رہے۔ رات کو ایک ریستوران میں کھانا کھایا۔ اور پھر انوار اسے لے کر چل پڑا۔ وہ ابھی لندن کی سڑکوں اور راستوں سے ناواقف تھی۔ اس لیے اسے اندازہ بھی نہ ہوا کہ انوار اسے کہاں لے جا رہا ہے۔ کار جب ایک خوبصورت جنگلے میں داخل ہوئی تو اس نے بوٹمی پوچھ لیا "یہ کون سی جگہ ہے انوار؟"

"بہت سے لوگ اسے جنت کہتے ہیں اور کچھ بے وقوف دوزخ۔" انوار نے عجیب سا جواب دیا۔

اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ کار سے اتر کر وہ دونوں اندر داخل ہو گئے۔ ایک بڑے سے ہال میں بار بنا ہوا تھا۔ دو جوڑے صوفوں پر بیٹھے بیٹھے تھے۔ بار کے پیچھے بیٹھا ہوا شخص انوار کو دیکھ کر سنبھل گیا۔

"میزم کمرہ دلیں کہاں ہیں؟" انوار نے پوچھا۔

"اوپری منزل پر جناب۔" اس نے ادب سے جواب دیا۔

انوار اسے ساتھ لیے ہوئے ہال کے ایک سمت بنے ہوئے۔ زینے کی طرف بڑھ گیا۔ زینے پر بیچے ہوئے قالین پر چلتے ہوئے۔ بالآخر وہ عمارت کی اوپری منزل کے ایک کمرے میں داخل ہو گئے۔ کمرہ کیا تھا۔ اچھا خانہ اہل تھا۔ جس کے درمیان ایک دستا درمیش میز کے پیچھے ایک موٹی سی عورت موجود تھی۔ میز کے سامنے کرسیاں پڑی تھیں۔ انوار کے قدموں کی چاپ پر اس عورت نے گردن اٹھائی۔ اور پھر سسکا کر بولی۔

"اوہ..... انوار ڈائیر۔" اور فاخرہ کو دیکھ کر اس نے اسی انداز میں "اوہ۔" کہا تھا۔ "بیٹھو۔ تم دونوں بیٹھو۔" اس نے کرسی کی پشت سے لگتے ہوئے کہا۔ انوار بیٹھ گیا۔ فاخرہ اس عورت کی قومیت کا اندازہ نہیں لگا سکی تھی۔ ویسے وہ مقامی نہیں تھی۔

"تو یہ ہیں وہ جنہاں کے آج کل چرے پے ہیں؟"

"ہاں۔ یہی ہے۔" انوار سرد لہجے میں بولا۔

"گو یا تم پر ایٹھویٹ طور پر کامیاب نہیں ہو سکے۔"

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

تری یادوں کے گلاب

"ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔ دراصل میں خطرات سول لینے کا عادی نہیں ہوں اور میرے ملک کی لڑکیاں شان و شوہر سے سیدھی نکلتی ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ پرواہ مت کرو۔ کیش کیا ہے؟" عورت نے پوچھا۔

انوار نے جواب میں کچھ کہا۔ فاخرہ اب انگریزی کافی اچھی طرح بولنے لگنے لگی تھی۔ اسے یہ لگتا تھا کہ انوار کا لہجہ بہت عجیب لگ رہا تھا۔ عورت نے مقامی کرنسی کی دس چندہ گنڈیاں نکال کر انوار کو دیں اور انوار نے انہیں جیب میں ٹھوس لیا۔

"انوار..... انوار..... یہ سب کیا ہے؟" فاخرہ نے بے چین ہو کر سوال کیا۔

"تمہارے ہم تعاون کا صلہ۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ میرے سے اختلاف کے آخری الفاظ بولنے چاہئیں۔ اور میں نے یہ بھی کہا تھا کہ اکبر علی سے تعاون کرنا۔ اکبر علی نے جو کچھ کہا تھا۔ وہ سب ٹھیک تھا اور اب میڈم کیرو دلیں تمہاری مالکہ ہیں۔" انوار نے کہا اور زمین ایک دم پلٹ پڑی آسمان نیچے گر اور وہ زمین اور آسمان کے گرد و لٹ پلٹ ہوئے گی۔ اس کے منہ سے اوسے۔ اوسے کی آواز میں نکل رہی تھیں۔ اور اس کے دونوں ہاتھ کسی غیر مرئی شے کو پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر اس کی آنکھوں سے روشنیاں غائب ہو گئیں۔ اور زمین کو مکون مل گیا۔

بوش آیا تو ہسپتال میں تھی۔ ہسپتال کا کوئی وارڈ ہی تھا۔ لیکن سرینا میں بڑی فیشن اہیل تھیں۔ میک اپ میں تھوڑی سی ہوتی۔ بستروں کی پوری لائن تھی اور سامنے چھوٹا سا ایک دروازہ نظر آ رہا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح ان کی حرکتیں دیکھتی رہی۔ وہ ہنس رہی تھیں۔ قہقہے لگا رہی تھیں۔ ایک دوسرے سے جھلس کر رہی تھیں۔ تب وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"اوہ..... دس نمبر بوش میں آگئی۔" کسی نے کہا۔

دوب بھر اہل کر اس کے گرد جمع ہو گئیں۔ "بیٹو۔ کبھی طبیعت ہے۔ کیسے حراں ہیں۔ ان کی آوازیں بھر رہی تھیں لیکن ان میں تسخیر تھا۔ کوئی بھڑکی نہیں تھی۔

"آپ لوگ..... آپ لوگ کون ہیں؟ کوئی جگہ ہے یہ؟" اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"رنگین محل۔ قصر مردیں، قصر غنیم....." آوازیں ابھریں اور قہقہے پھیلنے لگے۔ وہ

خوخرہ ہو گئی۔



تری یادوں کے گلاب

”کیا یہ پاگل خانہ ہے؟ کیا اسے پاگل سریناؤں کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ لیکن کیوں؟ کیوں؟ وہ گزرے ہوئے واقعات پر غور کرنے لگی۔ اور اس کے چہرے کی سراسیمگی بڑھتی گئی۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور دو سیاہ فام اندر ٹھس آئے۔ یہ افریقی تھے۔ انہیں دیکھ کر لڑکیاں پھر کائی کی طرح چھٹ گئیں۔

”بہت شور ہو رہا ہے۔ کیا بات ہے؟“ سیاہ فاموں میں سے ایک نے کشت لہجے میں کہا۔ کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سب چپ تھیں۔ ”اب کوئی آواز نہ ابھرے سمجھیں تم لوگ۔“ اسی سیاہ فام نے کہا۔ اور پھر دونوں ان لڑکیوں کو گھورتے ہوئے باہر نکل گئے۔

فاخرہ اس پورے ماحول کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ اسے اندازہ ہوتا جا رہا تھا کہ یہ نہ تو پاگل خانہ ہے اور نہ ہی ہسپتال۔ کوئی اور ہی بات ہے۔ گزرے ہوئے واقعات اس کے ذہن کے پردوں پر ٹپک رہے تھے۔ اور اس کا دل سینے میں پلڑ پلڑ رہا تھا۔

لڑکیاں بد دل سی ہو گئیں تھیں۔ ان میں سے بعض اپنے بستروں پر لیٹ گئیں اور بعض کناٹیں اور رساں دیکھنے لگیں۔ وہ ان سب کو دیکھتی رہی۔ پھر اس کی نگاہ اپنے بائیں سمت پڑی۔ گیارہ نمبر بیڈ پر ایک لڑکی سو رہی تھی۔ یہ شلواری قمیض میں تھی۔ اور چہرے سے پاکستان یا ہندوستان کی باشندہ لگ رہی تھی۔ یہی ایک شکل اسے کسی قدر شائسا محسوس ہوئی۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ سیاہ فاموں کے آنے کے بعد لڑکیاں بالکل خاموش ہو گئیں تھیں۔

کافی وقت گزر چکا تھا۔ شلواری قمیض والی لڑکی جاگ گئی۔ اس نے بستر پر پڑے پڑے اٹھرائی لی۔ یونہی اس کی نگاہ بھی فاخرہ کی طرف اٹھ گئی۔ وہ چند لمبے فاخرہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اسے گھورتی رہی۔ پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”ہیلو۔“ اس نے فاخرہ سے کہا۔

فاخرہ خشک ہنسون پر زبان بھیر کر رہ گئی۔ لڑکی اٹھ کر اس کے بستر پر آگئی۔ نزدیک سے وہ بہت خوبصورت نظر آئی تھی۔ چہرے کا میک اپ بگڑ چکا تھا۔ اس کے باوجود اچھے اچھے بالوں کے نیچاس کی دلکشی نہیں چھٹی تھی۔

”تم اردو اور انگریزیک ہو؟“ لڑکی نے پوچھا۔ فاخرہ نے گردن ہلادی۔ ”پاکستانی ہو؟“ اس بار لڑکی نے اردو میں پوچھا۔

”ہاں۔“ فاخرہ کے سینے میں سے ایک گہری سانس نکل گئی۔ پاکستان کا نام اس کے سینے میں جھپٹ بن گیا تھا۔

تری یادوں کے گلاب

”شاید رات کو آئی ہو۔ جب اس رات کو تین بجے کے قریب آئی تھی۔ تو میں نے تمہیں سوتے ہوئے دیکھا تھا۔“

”حق۔۔۔ تو کیا صبح ہو چکی ہے؟“ فاخرہ نے حیرانی سے پوچھا۔ اس نے وارڈ میں جھک کاتی روشنیوں کو حیرت سے دیکھا اور لڑکی مسکرائے لگی۔

”ہاں۔۔۔ صبح ہو چکی ہے۔ یہاں کا ماحول انسان کے فکے میں ہے۔ روشنیاں بند کر دو، رات ہو جاتی ہے۔ روشنیاں جلا دو صبح ہو جاتی ہے۔ میرے منہ کا حڑہ بے حد خراب ہو رہا ہے۔ ذرا ہاتھ روم ہواؤں۔ اس کے بعد باتیں کریں گے۔“ لڑکی نے کہا اور اس کے پاس سے اٹھ کر ایک سمت چل پڑی اور پھر ایک دروازہ کھول کر غائب ہو گئی۔

صبح ہو گئی ہے۔ گویا میں پوری رات بے ہوش رہی ہوں۔ لیکن الوار۔ اس کے حلق سے سسکی نکلی۔ دل بری طرح بھرا آیا تھا۔ پھٹ پڑنے کے لیے بے چین تھا۔ لیکن یہاں کون تھا۔ آنسو بھی کسی ہمدرد کے سامنے ٹپکتے ہیں۔ تنہائی کا رونا بھی کوئی رونا ہے۔ وہ روئی تو یہ بیدار لڑکیاں سننے لگیں گی۔

شلواری قمیض والی لڑکی تھوڑی دیر کے بعد واپس آگئی اور اس نے فاخرہ سے کہا۔ ”جاؤ ہاتھ روم ہواؤ۔“ بال استوار کیا حالت ہمارکی ہے۔ جاؤ۔۔۔ ابھی ناشتا آنے والا ہے۔ ساتھ ہی ناشتا کریں گے۔“

وہ اٹھ گئی۔ دروازے کی جانب کئی ہاتھ روڑا ایک قطار میں بنے ہوئے تھے۔ شیشے کی طرح بے حد اور شفاف یہاں پر حفظان صحت کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا۔ بال استوار۔ اور پھر باہر نکل گئی۔ اس دوران دوسری لڑکی نے اپنا اور اس کا بستر درست کر لیا تھا۔

”ہینفو۔۔۔“ وہ مسکراتی ہوئی بولی۔ ”کیا نام ہے تمہارا؟“

”جھے کوثر کہتے ہیں سناؤ کوئی درد بھری کہانی۔ تم ان لڑکیوں کو دیکھ رہی ہو۔ ان کے سینوں میں ایک ایک کہانی پوشیدہ ہے۔ لیکن انہوں نے کہانیاں دل کی گہرائیوں میں دفن کر لی ہیں۔ کبھی کبھی یہ کہانیاں ابھرتی ہیں۔ تو ان کی حالت قابل دیدہ ہوتی ہے۔ بن ایسا کبھی کبھی ہوتا ہے۔ یہ مختلف لہجوں اور مختلف ملکوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ لیکن سبھی لی کہانیوں میں یکسانیت ہے۔“ کوثر نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ”تم پچھلی رات میں

”ہاں۔“ اس نے گردن ہلا دی۔

”کون لایا جہیں یہاں؟ پاکستان سے کیسے آئیں؟“

”انوار۔ میرا شوہر۔“ اس نے سسکتے ہوئے کہا اور کوڑا جھل پڑی اس کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں جنون نظر آنے لگا۔ دیر تک وہ مختلف کیفیات کا شکار رہی۔ پھر اس نے تلخ لہجے میں کہا۔

”اب تم اپنی کہانی تم سے سن لو۔ پاکستان کے کسی غریب گھرانے سے تعلق رکھتی ہوگی۔ والدین اپنی اوقات سے کہیں اونچے گھرانے میں تمہاری شادی کے خواہش مند ہوں گے۔ چھوٹے سونے رشتے ان کی نگاہوں کو نہ بھاتے ہوں گے۔ پھر انہیں پتہ چلا کہ ایک لڑکا لندن میں رہتا ہے۔ عمدہ کاروبار ہے۔ اور وہ فوری شادی کر کے لندن واپس جانا چاہتا ہے اور تمہارے والدین نے لندن کا باہم سن کر آنکھیں بند کر لی ہوں گی۔ تم نے کہا ہوگا اپنا دس نہیں چھوڑنا چاہتی ہوں۔ تب تمہارے والدین نے کہا ہوگا کہ وہ تمہارے دشمن تھوڑا سی ہیں۔ تم لندن میں جا کر دراج کرو گی۔

لڑکیاں تو اس شہر بے مثال کے خواب دیکھتی ہیں۔ تمہاری شادی ہو گئی ہوگی اور پھر تمہارے شوہر نے جہیں لندن بلا لیا ہوگا۔ ابتدائی کچھ ماہ بڑے میٹھ و عشرت میں گزرے ہوں گے۔ اور اس کے بعد شیطان بے نقاب ہو گیا ہوگا۔ اس نے جہیں داریو معاش بنانے کی کوشش کی ہوگی اور تم نے شدید مخالفت کی ہوگی جس کے نتیجے میں تم یہاں موجود ہو۔“

فاخرہ کا منہ حیرت سے ہلکا ہوا رہا۔ وہ ہانگوں کی طرح کوڑا بکھرتی رہی۔ پھر اس کے حلق سے پریشانی آواز اٹھی۔ ”جہیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا؟“

”میں نے کہا تھا کہ یہاں سب کی کہانیاں یکساں ہوتی ہیں۔ میں نے جہیں اپنی کہانی سنائی ہے۔ اور تم سے میرا ایک رشتہ اور بھی ہے فاخرہ۔ میں بھی انوار کی بیوی ہوں میرا تعلق لاہور سے ہے۔“

”کوڑا.....“ فاخرہ کے ذہن میں ایک چمکا ہوا۔ ہاں ایک پارٹنر کے عالم میں انوار نے کوڑا کا نام پکارا تھا۔

”تصور انوار کا بھی نہیں تھا۔ قصور ہمارے والدین کا ہے۔ ہم لڑکیاں ان کے اشارے پر

جتی ہیں۔ ہم ان کی عزت و ناموس کی حفاظت کرتی ہیں۔ پھر وہ ہماری ذمہ داری کیوں قبول نہیں کرتے۔ والدین کو اپنے معیار کا خیال رکھنا چاہئے۔ وہ اتنے بلند پرواز کیوں ہو جاتے ہیں۔ ٹھیک ہے معاشرے میں کچھ خرابیاں تھیں لیکن انوار نے حد چالاک ہے۔ اس نے ان کے خط تم تک نہیں پہنچنے دیئے ہوں گے۔ تمہارے خط ان تک گئے ہوں گے۔ ہاں اس نے دونوں کو ایک دوسرے کے خطوط سے محروم رکھا ہوگا۔ لیکن یہ خط اس کی تحریر میں ہے اور اس کی پسند کے ہوں گے۔“

”کوڑا.....“ فاخرہ رونے لگی۔ ”اب کیا ہوگا کوڑا؟“

”کچھ نہیں بی بی..... کچھ بھی نہیں۔ ان ساری لڑکیوں کی طرح قہقہے لگانے ہوں گے۔ ماحول کو بھول جانا ہوگا۔ اپنی کہانی سننے کی قبر میں دفن کرنا ہوگی۔ نت نئے گاؤں کا دل بہانا ہوگا۔ صرف ایک راستہ اور ہے۔ دل چاہے تو خود کشی کر لو۔ اس کے علاوہ کوئی اور ترکیب نہیں ہے۔ یا پھر ان سے انتقام لو جنہوں نے جہیں اس جہنم میں جمونکا ہے۔ انتظار کرو کہ کسی دن تمہارا بھائی یا کوئی عزیز تمہارے پاس گا بک کی حیثیت سے آئے اور تم سارے ہاڑ و مشوے لٹا کر اس کا استقبال کرو۔ اور اس سے کہو کہ وہ پاکستان جا کر تمہارے والدین کو تمہاری خیریت بتا دے۔ ان سے کہے کہ تم بڑے سکون اور اطمینان سے لندن میں ہو۔“ کوڑا زہر پئے انداز میں بول رہی تھی۔

”میں خود بھی فاخرہ میں خود بھی اسی انتظار میں ہوں اور شاید اور یہ دوسری لڑکیاں بھی اسے دیکھو۔ وہ دندلاوتی ہے۔ ایک سکھ لڑکی وہ وہ سلوینا ہے اندویشیا سے تعلق رکھتی ہے۔ سب کی کہانیاں کسی نہ کسی طور ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔ بہت معمولی سا فرق ہے۔ تم جن لوگوں کے درمیان ہو۔ وہ بہت سفاک اور ذہین ہیں ہم جیسی لڑکیوں کو کنٹرول کرنا جانتے ہیں۔ اگر ہم بغاوت کی کوشش کرتے ہیں تو ہمیں تیزاب سے جلا دیا جاتا ہے۔ گڑھے کھود کر اس میں زندہ دفن کر دیا جاتا ہے۔

یہاں سے نڈر اڑکی طوطا نہیں ہے بہت جلد جہیں ان باتوں سے آگاہ کر دیا جائے گا۔“ کوڑا نے درست ہی کہا تھا۔ ایک ہفتے کے ترقیاتی کورس میں فاخرہ کو ان تمام امور سے آگاہ کر دیا گیا۔ اسے یقین دلایا گیا کہ اگر وہ ایک بہترین موت چاہتی ہے تو دوسری بات ہے۔ ورنہ اسے ان کے اشاروں پر چلنا ہوگا۔ اب وہ انوار کو بھول جائے۔ انوار اس کی قیمت سے متاثر نہ ہوگا۔

تری یادوں کے گلاب

کر چکا ہے۔ اور شاید سنے شکار کی تلاش میں پاکستان چلا گیا ہے۔

میڈم کیرولین کی خوبصورت رہائش گاہ کے انتہائی حسین کمرے میں فاخرہ نے جس پہلے گاہک کا استقبال کیا۔ وہ بھی ایک پاکستانی تھا۔ لندن کی مسموم فضاؤں میں حصول تعلیم یا نوکری کیلئے آنے والا نوجوان پاکستانی جو ایک بھاری رقم ادرا کے لندن کے قیام کو یادگار بنانے آیا تھا۔ تا کہ وطن واپس جا کر اپنے دوستوں کو کہانیاں سنائے۔ اس نے مادام سے کسی پاکستانی لڑکی کی فرمائش کی تھی۔

لیکن فاخرہ کے سامنے آکر اس پر سخت طاری ہو گیا۔ وہ ہلکے ہلکے کروڑا اور فاخرہ حیران ہو گئی۔ پیشکش تمام وہ چپ ہوا۔ فاخرہ نے اس سے رونے کی وجہ پوچھی۔

”قدرت مجھے یقین دلانا چاہتی تھی کہ تم میری بہن ہو۔ تم میری بہن صوفیہ کی مشکل ہو۔ میرا نام احسان ہے۔ میری بہن ہو گئی ہے۔“

فاخرہ متاثر ہو گئی تھی۔ احسان نے اسے بہن بتالیا۔ فاخرہ نے اسے اپنی کہانی سنائی تو اس نے کہا۔

”تم بے فکر ہو۔ میں یہاں ملازمت کرتا ہوں۔ بہت کمائی کی ہے میں نے، یہ سب کچھ میں اپنی بہن کی عزت کیلئے لے دوں گا۔ میں تمہیں یہاں سے نکال لوں گا۔ میں روزانہ تمہارے پاس آؤں گا۔ اور پھر ایک دن..... لیکن ہمیں چالاکی سے کام کرنا ہے۔ ہم ان لوگوں کے وطن میں ہیں۔ ان کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔ لیکن بہر حال تم فکر مند نہ ہو۔“

کافی دیر کے بعد احسان چلا گیا لیکن اس نے اپنا قول نبھایا تھا۔ میڈم سے اس نے گھر سے مرام پیدا کر لیے۔ اس نے میڈم کو بھاری رقم ادرا کی۔ اور اسے بتایا کہ یہ لڑکی اسے بہت پسند آتی ہے۔ اس لیے یہ اس کیلئے ریزرو کر لی جائے۔ اس نے درحقیقت اپنی ساری کمائی لے لی۔ اس دوران وہ ضروری تیاریوں میں مصروف رہا۔ اس نے ایک چھوٹے سے کمرے سے فاخرہ کی تصویریں اتاریں۔ پھر بھاری رقم خرچ کر کے جعلی نام سے اس کا پاسپورٹ بنوایا۔ اور آخری پروگرام کے تحت ایک شام میڈم کے پاس پہنچ گیا۔ ایک آوارہ رئیس زادے کی حیثیت سے۔ اس نے میڈم سے فرمائش کہ وہ لڑکی کو باہر لے جانا چاہتا ہے اور وہ محوم پھر کر واپس آ جائیں گے۔ چونکہ اس نے میڈم پر دولت خرچ کی تھی۔ وہ اسے کوئی نواب یا بہت بڑا رئیس سمجھنے لگی تھی۔ اس لیے میڈم نے اس کی بات نہ مانی۔ ہاں اس نے تمام اقسامی تہذیب اختیار کر لی

تری یادوں کے گلاب

تھی۔ اور احسان اس کیلئے سب کچھ کرنے کو تیار تھا۔ اس لیے اس نے اپنی نوکری اپنا مستحق سب کچھ داؤ پر لگ دیا۔ اور اسے لے کر باہر نکل آیا۔ تھوڑی دیر تک وہ ادھر ادھر گھومتا رہا۔ اور پھر مقررہ وقت پر انٹرپورٹ پہنچ گیا۔

پہلی آئی اسے کی پرواز پاکستان کیلئے چل پڑی تھی۔ ایک زندہ لاش اس میں سفر کر رہی تھی۔ ایک داستان عبرت اپنے وجود پر کندہ کیے وہ حالات کے ہاتھوں لٹ گئی تھی لیکن ممکن ہے اس کی کہانی بہت سے لوگوں کیلئے داستان عبرت ہو۔ ان والدین کیلئے بھی جو چھان بین کیے بغیر صرف چند جھوٹے خوابوں میں گم ہو کر اپنی مصوم بچیوں کو اپنی مجبوری کی جینٹ جڑھا دیتے ہیں۔

☆.....☆.....☆



ساتھ کر دیں۔ دوسری بیٹی نعمانہ کو اس کے ماموں نے اپنے بیٹے کے لئے ہانکا تو اس شرط کے ساتھ وہ بھی بیاہی گئیں کہ رضوان کو رخصت ہو کر اس کو بھی میں آنا پڑے گا۔

سب سے چھوٹی بیٹی فرحانہ کیلئے انہیں بڑی پریشانی اٹھانی پڑی۔ وہ اپنی پسند سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ جو ادھر صرف خاندان سے باہر کا تھا بلکہ برادری بھی بالکل الگ تھی جبکہ شہباز صاحب کا اپنی کسی اولاد کو برادری سے باہر بیاہنے کا قلعی کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اب تک چاروں اولادوں کی شادیاں کئے بہن بھائیوں کے گھروں میں کی تھیں۔

فرحانہ ان کی بے حد لاڈلی اولاد تھی اور لاڈلی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بہت خود سر بھی تھی۔ بچپن سے آج تک اس نے اپنے ہر معاملے میں اپنی من مانی کی تھی۔ ان کی خواہش کے برعکس اس نے انجینئرنگ پڑھی تھی۔ اپنے کلاس فیلو جو اد کو ان کے سامنے لاکھڑا کیا تھا۔ چونکہ خاندان میں ان کا ہم پلہ خانداندارت میں اور نہ گھر داماد بننے پر تیار تھا۔ مگر پھر بھی بیٹی کی محبت سے مجبور ہو کر انہیں اس کی شادی کرنا پڑی۔ وہ رخصت ہو کر سرسبز تو گئی۔ مگر سال کے اندر ہی جو اد کو راضی کر کے واپس اپنے پورشن میں آ کر بس گئی۔ جو اد بیوی کے مجبور کرنے پر آ تو گیا تھا مگر آکھڑا کھڑا سا رہتا تھا۔ سب کے ساتھ مکمل نہیں پایا۔ مگر شہباز گیلانی کی ولی آرزو پوری ہو گئی تھی کہ ان کی ساری اولاد اس گھر میں رہے اور ان کی لاڈلی بیٹی ان کی نظروں کے سامنے تھی۔ اس ہی لئے یہ بات ان کے لئے باعث اطمینان تھی۔ مگر دل میں ایک غلط سی رہتی تھی کہ فرحانہ کی خاطر ان کو اپنے اسٹینڈرڈ سے گھر کا ایک چھوٹے خاندان سے رشتہ کرنا پڑا تھا۔

سب لوگ بڑی محبت سے مل کر رہتے تھے اور رشتوں کو مزید مضبوطی دینے کیلئے شہباز گیلانی عرفانہ کے بڑے بیٹے حماد کا نکاح عمران کی بیٹی نازش سے ان کے لڑکپن میں ہی کر دیا تھا۔ ”بچپن میں کئے جانے والے اس نکاح کی فرحانہ نے بہت مخالفت کی تھی۔ والد صاحب اس کی ہر بات استے تھے۔ مگر اس سلسلے میں انہوں نے فرحانہ کی ایک نسی تھی۔ بلکہ اس پر واضح کر دیا تھا کہ یہ قاعدہ ام انہوں نے کیا ہی اس لئے ہے کہ پھر کوئی اور خاندان سے باہر شادی کرنے اور ماں باپ کی محبت سے بے جا فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرے۔

”بابا کا بس ملے تو پالنے میں پڑے بچوں اور آنے والی روحوں کا ابھی ہے نکاح پڑھاؤں۔“

فرحانہ، ماں، اور بہن بھائیوں کے سامنے یہ بڑا بی بی رہتی مگر باپ کو اس کے ارادے سے باز

ہمیں اپنا نہیں..... غم تمہارا ہے

مسافر تو چمکتے ہیں رفاقت کب بدلتی ہے  
محبت زندہ رہتی ہے محبت کب بدلتی ہے  
پرانے رزم کو ارشد بھلا دینا ہی اچھا ہے  
اگر چاہے نہ خود کوئی تو قسمت کب بدلتی ہے  
ارشد ملک

کوٹھی کے لان کی طرف بڑھتے ہوئے حماد نے عمران ماموں کی چٹلی کو ڈھونڈا۔ وہ سامنے ہی نظر آ گئے۔ مگر بہت سے مہمانوں میں گھرے ہوئے۔ حماد نے ذرا ہونڈک کر جائزہ لیا۔ وہاں اس کے لئے کوئی نشست خالی نہیں تھی۔ اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ بہت مہمان آچکے تھے۔ ان میں بہت سے شاسا چرے تھے۔ وہ فرد افراد ایک سے ملنے لگا۔ یہ تقریب دیمز کے بیٹے کے حقیقہ کے سلسلے میں تھی اور وہ ایک طویل عرصے کے بعد خاندان کے دیگر افراد سے مل رہا تھا۔

اس جہازی ساز کی کوٹھی میں ان سب کا بچپن ایک ساتھ گزرا تھا۔ شہباز گیلانی نے اپنی پانچ اولادوں کو ایک ہی جگہ بسانے کے لئے یہ شاندار کوٹھی بنوائی تھی۔ باہر سے ایک محل جیسی نظر آنے والی یہ عمارت اندر ہی اندر چھ حصوں پر مشتمل تھی۔ دو بڑے بیٹے عمران اور عرفان کے بعد تین بیٹیاں تھیں۔ سب سے پہلے بڑی بیٹی عرفانہ بیاہی گئیں۔ جسے شہباز صاحب نے اپنے بچپنے کے ساتھ بیاہا تھا اور شرط یہ تھی کہ خاوند گیلانی اپنا گھر چھوڑ کر اس کوٹھی کے ایک پورشن میں آ کر رہیں گے۔ اس کے بعد دونوں بیٹوں عمران گیلانی اور عرفان گیلانی کی شادیاں اپنی دو بھانجیوں کے



اس کی کرسی پکڑ کر جھک گیا۔

”ماہ نور تم نے میری مہمان کا خیال نہیں رکھا۔“ دوسری سانس میں اس نے ماہ نور کو نوازا۔  
وہ بے کو بلا کر گرم گرم اسکیکس میلا کی پلیٹ میں رکھیں اور قریب سے کرسی اٹھا کر اس کے پاس  
لو کر بیٹھ گیا۔ نازش کو اس نے نرمی طرح نظر انداز کیا تھا۔

نازش جو پہلے ہی میلا کے پروگرام سن کر اندر سے ڈری ہوئی تھی۔ حواد کے رویے کو شدت  
سے محسوس کر رہی تھی۔ پہلی دفعہ نظر اٹھا کر اس نے بغور حواد کا جائزہ لیتا شروع کیا۔ مگر وہ میلا میں  
اس وجہ کو سمجھا کہ اسے اپنے اطراف بیٹھے ہوئے لوگوں کا ہوش ہی نہیں تھا۔ اس کے ہر ہر انداز  
میں اس قدر وارفتگی جھلک رہی تھی۔ آنکھوں میں ایسی والہانہ چمک تھی کہ سارے راز کھول دے  
ہی تھی۔ خود بخود نازش کو ایک عین حقیقت کا ادراک ہوتا چلا گیا۔ اس کو شدت کی پیمائش تھی اور اس  
کے مطلق میں کانٹے جیسے تھے۔ وہ معذرت کر کے اپنی جگہ سے اٹھی اور پھر پلیٹ کر واپس نہ آئی۔

میلا کے چلے جانے کے بعد ماہ نور اسے ڈھونڈتی ہوئی اس کو شے میں پہنچی جہاں وہ پچھلے  
ایک گھنٹے سے بیٹھی ہوئی تھی۔

”تم کہاں مر گئی تھیں؟“ آتے ہی اس نے نازش کے ایک ہاتھ رسید کیا پھر دھپ سے اس  
کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”کیسی گھٹنے اس میں ایسی بڑھائی کی بھائی کے پاس چھوڑ دیا۔ پچھلے پچھلے پر سیر حاصل تبصرہ کر کے  
بہت بے خالی ہو گیا۔“

نازش کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

”ہنسوت بدترین۔“ وہ تپ گئی۔

”تو کیا روکس تمہاری طرح؟“ نازش نے بمشکل ہنسی روکی۔

”تم پاس ہو تھیں تو میرا یہ حال نہ ہوتا۔ تو بے انگریزی بولتے ہوئے میری زبان نیڑھی  
ہوتی۔“ وہ سخت خیر تھی۔

”ضرورت کیا تھی۔ اس کے ساتھ امریکی انداز میں بن کر بولنے کی۔ اس لئے تھک  
میں اور ابھی اپنے دیسی انداز میں انگریزی بولتیں اسے سمجھ میں تو آئی جاتا۔“ نازش نے اپنے  
اہ کو پرسکون نگاہ کرنے کی کوشش کی۔

”آف۔ لگا ہے ہم سے زیادہ اسے ہمارے ملک سے مشت ہے۔“

”وہ کس مقصد سے آئی تھی؟ حواد کا کیا ارادہ تھا؟“ رمیز کے دل میں اندیشوں نے سر  
ابھارا۔ مگر اس نے فوراً ہی اپنا سر جھک کر اپنے اندیشوں کی نفی کی۔

”حواد تو پہلے ہی انگلیز ہے میلا کو بھی پتا ہو گا۔ ایسی دوستیاں تو ملی ہی جاتی ہیں۔“

مہمانوں کو سیر کرنے کے لئے وہ اکیلا رہ گیا۔ حواد تو میلا کو لیکر فوراً ہی اندر چلا گیا تھا۔  
جیسے اب کسی اور مہمان سے اسے کوئی دلچسپی نہ رہی ہو جبکہ اس تقریب کا سیز بان وہی تھا۔ حواد نے  
سب سے پہلے میلا کو نازی گیلانی سے ملوایا۔ اپنے والدین سے متعارف کرانے کے بعد وہ اسے  
لے کر ماہ نور اور نازش کے پاس چلا آیا۔

”ماہ نور ایہ میری مہمان ہے۔ ان کا خاص خیال رکھنا۔“ وہ ماہ نور کو ہدایت کر کے نازش کی  
طرف دیکھے بغیر وہ اپنے دوسرے دوستوں کی طرف بڑھ گیا۔ دونوں نے میلا کو بڑی اچھی کہنی  
دی وہ بھی ان سے مل کر بہت خوش ہوئی۔ نازی صلیب سے وہ بہت مرعوب ہوئی تھی۔ حواد اسے  
بڑے خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ یہاں کو یہاں آ کر پتہ چلا تھا۔

میلا سیر و سیاحت کی ذمہ دار تھی۔ وہ یہاں کے شمالی علاقہ جات کی سیر کرنے آئی تھی۔ جو  
قدرتی حسن کا شاہکار تھے۔

”کیا تم اکیلی جاؤ گی؟“ ماہ نور کے پوچھنے پر وہ بڑی دلکشی سے مسکرائی۔  
”نہیں۔۔۔ حواد ساتھ ہو گا۔“

اس اعلان پر نازش نے بے ساختہ ماہ نور کی طرف دیکھا۔ وہ بھی حجاب ہوئی تھی قسلی کیلئے  
پوچھ لیا۔

”کیا کسی ٹورسٹ پارٹی کے ساتھ جاؤ گے؟“

”نہیں۔ بس ہم دونوں ہوں گے۔“ وہ جیسے خوابوں میں سفر پر نکل گئی۔

”اودہ میں آتی ہے چینی سے انتظار کر رہی ہوں۔ اس وقت کا جب میں حواد کے ساتھ ان  
مہینوں وادیوں میں اڑتی پھر رہی ہوں، کسی تیلی کی طرح۔“

ماہ نور کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ اور نازش کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا تھا۔

کھانا سرد کر دیا گیا۔ وہ تینوں اپنی پلیٹوں میں کھانا لے کر واپس اپنی نشستوں پر آ کر بیٹھ گئی  
تھیں۔ میلا اب ان دونوں کی مصروفیات اور دلچسپیاں کھونج رہی تھی۔

”میلا تم تو تکلف کر رہی ہو۔ تمہاری پلیٹ میں یہ کیا ہے۔ صرف سلاوا۔“ حواد آ کر بیچے



”اسے ہمارے ملک سے نہیں۔ تمہارے بھائی سے عشق ہے۔“

ماہ نور کچھ لمحوں کے لئے شانے میں آگئی۔

”کیا تم نے وہی محسوس کیا جو میں نے محسوس کیا۔“ ماہ نور کی آواز بھیک مٹی تھی۔

”بدقسمتی۔“ نازش نے گہری سانس بھر کر ڈوبتے دل کو سنبھالا۔ ”حماد کا مجھ سے جو رشتہ ہے

وہ خود بخود چھٹی حس پیدا کر دیتا ہے۔ مسایہ بھی ہو درمیان میں تو عورت کو خیر ہو جاتی ہے۔ یہاں تو جیتا جاگتا وجود ہے۔ مجھے خبر کیسے نہ ہوتی۔“

ماہ نور سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ ایک وحشت ناک خاموشی ان کے درمیان چھا گئی۔

☆.....☆.....☆

سورج دھل چکا تھا۔ جب حماد کی گاڑی آہستہ روٹی سے پور ٹیکو میں آ کر رکی۔ گاڑی میں

بیٹھے ہی اس نے دیکھ لیا تھا۔ لان میں اترنے والی مارٹل کی سفید بڑبڑیوں پر نازش اور ماہ نور باتوں

میں مصروف تھیں۔ وہ ان کو نظر انداز کر کے اندر جانا چاہتا تھا کہ ماہ نور نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

”ادھر آئیے بھائی جان!“ حماد کو اندر جاتا دیکھ کر وہ وہیں سے چلائی۔ نازش نے اس کی

طرف پلٹ کر دیکھا بھی نہیں تھا۔ حماد قریب آیا تو ان کے سیک اپ زدہ پھولے ہوئے چہرے

دیکھ کر ہنسا۔

”غیریت۔“

”صبح آپ نے کچھ وعدہ کیا تھا۔ یاد ہے؟“ ماہ نور تجھسی ہوئی۔

”میں نے وعدہ کیا تھا؟“ حماد نے ایک پل کو سوچا۔ ”نہیں تو!“

اس کے کھر جانے پر ماہ نور آہ سے باہر ہوئی۔

”بھائی! آپ نے وعدہ کیا تھا کہ شام کو ہم دونوں کو ٹیکرا ایگزیشن دیکھنے جائیں گے۔“

”اوہ..... ہاں۔“ کہا تو تھا۔ تو پھر؟“ اس نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔

”تو پھر یہ کہ ہم گھنٹے بھر سے آپ کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ آپ نے چھ بجے آنے کو کہا

تھا۔ اب سات بج رہے ہیں۔“

دونوں بہت تک سبک سے تیار ہیں۔ حماد سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے شانے جھٹکے۔

”گھر میں تو ابھی واپس جا رہا ہوں۔ میری اہم میٹنگ ہے۔ بس کپڑے پہنچ کر آنا

تھا۔ ایسا کرتے ہیں کل پر رکھ لیتے ہیں۔“

تری یادوں کے گلاب

”بھائی آج آخری دن ہے۔“ ماہ نور جھک کر بولی۔ نازش اس سارے عرصے میں بالکل

ناموش، بے نیازی سے دوسری طرف دیکھتی رہی تھی۔

”گھر میں اور لوگ بھی تو ہیں۔ میز کے ساتھ چلی جاؤ۔“ حماد نے اسے چکارا۔

”وہ اپنا قیمتی وقت برباد نہیں کرتے ہمارے ساتھ۔ ان کے خیال میں ہم انتہائی فضول

لوگ ہیں۔ بے نیکی کاموں میں وقت ضائع کرنے کی ماہر۔“ وہ جمل جمل کر بولی اور حماد مسکرایا۔

”پھر راجیل سے کہو۔“

”راجیل۔“ ماہ نور نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ”اللہ، اللہ، تو بے ویسے بھی اس سے ہماری

ڑائی ہے۔“

”اس کے خیال میں تم لوگ کیا ہو؟“ حماد نے کہا۔

”مجھ سے زیادہ بد قسمت اور لڑاکا بلیاں۔“ اس نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔

”ارے میری اتنی پیاری بہن کو وہ ایسا بھگتا ہے، نہ صرف بھگتا ہے بلکہ بنا گھبر دہل

کہتا ہے۔“

”فائن۔“ حماد نے سر ہلایا۔ پھر بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔ ”میر تم سے کتنا بڑا ہے؟“

”ہوگا چار پانچ سال بڑا۔ مگر بچہ بنا رہا ہے۔“ ماہ نور نے منہ بنایا۔

”اور تم بھی اس کے لئے ایسی بات کر رہی ہو۔ جیسے تم سے چار پانچ سال چھوٹا ہو۔ وہ تم

سے بڑا ہے۔ اس کا کیا فائدہ کیا کرو۔“ حماد نے اسے سمجھایا تو وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

”اچھا میں میز سے کہہ دیتا ہوں تم لوگوں کو اپنے ساتھ لے جائے۔“ وہ غری سے بولا۔

”آپ کو کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ بھائی۔ ہم کر لیں گے خود ہی اپنے انتظام۔“

نور نے بھڑک کر بہت بڑی نازش کا بازو پکڑا اور اسے صہیت کر اندر لے گئی۔

حماد نے بھی بے نیازی سے شانے جھٹکے۔ اسے میساج کے ساتھ ڈنر پر جانا تھا اور وہ اپنا

پاکرام کینسل نہیں کر سکتا تھا۔

رات گئے جب وہ گھر لوٹا تو لاؤنچ میں ماہ نور سے سامنا ہو گیا۔ وہ جگڑے تجوروں سے

اسے دیکھ کر کھڑا کر گزر جانا چاہتی تھی کہ حماد نے اسے بازو سے گھسٹ کر اپنے ساتھ لگا لیا۔

”کیسی تھی ایگزیشن؟“

”پتہ نہیں۔“ بڑی مشکل سے جواب آیا۔

## تری یادوں کے گلاب

چھٹی کا دن تھا اور حسب معمول صبح سے لاؤنج میں ایک ہنگامہ بچا ہوا تھا۔ کیرم کی بازیابی تک دی گئی تھی۔ ریمز اور راجیل مستقل جیت رہے تھے۔ اور تازش اور ماہ نور بے ایمانی اور من مانی کرنے کے باوجود مستقل ہار چکی تھیں۔ پھر بھی میدان میں ڈٹی ہوئی تھیں۔ ہر بازی اس اعلان کے ساتھ شروع ہوتی کہ اس واقعہ ضرور جیتیں گے۔ مگر شاید آج ان کا ٹھونڈا تھا۔ اس پر ریمز کے بھڑکا رہنے والے جیسے، اب دونوں نمبر نوکر دی گئی تھیں۔

”رمیز کے بچے تم نے میری گوٹ کھسکا لی ہے۔“ نازش نے شور مچایا۔

”الزام نہ لگاؤ۔ خواہ کواہ۔“ رمیز بھی دھاڑا۔ ”دیکھ لو۔ میں تو ہاتھ باندھے بیٹھا ہوں۔“

”آپا.....! جئے معصوم نہیں ہونم۔ گوٹ کھسکا کر ہاتھ باندھ کر بیٹھے گئے۔ کیوتر! واہی رکھو

میری گوٹ اس کی جگہ پر۔“

”تم خود ہوں گی کیو تری، پرکٹی۔“ وہ بھنا گیا۔

”بکومت گوٹ واپس رکھو۔ نازش لڑنے مرنے پر آمادہ تھی۔ گوٹ واپس رکھوا کر دم لیا۔

حساد کو ان کی لڑائیاں دیکھنے میں بڑا سزاوارہا تھا۔ وہ اس وقت نازی ٹیم کے ساتھ بیٹھا تھا۔ مگر اس کا سارا دھیان انہی لوگوں کی طرف تھا۔

”تم بھی ان کے ساتھ کیوں نہیں کھیلتے بیٹا۔“ نازی بیگم نے اس کا اشتیاق دیکھ کر پوچھا۔ وہ دیکھ کر دعویٰ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ان کے ساتھ کبھی نہیں کھیلتا تھا۔

”مجھے تو معاف کریں، طوفانِ میل میرے بس کی نہیں۔“ اس نے جس کراہہ نواری طرف اشارہ کیا۔ وہ اب تک اس سے ناراض تھی۔ اور بات چیت بند تھی۔

لاڑکیوں کی زبانیں جس رفتار سے چل رہی تھیں اسے حیرت ہو رہی تھی۔ میر کو سوا سیر تھیں لڑکے ان کے بارے میں صحیح خیال رکھتے تھے۔ اس وقت تو وہ خود اس بات کا ثبوت دے رہی تھیں کہ تہا کو کونسی بھی آ رہی تھی۔

”ریمز کے بچے اب پوچھ گئے مجھ سے۔“ ہارز نے علق پھاڑا۔

”بچوں تک کیوں پہنچ جاتی ہو؟“ وہ جھٹلایا۔ ”لوگ باپ، دادا تک پہنچتے ہیں۔ یہ اپنی طرف جلتی ہیں، اپنی کموز بڑاں۔“ رمیز نے ایک چیت بھی رسید کر دی۔ گویا عالمی شاست بلوال۔

وہ کرسی دکھل کر کھڑی ہوئی۔ دونوں ہاتھوں میں میز کے بال پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔ اسے وہاں میں ہارے نظر آ گئے۔ رامبل نے بچ بچاؤ کر پایا۔

تری یادوں کے گھاہ

”پتہ نہیں کیا مطلب، آنکھیں بند کر کے گھوم رہی تھیں کیا؟“ اس نے ہانہ نور کے سر پر چپٹ لگائی۔ وہ تنگ کر اس سے الگ ہوئی۔

”بھائی! آپ کو زیادہ خوش حراچی دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آپ سے سخت ناراض ہوں۔“

”ناراضگی کی کیا بات ہے۔ تم کو ایگزیشن دیکھنے جانا تھا۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا اور ساتھ ہی تاکید بھی کی تھی کہ تم کو شک نہ کرے۔“ وہ اسے سماتے ہوئے بولا۔

”ہم کور میز کے ساتھ نہیں جانا تھا۔ اور ہم نہیں گئے۔“

”ارے“ وہ حیرت زدہ ہوا۔

”تم ایگزیشن دیکھنے نہیں گئیں۔“

”نہیں۔“

”کیوں؟ آج تو آخری دن تھا۔“

”کیونکہ ہمیں آپ کے ساتھ جانا تھا۔ آپ کو میرا نہیں تو نازش کا خیال کرنا چاہئے تھا۔“

’اچھی ذرا سی بات پر ہرٹ ہونے کی کیا ضرورت ہے؟‘

یہ ذرا سی بات ہے؟" ماہ نور بھڑکی۔

یہ ذرا سی بات نہیں ہے بھائی۔ آپ نے وعدہ خلافت کی ہے۔“

”اچھا تو اب میں کیا کروں؟“ وہ مجھ پر تھپکایا۔ صاف ہلک رہا تھا۔ نازش کا حوالہ اس کے لئے لراں تھا۔

”کچھ مت کریں۔ آپ کو کیا فرق پڑتا ہے، مگر مجھ سے بات مت کریں۔“ وہ تڑپ کر چلی  
 دھڑ دھڑ سڑھیاں جو صحتی چلی گئی۔

حماد اسے جاتا دیکھتا رہا۔ پہلے تو غصہ آیا اس کے حراج دکھانے پر مگر پھر لمبوں پر ہلکی سی راہت بچھلی یہ سوچ کر کہ اس نے ناراض تو کیا ہے اسے عمر اسے سنا نا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ بھڑک کر تھی۔ اتنی ہی جلدی مان بھی جاتی تھی۔ اور یہ بات پادشہ کی تو اس کی اہمیت نہیں رہی۔ حماد کے نزدیک، پتہ نہیں وہ اس کے نزدیک کبھی اتنی اہم بھی تھی یا نہیں کہ وہ اس کی ناراضگی بردہ اور کرتا۔ اب تو ایسا لگتا تھا وہ اسے جانتا ہی نہ تھا۔

"بس بھی یہ آخری بازی، اب خون خرابے تک نوبت آگئی ہے۔"

دونوں ٹھنڈے ہو گئے، کھیل پھر شروع ہوا۔ جیسے ہی گزک مرحلے میں داخل ہوا اسی حساب سے تھرمی بچا۔ حوادک تجسس بڑھا، اٹھ کر ان لوگوں کے بالکل قریب آ گیا۔

ریمز کی گولٹ پاکٹ ہوتے ہوتے رو گئی۔ ماہور نے ہاتھ نیچے رکھ کر گولٹ واپس اچھال دی۔ یہ آخری گولٹ پاکٹ ہو تھی۔ دونوں لڑ پڑے۔ وہ اپنی غلطی ماننے کو کسی طور پر تیار نہ تھی۔

نازش نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ اپنی طرف رگی ہوئی ایک گولٹ پاکٹ میں نپکا دی۔ حوادک نے اسے بے ایمانی کرتے دیکھا۔ مگر اسے اس وقت لڑکیوں سے ہمدردی ہو رہی تھی۔ اس لئے اپنی مسکراہٹ دبایا۔ وہ نازش کی پشت پر ہی کھڑا تھا۔

جھگڑا ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ نازش نے اپنی باری لینے کے لئے اسٹریٹجی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ حوادک سمجھا وہ پھر بے ایمانی کرنے جا رہی ہے۔ اب وہ رو نہیں سکا۔ بلکہ ارادہ جھک کر نازش کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ارے اتنی بے ایمانی۔"

"ڈونٹ ٹی ٹی۔" وہ تڑپ کر چلی۔

"ہاتھ چھوڑیں۔" نازش کا انداز خاصا ہانت آ میر تھا۔

حوادک چہرہ تپ کر سرخ ہوا۔ اس نے جھگڑے سے نازش کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ مگر نازش خاموش نہیں رہی تھی۔

"آپ کون ہوتے ہیں۔ ہمارے کھیل میں دخل دینے والے۔"

"شٹ اپ نازش، تمہیں بات کرنے کی تیز نہیں ہے ان سب نے تمہیں بہت سر پر چڑھایا ہوا ہے۔" اس نے ریمز اور رائل کی طرف اشارہ کیا۔

"انہی کے سر پر چڑھ کر ناچو میرے ساتھ اگر آئندہ اس لپے میں بات کی تو میں تمہارا دماغ سمجھ کر اڑوں گا۔"

حوادک آواز نیچی تھی۔ مگر لپے میں انکار سے دھبہ ہے تھے۔

وہ پھر زکا نہیں۔ تیز تیز قدموں سے لاؤنچ سے لٹکا چلا گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد رائل نے سنبھل کر یاد دلایا، کھیل اور واپس آ رہا ہے۔ مگر نازش نے تیزی سے کرسی پیچھے دھکیلی اور ان سب کی طرف دیکھے بغیر میز صیال پھلانگی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

حوادک سے دروازہ بند ہونے کی آواز نیچے تک آئی تھی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے بھی؟" رائل نے تشریش سے ماہور کی طرف دیکھا۔

"جو کچھ ہو رہا ہے لکھ نہیں ہو رہا ہے۔" اس کی آنکھیں پھر آئیں تھیں۔

"نازش نے بد تمیزی کی تھی۔" ریمز نے دخل اندازی کی۔

"اسے اس طرح حوادک سے بات نہیں کرنی چاہئے تھی۔"

"وہ بھائی سے ناراض ہے۔" ماہور نے کمزوری طرف انداز کی۔

"ہمارا منگی اپنی جگہ۔ حوادک اسے اس کا جو رشتہ ہے اس میں ادب اور احترام اپنی جگہ لازم ہے۔ ایسی کیا ناراضگی تھی کہ ہم سب کے سامنے اس نے اس طرح سے بد تمیزی کی۔ حوادک تشریش میں تو آنا ہی تھا۔ ریمز اپنی بات پر قائم رہا۔

"اچھا اب تم جاؤ اس کے پاس دیکھو کیا کر رہی ہے۔" رائل نے ماہور کو اٹھایا۔

"میں نہیں جا رہی۔ مجھے پتہ ہے وہ اس وقت کسی سے بات نہیں کرے گی۔"

"ذرا دیر بعد ہی نازش کپڑے بدل کر دوبارہ نیچے آگئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں گاڑی کی جانی تھی اور وہ ان کے قریب سے سر اٹھائے گزرتی چلی گئی۔ تیز خطرناک تھے۔"

"نازش!" ماہور نے اسے بے اختیار آواز دی۔

"نازش نے پلٹ کر دیکھا بھی نہیں۔ ماہور اس کے پیچھے جانے کو بھی۔ مگر رائل نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھار دیا۔

"مگر پتہ تو چلے جا کہاں رہی ہے؟" وہ پریشان ہو رہی تھی۔

"یو چھو کی تو پنہ کی۔ تمہیں پتہ ہے غصے میں اسے پھیلز جائے تو بالکل آؤٹ ہو جاتی ہے۔ کسی کا لٹا نہیں کرتی۔" رائل نے ہاتھ جھاڑے اور جانے کو اٹھا۔ ماہور اسی طرح منہ لٹکائے بیٹھی رہی۔

"ارے بھی تھوڑی سی ریش ڈرا نیو جگہ کرے گی اپنا غصہ گاڑی پر نکالے گی اور بالکی پھینکی ہو کر آ جائے گی شام تک۔"

"اور اتنی دیر میں جو روشتی رہوں گی کیا کروں!" وہ بے چارگی سے بولی۔

"کراہی ہے۔ جا کر مصلے پر بیٹھو اور اس سر بھری کی خیریت سے دابھی کی دعائیں مانگتی رہو۔" ریمز پر کوئی اثر نہ تھا۔ وہ اسی طرح ان دونوں کو زچ کرتا رہا اور اسی لئے ان دونوں کی ریمز



”باقی کا سارا دن نازش نے اپنی سبکی روٹی کے گھر گزرا“

اور حواد سارا دن میسلا کو ساتھ لئے شہر سے باہر پرغضا مقامات پر تفریح میں مگن رہا۔ شام ڈھلنے لگی تھی۔ جب نازش نے گھر واپسی کی راہ لی۔ وہ ایک شاہراہ پر تھی۔ اور ایک سگنل کے سرخ اشارے پر اس نے گاڑی روکی اور پچھلی اپنی بائیں طرف دیکھا۔ اس کی نظریں وہیں ٹھہر گئیں۔ حواد اپنی گاڑی سے اتر رہا تھا۔ مگر وہ اکیلا نہیں تھا۔ دوسری طرف کا دروازہ کھلا اور میسلا ہنسی مسکراتی سرخ لباس میں شعلے کی طرح دکھائی باہر نکلی اور وہ دونوں اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اس رہسورنٹ کے اندر چلے گئے جس کے سامنے حواد نے اپنی گاڑی پارک کی تھی۔

شدت سے نازش کا دل چاہا۔ وہ ابھی اس کے سامنے چائے اور حواد کو اس کی سرگرمیاں جتلاوے۔ اور پھر اس نے یہی کیا بغیر سوچے بچھے اپنی گاڑی سائیڈ لین میں اتار دی۔ حواد کی کار کے ساتھ ہی خالی جگہ پر اسے پارکنگ مل گئی۔ گاڑی وہیں کھڑی کر کے وہ بھی رہسورنٹ میں داخل ہوئی۔ نازش کو ان دونوں کو ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں پڑی بلکہ اندر داخل ہوتے ہی اس کی نظریں سامنے بیٹھے حواد کی نظروں سے ٹکرائیں۔ حواد ایک لمبے کوخت حیرت زدہ ہوا۔ مگر فوراً ہی اس نے اپنے آپ پر قابو پایا اور میسلا کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اور نازش بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ حواد کے ساتھ والی ٹیبل پر جا کر رہی۔ کرسی چھیت کر اس طرح بیٹھی کہ حواد کی نظروں کے بالکل سامنے رہے۔ میسلا کی اس طرف پشت تھی۔ اور حواد چاہتے ہوئے بھی اس پر نظر ڈالنے پر مجبور تھا۔ نازش بیٹھی ہی اس طرح تھی۔ نہایت اطمینان سے چائے کھونٹ کھونٹ پیتی رہی۔ بظاہر حواد سے بے نیاز لگتی تھی مگر اس کو پتہ تھا کہ گاہے گاہے حواد جو نظروں پر ڈالتا تھا کسی قدر خشونت بھری ہوتی ہے۔

جلدی ہی وہ دونوں کافی ختم کر کے اٹھ گئے۔ میسلا آگے جا چکی تھی۔ حواد جاتے جاتے ایک پل کو نازش کے پاس رکا۔

”یہاں سے فوراً اٹھو۔۔۔ اور سیدھی گھر جاؤ۔“

”او کے پاس“ وہ بڑی غرماں برداری سے بولی مگر لہجوں پر آگ لگا دینی والی مسکراہٹ تھی۔

حواد تھکا کر آگے بڑھ گیا۔ اس کے پیچھے ہی وہ جانے کو ابھی۔ ان دونوں کی گاڑیاں آگے

پیچھے ہی تھیں۔ نازش کا رخ گھر کی طرف ہی تھا اور حواد مخالف سمت میں نکلا چلا گیا تھا۔

حواد بھی جلدی گھر واپس آ گیا تھا۔ رات تک نازش نے بڑی کوشش کی تھی کہ حواد کے سامنے نہ آئے۔ وہ اپنی کوشش میں کامیاب بھی رہی تھی۔ مگر اپنے کمرے میں جاتے ہوئے اسے ٹھنک کر رکنا پڑا۔ وہ روپیہ درمیں اس کے کمرے کے دروازے کے سامنے ڈٹا کھڑا تھا۔ نازش کے لئے پلٹنا بھی ممکن نہیں تھا۔ اسے دیکھ کر وہ ایک قدم آگے بڑھا۔

”رہسورنٹ میں کیا کرنے گئیں تھیں تم؟“ اس کے لہجے میں شعلوں کی لپک تھی۔

”چائے پیئے۔“ کمال اطمینان سے وہ بچے گئے جواب پر حواد بھنا کر رہ گیا۔

”میں کی اجازت سے؟“

”اجازت کی کیا ضرورت ہے؟“ وہ استہزاء سے مسکراتی۔

”اتنی خود مختار کب سے ہو گئیں تم؟ کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں جھیں؟“ وہ دھمکی آواز میں خزا یا۔

”آپ بھی تو مجھے تھے؟“ وہ بے خوفی سے بولی۔

حواد کا دل چاہا کہ ایک تھپڑ سید کر دے۔

”میری بات اور ہے۔“ اس نے راحت نہیں کر کہا۔

”آپ کی بات اور کیوں ہے؟“ وہ ہنسی۔

”میں اکیلی چائے پیئے نہیں چاہتی۔ آپ اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ سوچ منانے پر جگہ جاسکتے ہیں۔“

”شٹ اپ“ وہ تانبے کی طرح سرخ ہوا۔

”تم بد تمیز، بد زبان ہی نہیں۔ خود بھی ہو اور اب میں جھیں اس طرح کی بے لگی حرکتیں کرتے نہ دیکھوں۔“

”میں اپنے بیڑ جس کے سامنے جوابدہ ہوں بس۔“ وہ تلخیت سے بولی۔

”آپ کو میری باز پرس کا کوئی حق نہیں۔“

”مجھے ان سے زیادہ حق ہے۔ تمہاری باز پرس کا۔“ وہ ہنسی کر بولا۔

”اتنا ہی حق میرا بھی بنتا ہے۔ آپ سے باز پرس کرنے کا۔“ وہ بڑے شعلے

انداز میں بولی۔

"میں جنہیں جیسے کر رہا ہوں نازش اپنی حد میں رہو۔"

"میں اپنی حد میں ہوں۔" نازش بڑے قہر سے بولی۔ نازش کے غضب سے اندازہ چہرے پر پھیلا سکون، حماد کو اور جلائے دے رہا تھا۔

"کیا سمجھتی ہو تم۔" بڑا اختیار ہے جنہیں۔ میرے دن رات کا حساب رکھنے کا؟ بھول جاؤ کہ کبھی جنہیں اس کا موقع ملے گا۔" حماد نے اگلی اٹھا کر سخت تنبیہی انداز میں کہا تو نازش کی کپٹیاں سنگ اٹھیں مگر اس نے کمال ضبط سے آنکھوں میں آئے آنسو طلق میں اتارے وہ کسی طرح حماد کے سامنے کمرور نہیں پڑنا چاہتی تھی۔

"میں سلسا سے شادی کر رہا ہوں۔ آج سہ ماہی میری گرل فرینڈ نہ کہنا۔ شی از مانی فراموشی۔" وہ ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔

نازش کے سر پر جیسے چست آ رہی اور حماد اسے لمبے سے روکتا ہوا چلا گیا۔

کئی دن گزر گئے۔ نازش بہت جلد اپنے موڑ میں آ گئی۔ وہی لڑائی جھگڑا، پھیل تماشے شروع ہو گئے بلکہ ان سب کو لگتا تھا کہ وہ پہلے ہی نہیں زیادہ شور مچانے لگی تھی۔ ہنسنے کی بات ہو یا نہ ہو اس کے بلند قہقہے جیسے کام نہیں لیتے تھے۔ مگر کے بازو دے اس کے تعلقات ضرورت سے زیادہ خوشگوار ہو گئے تھے مگر ایک بات سب نے محسوس کی تھی۔ حماد اور نازش کی بات چیت بالکل بند تھی۔

نازش کو دیکھتے ہی حماد کے چہرے پر ناگواریت پھیل جاتی اور حمادی موجودگی میں چپکٹی نازش ایسے خاموش ہو جاتی جیسے کھلونے کی چالی ختم ہو گئی ہو۔ وہ صاف حماد سے کڑی تھی اور حماد جانا لگا تو اسے نظر انداز کرتا تھا۔ بالکل غیر محسوس طریقے سے دونوں ایک دوسرے سے بالکل لائق ہو گئے تھے۔ اب درمیان میں نہ مٹنے والا فاصلہ چکا تھا۔

پر مگر ام کے مطابق سلسا کے والدین جلد ہی آنے والے تھے۔ اور اس سے پہلے حماد کو گھر میں وہ مدعا بیان کر رہا تھا۔ جس سے ایک طوفان اٹھتا اور جس سے ٹھننے کے لئے دو اپنے آپ کو پوری طرح تیار کر چکا تھا۔ نازش سے اس نے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ جلد ہی سارے گھر میں یہ بات پھیل جائے گی۔ مگر نازش نے اپنے لب ہی لئے تھے۔ اب حماد کو خود ہی بڑوں تک بات پہچانی تھی اور اس نے اپنے والدین کے بجائے سیدھے سیدھے نازی بیگم سے ہی ہمت کر کے کہہ ڈالا۔ وہ سلسا سے شادی کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

"تم کو اتنی جرأت کیسے ہوئی حماد؟ کیا سوچ کر تم نے اتنا بڑا فیصلہ کیا؟" وہ شیرینی کی طرح دھاڑیں۔

"میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔" وہ مضبوطی سے بولا۔

"تمہارا نکاح نازش کے ساتھ ہو چکا ہے۔" انہوں نے جیسے اسے اطلاع دی۔

"چاہتا ہوں۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

"اور بارہ سال کے نابالغ لڑکے کا پانچ سال کی ناہم، نا سمجھ بچی سے نکاح پڑ جاوے جانے کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔ میں اس نام نہاد نکاح کو نہیں مانتا۔"

"یہ تمہارے نانا کا فیصلہ تھا حماد۔" وہ جلال میں آ گئیں۔

"ان کی خواہش اور تم دونوں کے والدین کی رضا مندی سے پورے خاندان کی موجودگی میں یہ نکاح پڑ جایا گیا تھا۔ یہ نکاح نام نہاد نہیں ہے۔ سارا خاندان اس کا گواہ ہے۔ تم اس سے کیسے انکار کر سکتے ہو؟"

"کیونکہ یہ میرا فیصلہ نہیں تھا۔" وہ بے غوثی سے بولا۔

"نانا کا فیصلہ تھا۔۔۔۔۔ اور میرے ماں باپ کو اختیار تھا انہوں نے میری زندگی کا فیصلہ اس وقت کر دیا۔ جب میں کچھ جانتا بھی نہیں تھا۔ مگر اب میں یہ اختیار کسی کو بھی نہیں دے سکتا۔ اپنے ماں باپ کو بھی نہیں۔ زندگی مجھے گزاری ہے اور اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے کا مجھے پورا حق ہے۔ یہ مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ نہ آپ نہ میرے والدین اور نہ وہ۔ جسے آپ نے میرے نام کے ساتھ ہاتھ رکھا ہے۔" اس نے نازش کا نام نہیں لیا۔ مگر اس کے لہجے میں جو کڑواہٹ تھی اور حماد کا جیسا حقہ انداز تھا، نازی بیگم بھی دیر تک کچھ بول ہی نہ سکیں۔

اور جب بولیں تو ان کا جلال مرد پڑ چکا تھا۔ لہجے میں ایک تشنگی سی تھی۔

"حماد جنہیں اندازہ ہے کہ تمہارے اس اقدام سے کتنے خاندان متاثر ہو سکتے ہیں آپ اس میں تعلقات کشیدہ ہو سکتے ہیں۔ میرے سب بچوں میں جو ایک ہے، محبت ہے غلوں ہے، سب تار تار ہو جائے گا۔"

"مجھے اندازہ ہے۔" وہ اب بڑے ادب سے بولا۔

"اور اتنی یقین آپ کی فہم و فراست پر ہے۔ اسی لئے میں نے کسی کا سہارا لئے بغیر آپ سے ہی بات کی ہے۔ آپ کے فیصلے پر کسی کو اعتراض کرنے کی ہمت نہیں ہوگی۔ غضبے دل

”حماد ایک عورت آنے والی نسل کی امین ہوتی ہے۔“

”میں الحمد للہ مسلمان ہوں اور میری اولاد بھی مسلمان ہوگی۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

”ہام کی مسلمان ایک یہودوں کی گود میں پلنے والا ہے۔“ نازی بیگم بے ساختہ اپنی کمری

سے اٹھ کھڑی ہو گئی۔

”نہیں حماد۔ میں اپنی آنے والی نسل تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتی جاؤ۔۔۔۔۔ ایسا کوئی قدم نہ

اٹھاؤ جو جنہیں دین اور دنیا۔ دونوں کو برباد کر دے۔ سو چاہئے فیصلے پر ہر پہلو سے سوچو۔ مذہب

سے دوری نہ جنہیں اس مقام تک پہنچا دیا۔ جن بچوں کو مذہب بھی آدھا تیر آدھا تیر کی صورت

ملے۔ ان کا کیا بنے گا؟ سوچو۔ ہم تمہیں وقت دیتے ہیں۔ اب تم جاؤ۔“

مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ نازی بیگم اپنے صلیبی کی طرف بڑھ گئیں۔

حماد خاموش کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔ پھر دروازے سے باہر نکلتے ہوئے اس کی مذہبی نازش

سے ہو گئی۔ وہ اندر آئے کھڑی۔ حماد ایک لمحے کو رک گیا۔ نازش پر گہری نظر ڈالی مگر اس کے سپاٹ

چرے سے اسے کوئی اندازہ نہ ہو سکا کہ وہ ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سن چکی تھی یا

انجان بن رہی تھی۔

مگر نازش انجان نہیں تھی۔ اس نے ایک ایک لفظ سنا تھا۔ حماد کے دل میں حماد کی زندگی

میں اس کی تبدیلی نہیں رہی تھی۔ اس انکشاف نے اس کا دل چیر کر رکھ دیا تھا۔

گھر کی فضاء انتہائی کشیدہ ہو چکی تھی۔ حماد نے اپنے والدین کو بھی اپنے فیصلے سے آگاہ

کر دیا تھا۔ نازی بیگم نے اپنے سب بچوں سے مشورہ کیا صرف فرمانہ پوری طرح حماد کے حق میں

تھی۔ ایک طرح سے اس کا کہنا صحیح بھی تھا۔

”ایک غلطی اس وقت ہوئی جب ان دونوں بچوں کو نکاح کے بندھن میں باندھ دیا گیا۔

ان کا بنیادی حق اپنی خواہشات کے تابع کر دیا گیا۔ اب دوسری غلطی یہ ہو گئی کہ ان کی خواہش کے

برعکس ان کو ساری زندگی ایک دوسرے کے ساتھ گزارنے پر مجبور کیا جائے۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔

وہ زندگیاں تباہ ہونے سے بچائیں ماں۔“ وہ مستقل ماں کے ذہن میں بنی ڈالٹی رہتی۔

عرقانہ نے بیٹے کو ہر طرح سے سمجھایا۔ ہر قسم کا دباؤ ڈالا۔ ناراض بھی ہو گئیں مگر وہ اپنے

ارادے سے ایک انچ بھر سکتے کو تیار نہیں تھا۔

عمران گیلانی اور ان کی بیوی بالکل خاموشی اختیار کئے ہوئے تھے۔ البتہ عرقان گیلانی نے

سے سوچیں ناںو۔۔۔ میں اور نازش اس زبردستی کے بندھن کو نہیں بٹھا سکتے۔ میرے دل میں نازش

کے لئے کوئی جگہ نہیں رہی۔ میری زندگی میں کوئی اور آ چکی ہے۔ میں نازش کو کچھ نہیں دے سکوں

گا۔ تو وہ کس طرح میرے ساتھ زندگی گزار پائے گی۔ ہم دونوں کی زندگی تو تباہ ہو گئی۔ آپ لوگ

بھی کیا بچیں دسکوں سے رہ سکیں گے۔ ہمیں برباد کر کے رکھ دیں کشیدگی کی بات تو یہ سب قوی ہو گا۔

گزارتے وقت کے ساتھ سب کو احساس ہو جائے گا کہ آپ کا فیصلہ درست تھا، پھر کوئی بھی کسی

سے ناراض نہیں رہ سکے گا۔

نازی بیگم بالکل خاموش تھیں۔ وہ اس وقت جس دھڑلے سے گزر رہی تھیں حماد اس کا

اعزاز بھی نہیں کر سکتا تھا۔ نہ نہیں خاموش دیکھ کر کچھ رہا تھا کہ اس کی بات ان کی سمجھ میں آ رہی ہے۔

حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ حماد کا مطالبہ کسی بھی طرح قابل قبول نہیں تھا، غلط، طعنے، مبالغہ کی شدت سے

ان کی گویا کی سلب تھی۔ اپنی بات مضبوط کرنے کیلئے حماد پھر زور سے بولنا شروع ہوا۔

”میں نے بھی کسی سے گفتگو کیا ہے ناںو۔۔۔۔۔ میں اپنے دھڑے سے نہیں بھر سکتا جبکہ

میری ولی خواہش بھی یہی ہے۔ میں سب کو اس مقام تک لا کر۔۔۔۔۔“

”سب کا مذہب کیا ہے؟“ حماد کی بات درمیان ہی میں بڑی سرد مہری سے کاٹ کر نازی

بیگم نے پوچھا تو وہ کچھ دیر کو بالکل خاموش رہ گیا۔

”وہ یہودی ہے۔ مسلمان ہو جائے گی۔“ اب وہ دھیرا پڑا۔

”یہودی کبھی مسلمان نہیں ہوتا۔“ نازی بیگم نے بڑی قطعیت سے کہا۔

”مسلمان کا ازنی دشمن یہودی دل سے کبھی مسلمان نہیں ہوتا ان منافقین کے لئے تو اللہ

تعالیٰ نے قرآن پاک میں کئی جگہ ارشاد فرمایا کہ یہود سے دوستی نہ رکھو۔ ان سے میل ملاپ اور محبت

کے رشتے استوار نہ کرو۔“

”جس طرح پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں ہر مسلمان، بہت اچھا مسلمان اور مومن

نہیں ہوتا۔ اسی طرح سب یہودی بھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ وہ مسلمان نہ کسی اہل کتاب ہے

اور اہل کتاب سے نکاح جائز ہے۔ وہ تو اسلام قبول کرے گی۔“ حماد کی ہٹ دھرمی پر نازی بیگم

کو بڑا دلچسپ ہوا۔

حماد نے ان کا غلطہ نظر دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ انہوں نے بڑی افسوسناک نظر اس



بہت ہنگامہ بچایا تھا۔ نازش کو وہ بالکل بچی کی طرح چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ اس کی توجین تھی۔ جو وہ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ یہ جانتے ہوئے کہ ان کے بیٹے راجیل کا جھکاؤ مادہ نوری طرف تھا۔ ہاں سے خود اپنی خواہش کا اظہار وہ کر چکا تھا۔ اور نازی بیگم بھی اس رشتے کے لئے مایہ بھر مٹی تھیں۔ انہوں نے راجیل کے لئے نازش کا رشتہ مانگ لیا۔ عمران گیلانی خاموش نہیں رہ سکے تھے۔

”میری بچی مجھ پر بوجھ نہیں ہے۔ ایک نے انکار کیا تو دوسرا اوصو نے کو آگیا۔“ وہ سخت طیش میں آ گئے۔

”آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں بھائی صاحب! نازش میری بھی بچی ہے اور میں نے کچھ سوچ کر یہ رشتہ ڈالا ہے۔ حماد کو مادہ نوری کا ذرا بھی خیال ہوگا تو وہ اپنے ارادے سے باز آجائے گا۔ نو جوانوں سے ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ان کے آگے ہتھیار ڈال دیئے جائیں۔ ہم کو تدبیر کرنے دیں۔ یہ جوش سے نہیں ہوش سے کام لینے کا موقع ہے۔“ انہوں نے سمجھانے کی کوشش کی مگر عمران صاحب نے ان کی تجویز ماننے سے انکار کر دیا۔

”حماد کے سر پر عشق کا بھوت سوار ہے۔ وہ کسی کی نہیں سنے گا۔ ہاں کی نہ نہن کی جس نے نکاح جیسے آفاقی رشتے کی پاسداری نہ کی اس کے لئے اب کوئی رشتہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اور میں خود ایسے فیصلے کے ساتھ اپنی بچی کا مستقبل وابستہ نہیں کرنا چاہتا۔ تمہیں یہ حجت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مادہ نوری راجیل کا رشتہ اماں ملے کر چکی ہیں۔ وہ برقرار رہے گا البتہ اپنے مستقبل کا فیصلہ نازش خود کرے گی۔“

”کچھ فیصلہ وقت پر چھوڑ دو۔“ نازی بیگم نے بڑی مضبوطی سے کہا۔

”اس بات سے آپ کا کیا مطلب ہے اماں۔“ دونوں ہی سمجھ نہ سکے۔

”ہمارے خاندان میں طلاق نہیں ہوتی۔ آج تک ایسا نہیں ہوا۔ جو رشتہ تہہ بے مرحوم باپ نے ملے کیا تھا میں اپنی زندگی میں تو نوٹے نہیں دوں گی۔ حماد کو اپنی خند چھوڑنا ہوگی وقت کا انتظار کرو۔“ روز کی طرح ایک لمبی بحث کے بعد معاملہ پھر جوں کا توں تھا۔

سب بڑے بول بول کر تھک چکے تھے۔ سوچ سوچ کر ہار گئے تھے۔ کوئی حل نہ نکال پا رہے تھے اور وہ دو افراد جن کی پوری زندگی کا دار و مدار ان کے فیصلے پر تھا۔ بالکل خاموش تھے۔ حماد گھر میں لپکتی نہیں تھا۔ سب سے لاشعری اختیار کر رکھی تھی۔ وہ اب اس موضوع پر کسی نے بات

رہا نہیں چاہتا تھا اور اس کے کسی انداز سے نہیں لگتا تھا کہ وہ گھر والوں کے آگے کھٹے ٹیکے کا مادیان گزرنے کے ساتھ اس کا فیصلہ ملے ہوتا جا رہا تھا۔ وہ صرف میسلے کے والدین کے انتظار میں تھا۔ ان کے آگے ہی وہ اپنے ارادے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے والا تھا۔

اور نازش۔ اتنی گہری تھی کہ اس کے دل کی بات کوئی نہیں جان پار تھا۔ وہ اپنے کسی انداز سے کسی پر کچھ بھی ظاہر نہ ہونے دیتی۔ معمول کے مطابق کالج جانا، رات گئے تک اسٹڈیز میں غرق رہنا۔ پورے گھر میں اس وقت وہی بلا کی پرسکون ہونے کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ سارا گھر اس کے لئے پریشان تھا اور وہ خود اپنے آپ میں لگن۔ ہر کسی سے بے نیاز۔

اس رات حماد کو گھر جلدی لونا پڑا۔ صبح سے کچھ ٹھوکر کا اثر تھا۔ شام میں ہلکی ہلکی بارش سے فضا بڑھ گئی تھی اور اب بارش کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کے کپڑے پہلے ہی بھیگ چکے تھے۔ طبیعت زیادہ خراب ہو جانے کے ڈر سے وہ گھر جلد آنے پر مجبور ہو گیا۔ جس وقت وہ گھر پہنچا۔ گھر کے سب افراد کھانے سے فارغ کرنا ڈیوڑھی بٹھائے تھے۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ وہ بے کواظر انداز کرنا سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا اسے جلد سے جلد لباس تبدیل کرنا تھا۔

کچھ دیر بعد بارش کی شدت کا اندازہ کرنے کے لئے وہ اونچی ٹیڑی پر نکل آیا۔ ذرا دیر بعد ناسے احساس ہوا وہ وہاں تنہا نہیں تھا۔ ریٹنگ پر بیٹھے بیٹھے گردن موڑ کر دیکھا دوسرے سرے پر نازش اسی کی طرح ریٹنگ پر بیٹھی کھڑی تھی۔ وہ بھی اس کی آمد سے بے خبر تھی۔ اس کے کمرے کا اندازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر سے آنے والی ہلکی روشنی میں بھی حماد کو اندازہ ہو گیا کہ وہ پوری طرح بھیگ رہا ہے۔ حماد بے تدمسوں اس کی پشت پر جا کھڑا ہوا۔ نازش کو اس کی بھی خبر نہ ہوئی۔ پانی کی اچھی سی بو چھڑ میں کھڑی وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی وہ بے اختیار بول اٹھا۔

”نازش! یہاں کھڑی کیوں بھیگ رہی ہو؟“ نازش سیدھی ہو گئی اور اس کی طرف مڑے۔

”مجھے بارش میں بیگانہ اچھا لگتا ہے۔“

”اور جو بیار پڑ گئیں تو؟“ اس کے لیے ہیں اس کے لئے تو تھا۔ نازش کو آگ لگی۔

”میں بہت ڈھمکتی ہوں۔ میری یہ صفت تو آپ کو مطمئن نہیں۔ ایسی ہلکی ہلکی بارشیں میرا نہیں ہکاڑکتیں۔ البتہ آپ کافی نازک مزاج ہیں۔ آواز سے لگ رہا ہے بیار پڑ چکے ہیں۔“ کے سیدھے سادے جملوں میں گہری کات تھی۔

”بہت بولتی ہوں؟“ وہ بھنا گیا۔

”چلو۔ اندر چلو۔“

”مجھے کہنے کے بجائے بھڑکا کر آپ خود اندر چلے جاتے۔ تاحق کھڑے ہیں۔“

”ہے ہیں۔“

اس کی اوصاف پر حاد کو غصہ آ گیا۔ جل کر بولا۔

”مرنے کا ارادہ ہے کیا؟“

”نہیں تو؟“ وہ بڑے مزے سے بولی اور اپنی پٹیلیوں میں پانی جمع کرنے لگی۔

”کچھ نہیں ہوگا۔“ نازش نے پانی جھٹک کر اپنی ہانگی پھیلائی۔

”دیکھئے۔ میری زندگی کی لکیر کتنی گہری اور لمبی ہے اور مجھے زندگی سے بہت پیار ہے۔“

مرنے کی باتیں تو بزدل کرتے ہیں۔ میرے سامنے تو ایک جہان پھیلا ہوا ہے۔ میں کیا کروں؟“ وہ نازش کی اس سیدھی سیدھی باتوں کا لیزر حاد مطلب بخوبی جان رہا تھا۔ ٹھک کر بولا۔

”بہت بہادر بنی ہو!“

”وہ تو میں ہوں۔ اس میں شک کیا ہے؟“ اس کی گہری ہنسی میں ایک چٹختی تھا۔ حاد کھلا ہوا۔

”تو اپنی بہادری کا ثبوت دکھاؤ۔“

اب وہ اس کی طرف چلی اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑے حاد سے پوچھا۔

”آپ نے مجھے آزماتا کیا؟“

حاد سے کچھ جواب نہ دین پر انھیں چرا کر برتی بارش کو دیکھنے لگا۔

”مقدمے کی سب سے اہم فریق میں ہوں۔ میرا بیان لینے کی آج تک کسی نے ذمہ

نہیں لی۔ آپ مجھ تک تو آتے۔ بہت پہلے یہ مقدمہ جیت گئے ہوتے۔“

حاد نے اس کا مطلب سمجھنے ہوئے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ اسے یقین نہیں آیا۔

”بہت صاف۔ بہت واضح۔“ وہ اسی اطمینان سے بولی۔

”شادی۔ دلوں کی خوشی اور مطمئن کا نام ہے۔ جب دل نہ ملے ہوں تو زندگی میں خوشی،“

اطمینان کہاں سے آئے گا۔ آپ کی طرح میں بھی بڑوں کے فیصلے کی سمجھ نہیں چڑھتا چاہتا۔“

ایک قدم آپ اٹھا چکے۔ دوسرا قدم میں اٹھاؤں گی۔ کل میں خود سب کے سامنے اس کا نام

بندھن کو نبھانے سے انکار کر دوں گی۔“

وہ سر اٹھا کر حاد کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بڑے حاد سے کہہ رہی تھی۔

”اتنی بہت ہے تم میں؟“ وہ بے یقینی کا شکار تھا۔

”کل کون سا دور ہے۔ دیکھ لیجئے گا۔“

حاد سوچتی نظروں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

”کیا وہ سچ کہہ رہی تھی؟ واقعی ایسا کر سکتی تھی؟“ وہ اس کا یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اسے

سوچ میں پڑے دیکھ کر نازش مسکرا دی۔ بڑے دوستانہ انداز میں بولی۔

”کس اطمینان میں پڑ گئے آپ؟ اپنے ذہن پر زیادہ بوجھ نہ ڈالیں۔ طبیعت اور خراب

ہو جانے گی۔ دو ٹیبلٹ چٹاؤں کھا لیجئے اور آرام سے سو جائیے۔ اب مجھے ذرا بارش کا لطف

اٹھانے دیجئے۔“

وہ مزی اور بارش کے قطرے پھیلی چمچ کرنے لگی۔

حاد نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ پہلے ہی بر قدم پڑا سے زچ کرتی تھی۔ اس کی پشت

پر کھڑے سیاحانوں کو زور دیا اور دیکھا کہ ہاتھ پیر گہری سانس بھری۔ لوں پر مدھمی مسکراہٹ نکھری۔

”تم واقعی بہت بولتی ہو۔ ضرورت سے زیادہ۔“ وہ پلٹ کر دھیرے قدموں سے اپنے

کمرے میں چلا گیا۔

حاد کے چاتے ہی نازش کی ساری بہت جواب دے گئی۔ ریٹک بے ٹھنکی وہ بے آواز

آنسو بہاتی رہی۔ چہرے سے پھلتے بارش کے قطرے کے ساتھ دل کا درد بچنے کسی نے نہ دیکھا۔

دورات اس پر کس قدر بھاری گزری۔ کوئی نہ جان پایا۔

دوسرے دن حاد گھر پر رہا۔ کچھ ناسازی طبیعت کی وجہ سے اور کچھ اس تجسس میں کہ

نازش اپنے دعویٰ پر کس طرح عمل کرے گی۔ صبح سے ہی وہ سب کے ساتھ لاؤنچ میں بیٹھا رہا۔ اس

کی طبیعت حساس دیکھ کر کسی نے اسے چھیڑا نہیں حالانکہ وہ بڑے دلوں بعد سب کے ہاتھ لگا تھا۔

صبح سے دوپہر ہو گئی۔ اسے نازش کا انتظار ہی رہا۔ وہ اپنے کمرے سے نہیں نکلی۔ نہ کوئی

اس کے لئے فکر مند تھا کہ وہ نظر کیوں نہیں آ رہی۔ حاد کو تشویش ہونے لگی۔ کل رات وہ جس طرح

بارش میں کھڑی بیٹھ رہی تھی اور صفحہ سے کانپ رہی تھی۔ کبھی پیار نہ پڑ گئی ہو۔ اس نے چھوٹی

مسکان کو اپنے پاس بلایا۔ چپکے سے بولا۔

”وکیلہ کراؤ۔ نازش کیا کر رہی ہے؟“

”مجھے پہلے سے پتہ ہے کیا کر رہی ہیں؟“ اس نے آنکھیں میچائیں۔

”اپنے کمرے کی صفائی کر رہی ہیں جو دو سال میں ایک بار کرتی ہیں۔ ان کے کمرے کا دروازہ لوکنہ ہے اور وہ اسے ہرگز نہیں کھولیں گی۔ کسی کے لئے بھی نہیں۔“

”تمہیں کیسے پتہ؟“ حماد کو اس پر شک تھا۔

”صبح جب ناشتہ کرنے آئی تھیں کہ تو کہہ رہی تھیں۔ آج میرے کمرے میں کوئی نہ آئے اور مجھے تو خاص طور پر منع کیا ہے۔“

”تمہیں ان خاص طور سے کیوں؟“ حماد کو اس کے مصمصیت سے کہنے پر ہنسی آگئی۔

”کیونکہ میں ان کی ہر چیز کو چھیڑتی ہوں اور کچھ نہ کچھ ضرور توڑ دیتی ہوں۔ آپنی کے پاس اتنی پیاری پیاری چیزیں ہیں! آپ نے ان کا کمرہ دیکھا ہے نا؟“ اس نے بڑے شوق سے پوچھا۔

”نہیں! احمانے گہری سانس بھری۔

”یہ صفائی کار پروگرام کب تک چلے گا؟“

”رات تک یا شاید کل صبح تک۔“

حماد کو بے انتہا تڑاؤ آیا۔ جتنی بے تابی سے وہ اس کا شہر تھا اتنی ہی بے نیازی سے وہ سارے دن کا پروگرام بنا کر کمرے میں بند تھی۔ وہ پہرے کے کھانے پر بھی وہ نظر نہ آئی۔ ملانے پر اس نے کہا وہ دیا اس کے پاس کھانا کھانے کے لئے نام نہیں ہے۔ اس کے لئے کھانا کمرے میں بھجوا دیا جائے۔

اور حماد کو یقین ہو گیا اور اس کا سامنا کرنے سے کتر رہی ہے۔ رات بھوت بول رہی تھی۔ اتنی ہمت کہاں ہوگی سب کے سامنے انکار کرنے کی۔ خواہ مخواہ اسکے پیچھے اپنا سارا دن خراب کیا۔

جلاہ خوار ہوا۔ اس کا کھانا کھانے کو بھی دل نہ چاہا۔ تھوڑا بہت کھا کے وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ سونے کی کوشش کی مگر نیند نہیں آئی۔ طبیعت سخت جڑا ہو رہی تھی۔ رورہ کر نازش پر طعناں مارا۔ اور اس سے زیادہ اپنے آپ پر۔ وہ کیوں اس پر بھروسہ کر بیٹھا۔ کیوں امید باندھ لی۔

شام تک اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی وہ گھر میں ٹھہر کر اپنی شام برپا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ نیند نہیں کھا رہا جس کے لئے نکلا۔ رات کی بادش کے بعد موسم بہت خوشگوار ہو گیا تھا۔ سبزہ دھل کر گھرا ہوا آنکھوں کو ترواہست مل رہا تھا۔ لان میں مگر کے سب ہی افراد جمع تھے۔

چائے کا انتظام کیا جا رہا تھا۔ ایک نظر میں اس نے اندازہ کر لیا۔ نازش ان میں موجود نہیں تھی۔ وہ بھٹا کر سب کو نظر انداز کر کے نکل جاتا چاہتا تھا۔ نازی گیلانی نے اسے آواز دی تو اسے رک کر پلٹنا پڑا۔ انہوں نے اشارے سے اسے قریب بلایا۔

وہ بے دلی سے آگے بڑھا اور پھر ٹھٹھک کر رک گیا۔ آف وہاٹ لباس میں گھاس پر دوڑا تو چٹھی نازش پر اس کی نظر ٹھہر گئی۔ وہ نازی گیلانی کے زانوں پر دونوں ہاتھ رکھے ہنس ہنس کر ان سے کچھ کہہ رہی تھی اور وہ ڈرامائی سے سرٹکی میں ہلا رہی تھیں۔ وہ بے اختیار ان دونوں کی طرف کھنچا چلا آیا۔

حماد کو دیکھتے ہی نازش مسکرائی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر پوری طرح نازی گیلانی کی طرف متوجہ ہوئی۔

”اچھا دادو۔ اب تو معاف کر دیں۔ حالانکہ ناراض مجھے آپ سے ہونا چاہئے۔“

”لو! انا چور کو تو ال کوڑا سنئے۔“ وہ اور خفا ہوئیں۔

”مجھ سے کیا بھول ہوئی؟“

”آپ سے تو بہت بڑی بھول ہوئی ہے دادو۔“

نازش نے پھر حماد کی طرف دیکھا۔ حمادی کھلی کھلی آنکھوں میں حیرت ہی حیرت تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ نازش کا کس بات کی طرف اشارہ ہے مگر اس ہمت اور جرأت کی اسے قطعی امید نہیں تھی۔

”آپ کو بالکل یاد نہیں دادو۔ آج میری ساگر ہو ہے۔“

”اور؟“ سب کے منہ سے بے اختیار کچھ نہ کچھ نکلا۔ حماد کے اعصاب ڈھیلے پڑے۔ آج نازش کی ساگر تھی۔ آج ہی کی تاریخ میں ان دونوں کا نکاح ہوا تھا اور وہ سب کے سب بھولے ہوئے تھے۔

دراصل ان کے گھرانے میں ساگر وہ منانے کا کوئی رواج نہیں رہا تھا۔ وہ تو نازش ہی ہر سال اپنی ساگر سے کچھ دن پہلے سے شوق چھاندا شروع کر دیتی۔ سب سے تجھے بھی زبردستی کھینچتی،

کیک بھی کاتا جاتا اور رات میں سب گھر والوں کو ڈنرا اپنی جیب سے کراتی۔ اس دفعہ وہ بالکل خاموش رہی تھی نہ اس نے شوق چھانپا یا اور نہ کسی کو یاد رہا۔

مگر اب سب ہی کو ایسوس ہو رہا تھا کہ اپنی پریشانی میں انہوں نے اس کی زندگی کا اہم دن بھلا دیا تھا۔ اب سب اس کی ساگر فوری طور پر منانا چاہ رہے تھے۔ تھوکنے کے دھڑے کر رہے تھے۔



"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔" اس نے سہولت سے سب کو منع کر دیا۔  
 "اے۔" تھوڑے لمحوں کے بغیر تم زندہ کیسے رہو گی نازش؟ اگلی ساگرہ آنے میں پورا سال باقی ہے۔ سوچ لو! "ریزہ کی زبان کھلی ہوئی۔ اس نے جیب سے ڈھونڈ کر چوٹی نکالی اور نازش کی تسلی پر دکھانا چاہی۔ نازش نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔  
 "مجھے تھوڑے لمحوں کی نہیں۔ آپ سب لوگوں کی سہولت کی ضرورت ہے۔"  
 اسے خطرناک حد تک سنجیدہ دیکھ کر سب لوگ خاموش ہو کر پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوئے۔  
 حماد نے اپنا رخ دوسری طرف پھیر لیا۔ نازش نے جو کہا تھا کر دکھانے والی تھی۔  
 "میں جو کہنے جا رہی ہوں۔ اسے قتل سے سنئے۔"  
 اب حماد کو سب بڑوں اور چھوٹوں کا سامنا کرنا تھا۔  
 "میں آپ سب کی موجودگی میں حماد کو دوسری شادی کی اجازت دیتی ہوں۔" نازش کی آواز صاف اور بلند تھی۔  
 "نازش!" اس ریش کرنے والوں میں سب سے بلند آواز عرفان کی تھی۔  
 سب اپنی بساط بھر اسے طاقت کر رہے تھے حماد نے پلٹ کر نازش کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھ گود میں رکھے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ حماد کی نظریں اس کے سیاہ بالوں میں چمکتی سیدھی مانگ پر جم کر رہ گئیں۔ کوشش کے باوجود اپنی نظریں نہ ہٹا سکا۔  
 نازش کی گیلیانی نے اپنا ہاتھ اس کے جھکے ہوئے سر پر رکھا۔ ان کے ہاتھوں میں واضح لرزش تھی۔  
 "تمہارا بے پڑے ابھی تمہارے سر پر موجود ہیں نازش۔ تمہیں ایسا فیصلہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" ان کی آواز میں ابھی بھی ارتعاش تھا۔  
 "اللہ! آپ سب لوگوں کا سایہ ہمیشہ میرے سر پر قائم رکھے۔ میری مجال نہیں کہ بڑوں کے فیصلے کے خلاف آواز اٹھاؤں۔ دادا جی کا ملے کیا ہوا رشتہ برقرار ہے گا مگر دادا دوصاف کیجئے گا۔  
 حماد کی منگوہ ہونے کی حیثیت سے صرف اور صرف مجھے اختیار حاصل ہے کہ میں انہیں ان کی خوشی کے لئے دوسری شادی کی اجازت دے سکتی ہوں اور حماد میرے علاوہ کسی اور کے سامنے اس کے لئے جوابدہ نہیں ہیں۔"  
 نازش کے انداز میں کوئی چلک نہیں تھی۔ اس نے واضح انداز اپنا فیصلہ سنایا۔ سب ستانے

آگئے تھے۔

جس مسئلے کا کوئی روز کی گفتگو کی لابیجی بحث کے بعد بھی کوئی حل نہ نکال پارہے تھے اس کو ہر میں فیصلہ کن انجام تک پہنچا کر دوڑ کی نہیں۔ سب کے سچ میں سے ابھی اور مضبوطی سے قدم مانی اندر کی طرف بڑھ گئی۔  
 اس کے جاتے ہی حماد بھی جیسے کسی ٹرانس کی حالت میں نکلا کسی سے نظر ملانے بغیر اپنی نازی کی طرف بڑھ گیا۔  
 "یہ کیا کیا تم نے نازش؟ اپنے پی پاؤں پر کھناڑی ماری۔" ماہو جب سے اس کے ساتھ تھی اور اسی ملال میں تھی۔  
 "اور کوئی چوٹیں نہیں تھی میرے پاس۔ ایک ہی راستہ تھا بس۔" اس نے دھیرے سے انہیں سونڈ لیں۔  
 "کیوں نہیں تھا اور کوئی راستہ؟ آخر سب لوگ معاملہ سلجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اگر ن کے نزدیک بھی کبھی مل جاتا تو سب کا فیصلہ نہ کر چکے ہوتے۔ محترم نے سب کی کوششوں پر پانی بھریا۔ ایک دفعہ تمہاری رخصتی ہو جاتی۔ بھائی کو زبردستی رخصتی۔"  
 "زبردستی!" نازش نے توپ کر اس کی بات کافی۔ "یہی تو میں نہیں چاہتی تھی۔ اس فیصلے کی زندگی میں زبردستی داخل ہو جاتی جس کے دل میں میرے لئے کوئی جگہ نہیں جس کی نگاہوں میں دوسری عورت کسی ہوئی ہے۔ ایک پورا وجود ہمارے درمیان حائل ہو چکا ہے۔"  
 "وہ شخص پہلے تمہارا شوہر ہے تمہیں پورا حق ہے کہ اس کی زندگی میں داخل ہو۔ ایسی ایسی تو نئی مردوں کی زندگی میں آتی جاتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اپنے ہاتھوں اپنا شوہر اسے سونپ دے۔ تمہیں پہلے حق ہے بلکہ صرف تمہارا حق ہے کہ اس کے دل پر راج کر دو۔ اس کی زندگی پر تمہیں اختیار ہے صرف۔"  
 "مجھے ایسی کوئی خواہش نہیں۔ میرے نزدیک اس سے زیادہ دولت بھری زندگی اور کوئی نہیں ہو سکتی جہین کر لئے ہوئے۔ بیک میں ملے ہوئے کچھ لمبے۔ میں بھکارن نہیں ہوں۔" اس نے آواز بھرا تھی۔ "میں حماد کو اپنی زندگی سے نکال چکی ہوں۔"  
 "نازش" تمہیں بے چینی سے چلائی۔ "جھوٹ سنت ہو لو نازش میں جانتی ہوں تم بھائی کو کس قدر چاہتی ہو۔ بچپن سے ہی ان کا نام تمہارے نام کے ساتھ جڑا ہے وہ تمہارے لئے کیا ہیں۔

تری یادوں کے گلاب

تمہاری آنکھیں، تمہارا چہرہ چمک چمک کر رہا دیتے ہیں۔ تم اتنی آسانی سے ان سے دستبردار نہیں ہو سکتیں۔

”ہاں۔ آسان نہیں ہے۔“ اس نے بڑی صاف گوئی سے اقرار کیا۔

”ہوش سنبھالنے ہی جس کے خواب آنکھوں نے دیکھے ہوں جو زندگی کی طویل شاہراہ کا ہمسفر ہو۔ اسے بھولنا آسان نہیں ہے مگر کوشش کر رہی ہوں۔ یہ اللہ کے فیصلے ہیں۔ وہ جوڑے بنا چاہے۔ ہم اس کے فیصلے کو چیلنج نہیں کر سکتے۔ اس کی مصطفیتیں وہی جانے۔ میں تو اب اپنے لئے بہتری کی دعائیں کرتی رہتی ہوں۔ میرے نصیب میں آگے کیا لکھا ہے۔ وقت آ۔ پر پتا چل جائے گا۔“

گھر کے ماحول پر بھائی انفرادی کو ہر کسی نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ نازش اپنی باقی پڑھائی لندن میں پوری کرنا چاہتی تھی۔ اس کے دونوں بھائی پہلے ہی وہاں پڑھ رہے تھے۔ انہار نے نازش کا وہاں جاگیر لین کر دیا تھا۔ عمران ملک بھی اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ لندن شفٹ ہو رہے تھے۔ ان کے اس فیصلے پر سب کو دکھا مگر کوئی کچھ کہنے کی ہمت نہیں کر رہا تھا صرف جڑا میلائی نے انہیں روکنے کی کوشش کی تھی مگر انہوں نے اس کو سمجھا لیا تھا۔

”اماں میرا وہاں مستقل رہنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ جب تک میرے بچے وہاں پڑھ رہے ہیں۔ میں ان کے ساتھ رہوں گا۔ نازش کو ہم اس وقت اکیلی نہیں چھوڑ سکتے۔ اس کو پوری فیملی کی سپورٹ کی ہے اور وہ یہاں نہیں رہنا چاہتی۔ اس کے بھائی بھی ایضاً ہیں کہ ہم سب ایک ساتھ رہیں۔ ہم سب ایک ساتھ ہی واپس آئیں گے اور آپ کے پاس اسی گھر میں رہیں گے۔“ نازش میلائی نے دل کو سمجھا لیا۔ حالات کا تقاضا بھی یہی تھا۔ ان سب کو بخوش جانے کی اجازت دے دی۔ سنا ان سب کی لندن روانگی تھی۔

جانے سے پہلے۔ حماد نے نازش سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ وہ اس سے کچھ کہتا چاہتا تھا۔ یہ پیغام اسے ماہ فور نے پہنچایا تھا۔

اتنے عرصے میں وہ پہلی دفعہ نازش کے کمرے میں آیا تھا۔ کمرے کی سجاوٹ کو اس نے پسندیدہ نظروں سے دیکھا تھا۔ نازش نے اپنے کمرے کی کوئی چیز بیک نہیں کی تھی۔ سب جگہ پر طرح بچا ہوا تھا جیسے اسے یہیں رہنا ہو۔ وہ خود فرش پر دوڑا تو فیضی ایک چھوٹے بیک میں ان ضروری سامان رکھ رہی تھی۔

تری یادوں کے گلاب

”تمہارا کمرہ بہت ٹھیک ہے۔ ہر چیز اپنی جگہ بہترین اور مکمل۔“ اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔

”جھکس۔“ وہ ساواگی سے مسکرائی۔

”آپ جیسے پلیز۔“

”مگر تم نے اتنی خوبصورتی سے سجایا کمرہ۔ مکان کو کبڈی کھیلنے کے لئے کھلا چھوڑ دیا ہے وہ تمہاری کوئی چیز باقی نہیں رہنے دے گی۔“ حماد نے بڑے دوستانہ انداز میں بات شروع کی۔

”نہیں۔ اس کو یہاں کبڈی کھیلنے کا موقع نہیں ملے گا۔ یہ پورا پرش لوکنڈ رہے گا۔“ وہ دھیرے سے ہنسی۔

”اور۔“ اچھا! بیکل مکمل ہو گئی تمہاری؟“ حماد نے بیٹھتے ہوئے کمرے میں ایک طرف دیکھ کر بڑے سوٹ کیمز کو دیکھا۔

”تقریباً۔“ وہ بیک کھلا چھوڑ کر باغی اور اس کے مقابلہ دہی دوسری ایڑی چیمز پر آ بیٹھی۔

”میں تمہارے کام میں خلل تو نہیں ہوا؟“ اس نے معذرتی انداز میں پوچھا تو وہ جلدی سے بولی۔

”نہیں۔ بالکل نہیں۔ بلکہ میں تو آپ کا انتظار کر رہی تھی۔“ بے خیالی میں کہہ گئی۔ احساس ہوا تو جلدی ہی بات چلائی۔

”آئی مین۔ مجھے آپ کا میسج ملا تھا کہ آپ کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔“

اس کے انداز پر وہ مسکرایا۔ بحر خمیدہ ہوا۔

”ہاں۔ مجھے تم سے بے حد اہم بات کہنی ہے۔“

”وہ رک گیا۔ جیسے سوزوں الفاظ محفوظ رہا ہو۔ بات شروع کرنے کے لئے۔ نازش نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ از حد خمیدگی سے اپنے دونوں ہاتھوں پر نظریں جمائے وہ منتظر تھی۔

”در اصل میں تم سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ تم نے جس طرح میری خواہش کا احترام کیا ہے اور ایسا فیصلہ کیا کہ کسی کے کچھ کہنے کی خواہش نہیں چھوڑی۔ میں تمہارا ممنون ہوں اور اسی طرح میں بھی تمہاری خواہش کا احترام کروں گا۔ میں تمہیں بانڈھ کر رکھنا نہیں چاہتا۔ تمہیں اپنی زندگی گزارنے کا پورا حق ہے۔ تم جب چاہو گی۔ جس وقت کہو گی میں تمہیں اس نام نہاد بندھن سے آزاد کروں گا۔“

نازش نے بے ساختہ نظر سے اٹھا کر حواد کی طرف دیکھا۔ اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں کچھ ایسی کیفیت تھی کہ حواد نظر سے چمٹنے پر مجبور ہو گیا۔ نازش نے بھی ذرا دیر بعد نظر سے پھیر لیں۔

”گھروالوں کا اتنا سخت رویہ نہ ہوتا تو میں بھی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں ہوتا۔ مگر۔۔۔“ اس نے گہری سانس لی۔

”خیر انہوں نے تو ہمارے لئے کچھ اچھائی سوچ کر فیصلہ کیا تھا مگر وہ شاید ہمارے حق میں اچھا نہ ہوتا۔ ہم ایک دوسرے کے لئے نہیں بنے۔ ہمارے راستے الگ ہیں۔ منزل جدا ہے تم بہت اچھی ہو نازش۔ ایسا پارٹنر ڈیڑھ رو کر تھی جو جو مکمل طور پر تمہارا ہو۔ تمہیں تمہاری ساری خوبیوں، خامیوں سمیت چاہیے اور جب تمہیں ایسی ہستی مل جائے تو دیر نہ کرنا۔ میری طرف سے تم آزاد ہوگی۔ اپنے ہر فیصلے کی مکمل عمار ہوگی۔“

حواد نے اس کی طرف دیکھا۔ نازش سر جھکائے بیٹھی تھی۔ وہ اس کے چہرے کے تاثرات تو نہ دیکھ سکا مگر اس کے سیاہ بالوں میں چمکتی ہوئی سیاہ مانگ پر اس کی نظریں جم کر رہ گئیں۔ ان میں جیسے افٹاں کی چمک سی ہوئی۔ ایک لمحے کو دل ٹال میں ڈوبا۔

یہ لڑکی۔ اس کی منگو حتمی۔ اس نے اس کی مانگ میں افٹاں بھری تھی۔

نکاح کے وقت۔ وہ بہت چھوٹی سی تھی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے بالوں کو بچوں میں بکڑ مگر بڑی مشکوک سے مانگ نکالی گئی تھی اور وہ خود اس وقت لڑکپن میں ہی تھا مگر اسے اچھی طرح یاد تھا۔ یہ ان کے گھرانے کی رسم تھی۔ وہ اس کی مانگ میں افٹاں بھرتے ہوئے شرمناک تھا۔ کسی طرح اچھا آگے نہیں بڑھا رہا تھا۔ آخر کار تانوں نے اس کا ہاتھ بکڑ کر یہ دم کروائی تھی۔ اس وقت وہی منظر آنکھوں کے سامنے تھا۔

اس نے اس لڑکی کی مانگ میں اپنے نام کی افٹاں بھری تھی۔  
”اور کچھ؟“ چنانچہ نازش نے سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔  
”نہیں۔ کچھ نہیں۔“ وہ چمک کر سنبھلا۔  
”بس اپنا خیال رکھنا۔“

”اور آپ پتا نہ دے دیا کہ گاہ۔“ وہ مسکرائی اور اپنی جگہ سے اٹھی۔  
”تمہیں یاد دلانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“ وہ بھی مضبوطی سے کہنا اپنی جگہ سے اٹھ

لاہور۔

”کل تمہاری فلاح کس وقت ہے؟“

”مطلی صبح پانچ بجے۔“

”اوکے۔ پھر اللہ حافظ۔ آئندہ ملیں گے اچھے دوستوں کی طرح۔“

حواد نے ہلکے سے اس کا رخسار چھوا اور ہاتھ لٹکایا۔ نازش نے آنکھ میں آیا آنسو بے دردی سے صاف کیا۔

”پتہ نہیں۔ میں تمہیں بھول پاؤں گی کہ نہیں۔ تم نے نازش کو مار دیا ہے حواد۔ بے موت مارا ہے۔“

☆.....☆.....☆

اور اب سات سال بعد حواد وہیں لوٹ آیا تھا۔ تنہا، خالی دل، تنہا دامن میلا سے شادی کے کچھ دنوں بعد وہ دونوں ایشینس چلے گئے تھے۔ یہ شادی سال بھر بھی نہ چل سکی تھی۔ میلا کے بڑی ماں باپ کو بیٹی کا ایک مسلم سے شادی کرنا غرض نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کی انتہا سے زیادہ غلغلہ اندازی نے دونوں میاں بیوی کے درمیان نہ مٹنے والے اختلافات پیدا کر دیے۔ شادی تو ختم ہوئی سو ہوئی۔ ایک طویل عرصے تک حواد قانونی جنگیں لڑا رہا۔ میلا کے دعوے ان نفقہ نے اسے اپنی پائی کھٹانے کر دیا۔ اپنا سب کچھ لوٹا کے وہ وطن لوٹ آیا۔

مرحان ملک کا پورشن ابھی تک لاکھ پڑا تھا۔ حواد کی ہمت نہیں پڑی تھی ان کے بارے میں اپنی ماں سے کچھ پوچھنے کی پچھلے سات سالوں میں وہ گھر والوں سے تقریباً کٹ کر رہ گیا تھا۔ اس دوران صرف ایک بار ماہ نور اور راضی کی شادی کے موقع پر وہ تنہا ہی بہت مختصر عرصے کے لئے آیا تھا۔ مرحان ملک اور ان کی بیگم شادی میں شرکت کے لئے ایک ہفتہ کے لئے آئے تھے۔ دونوں کی رہی سی ملاقات رہی تھی۔

اور اب اسے آئے ہوئے دو دن ہو گئے تھے۔ سب لوگ ریمز کے بیٹے کے حقیقی کی غریب کے طبقے میں آئے مصروف تھے کہ حواد کو کسی سے فرصت میں بیٹھ کر بات کرنے کا موقع ملے گا تھا۔ وہ جانتا چاہتا تھا۔ نازش کہاں تھی؟

اور آج تقریب کے موقع پر سات سال کے طویل عرصے کے بعد نازش کو دیکھ کر وہ فوراً ہانپ گیا۔ وہ بھی نہ پایا تھا۔ کس قدر بدل گئی تھی وہ۔



نازش کے پاگل خانے میں سوچنے کے لئے بیٹھا جو نہیں۔  
 "رمیز میں کتنے کراہنے والوں کی کھوپڑی کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے۔" وہ اپنے پرانے  
 از میں لوٹ آئی۔

"آپ بھائی دیکھا۔ یہ ہے ان کا طریقہ کار۔" وہ حاد سے ثابت کروانے والے انداز میں  
 "مریض کو تھمبیا دینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ تو نازش کی شکل دیکھتے ہی بے ہوش ہو جاتا  
 ۔۔۔ بس پھر ایک کرائے کا تھما اور مفت میں کام تمام۔"

"ویری فنی" وہ ناراضگی سے اتنا ہی کہہ سکی۔ جیسی عمران گیلانی جانے کو کھڑے ہوئے۔

"چلو بھئی نازش رات بہت ہوگئی۔ اب چلا جائے۔"

"آپ کہاں جا رہے ہیں ماموں جان؟" ہاتھ حاد کے منہ سے لگاوا۔

"اپنے گھر۔" وہ مختصر جواب دے کر آگے بڑھے۔

"اپنے گھر۔" حاد نے حیرت سے ہلکے سے دہرایا۔

"ان کا گھر تو ہمیں اس کوٹھی میں تھا مگر....."

سب لوگ ان کے ساتھ ہی اٹھ گئے تھے۔ حاد بھی انہیں باہر تک چھوڑنے آیا۔ ان کے  
 انہوں نے ہی اس نے رانچل سے پوچھا۔

"ماموں بیرون ملک سے کب آئے اور یہاں اپنے گھر میں کیوں نہیں رہتے؟"

"وہ تو تو ابھی پچھلے پچھلے ہی نازش کے ساتھ واپس آئے ہیں۔ البتہ شاہزیب اور صمد پچھلے  
 سال سے بڑی امی کے ساتھ ہیں۔ رہ رہے تھے۔ مگر وہ دونوں بھائی اس کوٹھی میں سب کے  
 تھوہر بنائیں چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے آتے ہی شہر کے مضافات میں ایک بنگلہ خریدا  
 ۔ مفت ہونے کے بعد قریبی پلاٹ پر ایک میڈیکل کالج کی تعمیر شروع کرا دی۔ عمارت  
 باکمال ہو چکی ہے۔ مغرب اس کا افتتاح ہونے والا ہے۔ نازش کا انتظار تھا۔ بس۔"  
 رانچل نے تفصیل جان کر حاد نے طویل سانس لی۔ جانے کیوں ایک پچاس سی گز کوٹھی  
 ۔۔۔

"شاہزیب اور صمد میل جول بھی رکھنا نہیں چاہتے کیا؟ مجھے دونوں نظر نہیں آئے۔"

"نہیں خیر ایسا کچھ نہیں ہے۔" رانچل نے جلدی سے وضاحت کی۔ شاہزیب تو چنڈی گیا  
 ۔۔۔ سسرال ہے وہاں اس کی۔ اس کی سالی کی شادی ہے۔ بڑے ابوجی گل جانے والے

وہ دوشیزگی۔ وہ البزین۔ گزرتے ماہ و سال نے اس سے چھین لیا تھا۔ مگر ایک دلہا  
 کشش ایک دلکش سادہ رقص دیا تھا۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین ہو گئی تھی۔

اتحاد سے گردن اٹھائے مناسبت سے ہر کسی سے بات کرتی۔ اپنے باپ کے پیلو میں  
 وہ حاد کو اپنی دھڑ سے بہت دور جاتی لگ رہی تھی۔

وہ اب بھی اس کی ہی تھی مگر لگ رہا تھا جیسے اس کی ندری تھی۔

حاد جس جگہ بیٹھا تھا۔ رو رہ کر اس کی نظرس نازش کی طرف اٹھیں۔ مگر نازش نے بھول  
 بھی اس پر نگاہ نہیں ڈالی تھی۔

سب مہمانوں کے جانے کے بعد ہاتھ خرا سے ان کے قریب بیٹھے کا موقع ملا تھا۔ سر  
 لوگ تھک جانے کے باوجود خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ بڑے عرصے بعد اکٹھے ہوئے تھے۔

"تم آج کل کیا کر رہی ہو نازش؟" حاد نے مخاطب کرنے میں پہل کر رہی ڈالی۔

"یہ بگڑنے ہوئے دماغوں کو درست کرنے کی تیاری کر رہی ہے آج کل۔" جواب دہ  
 نے دیا تھا۔

"رمیز؟" نازش نے خفا ہو کر اسے ٹوکا۔

"ایک بیٹے کے باپ بن گئے ہو۔ بات کرنا ابھی تک نہ آئی تھیں۔"

"کیوں میں نے کیا غلط کیا؟" وہ بگڑا۔

"کبھی نہیں سہجھو گی۔"

حاد نے ہنسنے والے اتحاد میں دونوں کی طرف دیکھتا رہا۔ رمیز نے اس کی مشکل آسان کی۔  
 "یہ بی بی۔ خیر سے بخیر دوسرے جن بن گئی ہیں۔ پاگل خانے میں بھرتی کا کھلا دعوت ہے،

جاری کر دیا ہے مگر پاگلوں کو بھی اب اتنی عقل آگئی ہے کہ نازش کے پاگل خانے میں بھرتی ہونے  
 سے پہلے ایک بار سوچیں گے ضرور۔"

رمیز کے بیٹے نازش نے دانت پیچے۔ حاد بے اختیار ہنسا۔ اور رمیز نے نازش کی طرف  
 دیکھے بغیر جان جاری رکھا۔

"تو اب یہ کرتی کیا ہیں کہ مریض کی کھوپڑی کھول کر بیٹھا باہر نکال کر میز پر رکھ دیتی ہیں،  
 زیادہ تر واپس رکھنا بھول جاتی ہیں وہ تو ان کے خاندان کے ہاتھ لگ جاتا ہے۔ نتیجہ میں اپنے  
 کے لوگوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے اب وہ کہاں جائیں گے؟"

"کس خوشی میں؟" وہ بولی تو اپنے آپ سے تھی۔ مگر ڈاکٹر زرمین نے سن لیا تھا۔  
 "آج آپ کا پہلا دن ہے۔ اپنے کلینک میں۔ اسی خوشی میں نیک خواہشات کے ساتھ۔"  
 "وہ خود آئے تھے؟" نازش نے سرسری انداز میں پوچھا۔  
 "جی کافی دیر آپ کا انتظار کیا۔ ابھی دس منٹ پہلے گئے ہیں۔" نازش نے وارڈ  
 بوائے کو بلایا۔

"یہ پھول باہر جا کر کوریڈور میں سجادہ یا مریضوں میں بانٹ دو۔ یہاں سے جتاؤ فوراً"  
 وہ اتنی ترقی میں تھی اور اس قدر عجیبہ تھی کہ ڈاکٹر زرمین کو کچھ اور پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی  
 اس نے فوراً ہی اپنی ڈیوٹی سنبھالی اور اس دن کی اپائنٹمنٹ کی تفصیلات دیے گئی۔  
 کل شام بیڈ بیکل کیمپلیس کی افتتاحی تقریب میں خاندان کے سب افراد نے شرکت کی  
 تھی۔ سوائے حماد گیلانی کے۔

نازش نے نہ تو اس کا انتظار کیا تھا اور نہ ہی اس کو ایسا کوئی گمان تھا کہ وہ حماد راہی کی کوئی  
 کوشش کرے گا۔ اپنی طرف سے اس نے سب کچھ برسوں پہلے ختم کر دیا تھا۔  
 "مگر حماد بذات خود نہ صرف آیا تھا۔ بلکہ اس نے نازش کا انتظار بھی کیا تھا۔"  
 "کس لئے؟" اس نے سگ کر سوچا۔

"وہ تمہارا شوہر ہے۔" دل نے لہک کر جواب دیا۔ اس سے جو تعلق ہے جو رشہ جڑا ہے  
 اس حقیقت کو تم جھٹلا نہیں سکتیں۔ اور مان لو کہ تم جی اسے بھول نہیں پائیں۔  
 نازش نے دونوں ہاتھوں سے کنپٹیاں دبائیں۔

"کیا بات ہے۔ ڈاکٹر۔" ٹپ کی طہنیت ٹھیک ہے۔ "ڈاکٹر زرمین کافی دیر سے اس کے  
 چہرے کے اتار چڑھاؤ اور غصے اور رخ کی ٹلی جلی کیفیت کو جانچ رہی تھی۔  
 "میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ چھٹ کو بلائیں۔" وہ سنبھل کر پوری طرح مستعد ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

"میں نے جسبیں دہش کیا تھا۔ کم از کم شکر یہ تو ادا کر تیں۔"  
 "رات کے بارونچ رہے تھے اور وہ اپنے کمرے میں سونے کے ارادے سے جانے کو ابھی  
 تھی۔ جب یہ ٹیلی فون کی بیل پر پاس گزرتے ہوئے نازش نے ریسیور اٹھا لیا اور اس کے پیلو کہتے  
 ہی حماد نے ادھر سے حکایت کر دی۔"

تری یادوں کے گلاب  
 ہیں۔ شادی میں شرکت کرنے اور صحتخواری دیر کے لئے آیا تھا۔ اسے کسی اور ڈنر پر بھی جانا تھا۔  
 تم سے ملاقات نہیں ہوئی۔ دادو کے پاس ہی تو بیٹھا ہوا تھا۔"  
 حماد کو یاد آیا۔ اسے شک تو ہوا تھا مگر وہ کچھ کر، صحتی لائق سے بیٹھا تھا کہ حماد کو پانا پنا  
 بدلتا پڑا تھا۔

"نہیں میں نے اسے پہچانا نہیں۔ شاید وہ بھی مجھے پہچان نہیں سکا۔ ایک طویل عرصہ بھی  
 گزر گیا ہے۔ سب لوگوں کو بھڑے ہوئے۔"  
 حماد کے لہجے میں یاسیت تھی۔ جب سے واپس آیا تھا ایک لہلہ میں مگر ہوا تھا۔  
 "مگر اب سب ہی واپس لوٹ آئے ہیں۔ تم، بے ابو، اپنی پوری فیملی سمیت۔" رانا  
 نے بے ہمتی سے کہا۔

"دادو اس وقت جتنی خوش ہیں۔ پچھلے کئی سالوں میں میں نے انہیں اتنا خوش نہیں دیکھا  
 ان کی سب اولادیں ان کی نظروں کے سامنے ہیں۔"  
 "مگر ان کی جیتنی تو ان کی نظروں کے سامنے نہیں۔" وہ افسردگی سے مسکرایا۔  
 "کون جیتتی؟" رانا جیل سمجھا نہیں تھا۔

"وہ نازش" اس کا نام لینے ہی نظروں میں اس کی صورت محو مگی۔ حماد کے لبوں پر وہ  
 مسکراہٹ تھی۔

"ہاں۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔" رانا جیل نے حماد کی طرف خاص طور سے دیکھا۔ وہ بکھر رہا تھا۔  
 لگ رہا تھا۔

"مگر دادو اسی میں خوش ہیں کہ وہ ان کے شہر میں تو ہے۔ چند میلوں کے فاصلے پر۔"  
 "اور اب یہ فاصلہ جیت جاتے گا۔ نازش کو اس گھر میں آنا ہوگا اور میں اسے ہر صبح  
 میں واپس لے کر آؤں گا۔" حماد نے ایک عزم سے سوجا۔  
 "یہ بھول گئی نے جیسے ہیں؟"

"نازش نے اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی سرخ گلابوں سے اپنی میز بھری دیکھی۔  
 جیسے والے کا کوئی کارنامہ یا کارپٹ کراچی اسٹنٹ ڈاکٹر زرمین سے پوچھا۔  
 "مسٹر حماد گیلانی تے۔" وہ مسکرائی۔  
 ایک چل کو نازش کا دل دکا پھر جیسے سارے بدن میں گرم ہی لہر دوڑی۔

”شکریہ۔ ویسے اس کی ضرورت نہیں تھی۔“ اس نے عام سے لہجے میں کہا۔

”ضرورت تھی یا نہیں تھی تم اس کے چکروں میں نہ پڑو۔“ تو وہ بے تکلف ہوا۔

”خیر یہ بتاؤ۔ ان بچاروں کا حشر کیا ہوا۔ ڈسٹ بن کی نذر ہو گئے کیا؟“

”پھولوں کا کیا قصور تھا جو میں انہیں ڈسٹ بن میں پھینکتی۔ ویسے بھی اتنے خوبصورت پھول پھینکے کیلئے نہیں ہوتے۔“ نازش نے اسی ناراضی ٹون میں کہا مگر حواد کو جیسے خوش فہمیوں نے گھیر لیا۔

”اوہو۔ تو تم نے انہیں اپنے کمرے نہ جایا۔“ وہ الٹ کر بولا۔

”نہیں“ نازش کے بدن میں گرم ہلچل مچ گئی۔ مگر بڑے تحمل سے بولی۔

”ان کے صحیح مقام تک پہنچا دیا۔“

”مطلب؟“ وہ سمجھا نہیں۔

”مریضوں میں بانٹ دیئے۔“ وہ اسی انداز میں بولی۔

حواد لکھے بھر کو بالکل خاموش رہ گیا۔

”نازش میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“ ذرا دیر بعد وہ دھیرے سے بولا۔

”میری اسسٹنٹ سے اپائنٹ لے لیجئے۔“ ترت جواب دیا۔

”میں پاگل نہیں ہوں۔“ وہ بھنکا گیا۔

”نہ مجھے اپائنٹمنٹ کی ضرورت ہے۔“

”میں صرف پاگلوں کو تو نہیں دیکھتی“ وہ ہلکے سے ہنسی۔

”بہت سے ہوش مندوں کو بھی علاج کے لئے میرے پاس آنے کی ضرورت پڑتی ہے۔“

اب وہ صاف مذاق اڑا رہی تھی۔

”میں ہوش مندوں میں سے نہیں ہوں“ وہ فحشا ہوا۔

”اور تم سمجھ کر بھی انہیں نہ سو۔“

نازش بھی بخیر ہوئی۔

”آپ گھر آ جائیے کسی دن بھی میں رات نو بجے کے بعد گھر پر ہی ہوتی ہوں۔“

”میں.....“ وہ حیرت زدہ ہوا۔

”گھر آ جاؤں؟“

”ہاں..... اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟“ وہ سادگی سے بولی۔

”ماسوں..... ممائی“ وہ زکا۔“ آئی میں، ان کو اعتراض نہیں ہوگا؟“

”انہیں اعتراض کیوں ہوگا۔ حواد۔ آپ ان کے بھانجے ہیں۔“

”میں ان کا داماد بھی تو ہوں۔“ حواد کے بتانے پر نازش خاموش رہ گئی دل میں جو نچال سا آیا۔

”اس رشتے کا حوالہ دیئے بغیر آپ ان سے کسی وقت بھی مل سکتے ہیں“ ذرا دیر میں ہی وہ اپنے اوپر قابو پا چکی تھی۔ مگر اس کے لہجے میں ہلکی سی لرزش حواد نے محسوس کر لی تھی۔

”اور میں اس رشتے کے حوالے سے ہی ملنا چاہتا ہوں۔“ حواد کے لہجے میں جو کچھ تھا۔ اس نے نازش کو سننے سے تپا دیا۔

”میں اپنے گھر کے علاوہ اور کہیں باہر آپ سے نہیں ملوں گی۔“ اس نے اپنا لہجہ خنڈا رکھنے کی کوشش کی۔

”نانو کے گھر بھی نہیں۔“ اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

”نہیں۔“ اس نے مضبوطی سے کہا اور آہستگی سے فون بند کر دیا۔

☆.....☆.....☆

”اب تم اتنی مصروف ہو گئیں کہ یوز می ڈاؤن سے ملنے کا وقت بھی نہیں رہا۔ تمہارے پاس۔“

”دادو۔“ نازش نے فی الفور ٹوکا۔

”آپ یوز می نہیں ہوئیں“

”کتنے دن ہو گئے شکل نہیں دکھائی۔“ وہ اور فحشا ہوئیں۔ انہوں نے نازش کے ٹوکے کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔

”کوئی فرق نہیں آیا میری شکل میں۔“ اطمینان رکھیں ویسی کی ویسی ہوں؟“

”اچھا بس بات نہ ٹالو۔“ انہوں نے ڈراستی سے ڈائنٹ دیا۔

”یہ بتاؤ کب آرہی ہو۔ آج یا کل“

”آج یا کل۔“ وہ سوچ میں پڑی۔

”مشکل ہے دادو۔ آپ آ جائیں میں میرے پاس بلکہ اب میرے پاس ہی رہا

کریں۔“ نازش نے ہمیشہ کی طرح ضد کی۔



مگر نازی بیگم بھی ایک اہل خانہ تھیں۔

”میں اپنا گھر نہیں چھوڑ سکتی۔ ایک دن بھی میرا دادو کہیں دل نہیں لگتا۔ میری مجبوری سمجھو۔

بس کل تم کو آتا ہے۔ میرے لئے وقت نکال کسی طرح۔“

”اچھا دادو۔ کوشش کرتی ہوں۔“ وہ مری ہوئی آواز میں بولی۔

”کوشش نہیں“ انہوں نے فوراً بولا۔

”کل تم کو کچھ میرے ساتھ کرنا ہے۔ میں انتظار کروں گی۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“ نازش کو بھینسا ڈالنے پڑے۔

”مگر رات تک نہیں رگوں کی شام کو مجھے ہاسٹل جانا ہوگا۔ ابھی بتا رہی ہوں پھر ناراض

مت ہوئے گا۔“

”تم آؤ تو سہی مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔“

”دادو کے اداوے خطرناک لگتے ہیں۔“ نازش نے فون بند کرتے ہوئے گہری سانس بھری۔

”اور مسٹر حاد۔ تم کسی خوش فہمی میں نہ رہنا۔ دادو کی میٹرنگی بنا کر مجھ تک پہنچنے کی ہر کوشش

نا کام ہوگی تمہاری۔“

دوسرے دن وہ مریضوں سے فارغ ہوتے ہی دادو کے پاس چلی آئی کوشش کے باوجود

اسے دیر ہوگئی تھی۔ نازی بیگم جلدی کھانا کھانے کی عادی تھیں۔ مگر اس کے انتہا میں اب تک

ہوئی بیٹھی تھیں۔

”آپ نے کھانا کھالیا ہو دادو۔“ نازش نے شرمندگی سے کہا۔

”کیسے کھالیں؟“ جھپٹیں کھانے پر بالیا تھا۔ تمہارا انتہا نہ کرتی“ انہوں نے بڑی محبت

سے کہا۔

”چلیں پھر قافٹ شروع کریں۔ اور سب لوگ کہاں ہیں دادو؟“ اس نے ہر طرف نظر

دوڑائی کھانے کی میز پر صرف وہی دونوں تھیں۔

”میں نے صرف جھپٹیں انوائٹ کیا تھا۔“

”اور۔۔۔ اور میں بھی وقت پر نہیں پہنچ سکی۔“ وہ نے سر سے شرمندہ ہوئی۔

”کیا کروں دادو۔۔۔ میرے ساتھ تو یہی مسئلہ ہے ابھر جیسی ہو جائے تو نہ کھانے کا وقت

ہوتا ہے نہ ہوش۔“

”جی تو صحت کا یہ عالم ہے۔“ وہ بیڑا ہوئیں۔

”ہائیں۔ میری صحت کو کیا ہوا۔ اچھی بھلی تو ہوں۔“ وہ حیران ہوئی۔

”خاک اچھی بھلی ہو۔ رنگ کتنا کم ہو گیا ہے تمہارا لہندہ سے آئیں جس تو کیا گھالی گھالی

دندا ہوا چہرہ تھا۔ اور اب؟ آئینہ دیکھتی ہو؟ حلقے پڑ رہے ہیں آنکھوں کے گرد جانے نیند بھی پوری

لینی ہو پائیں۔“

”کچھ نہیں ہوا دادو۔۔۔ آپ بلا وجہ پریشان ہو رہی ہیں۔ وہ پوری طرح کھانے میں

گمنم تھی۔

”پیت بھر کر کھاتی ہوں۔ کھڑے بچ کر سوتی ہوں۔ رنگ آپ کو اس لئے کم لگ رہا ہے

کہ یہ جو شیرکی فضا میں آلودگی ہے ناں۔ اس کی ایک تہہ جی ہوئی ہے اس وقت میرے چہرے پر

اور حلقے شاید اس لئے پڑ گئے ہیں کہ کل رات میں سوئیں سکی ایک مریض بہت کرٹیکل کنڈیشن

میں تھا۔ مگر آ کر بھی اس کی نگر میں سوئیں سکی۔ اب اس وقت کہیں جا کر اس کی حالت ایشیال

ہوئی۔ مجھے سکون ہوا۔ تو بھوک بھی لگ رہی ہے اور نیند بھی آ رہی ہے۔ نہ بدست۔“

نازش ان سے نظریں ملانے بغیر پوچھ رہی تھی اور نازی بیگم کھانے سے ہاتھ روکے اس کا چہرہ

دیکھتی رہیں۔ پھر گہری سانس بھر کر انہوں نے پلیٹ سے ایک لقمہ اٹھایا۔

”ٹھیک ہے کھانا کھا کر سو جانا۔ شام میں اٹھو گی تو بات کریں گے۔“

”کیا بات کریں گے دادو۔ بولیں ناں۔۔۔ میں سن رہی ہوں۔“ اس نے لا پرواہی

سے کہا۔

”کھانا تو کھا لو۔ اطمینان سے۔“

”کھا رہی ہوں دادو۔۔۔ ابھی میری کال آگئی اور جانا پڑا تو آپ پھر ناراض ہو

جائیں گی۔ بات کر لیں ابھی۔“ وہ جلدی کا شور مچا کر انہیں ٹاننا چاوری تھی۔ اور وہ بھوری تھی۔

فوراً اصل بات پر آ گئیں۔

”مجھے تہہ دی بڑی نگر رہتی ہے۔ نازش اپنے لئے کچھ سوچا ہے تم نے؟“

”اتنی مصروف زندگی گزر رہی ہے۔ سوچنے کیلئے وقت کہاں ملتا ہے۔ دادو۔۔۔“ وہ دم

لجے میں بولی۔

”تو سوچنے کیلئے وقت نکالو بیٹا۔“ وہ آزدگی سے بولیں۔

تری یادوں کے گلاب  
 "زندگی بہت مختصر ہوتی ہے اور اس کی خوشیاں اس سے بھی کم۔ میں تمہیں ہنستا ہستا اور خوش  
 دیکھنا چاہتی ہوں۔"

حماد نے آپ سے کچھ کہا ہے۔ "دارو؟" وہ بھی صاف گوئی پر اتر آئی۔  
 "نہیں اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ مگر میں جانتی ہوں کہ اس کے دل میں کیا ہے۔ اور وہ  
 خود کہنے کی ہمت نہیں کر پارہا۔"  
 "سات سال پہلے تو انہوں نے بڑی بہادری دکھا کر اپنا فیصلہ آپ کو سنا دیا تھا۔" وہ سرد  
 انداز میں بولی۔

"وہ اور وقت تھا اور، اور ہی بات تھی۔ اب وقت کی ڈور اس کے ہاتھ میں نہیں ہے۔  
 بچپن تو اسے اور شرمندگی نے اس کی ہمت توڑ دی ہے۔ سچے دنگی ہوں، پریشان ہوں تو ماں تڑپ  
 جاتی ہے۔ عرفانہ بھی بیٹے کے دکھ پر تڑپ گئی ہے۔ حالانکہ حماد نے ماں سے بھی کچھ نہیں کہا ہے۔"  
 "تو آپ بھی وعدہ کریں دارو وہ سب نہیں کریں گی آپ۔" وہ قطعی انداز میں بولی۔  
 "تو کوئی تو پہل کرے گا ماں میرے سچے۔" انہوں نے پیار سے سمجھایا۔  
 "مگر آپ نہیں۔" اس نے سختی سے ٹوکا۔ "حماد کو ہمت کرنے دیں۔ پہل وہ کریں گے اور  
 جب وہ آپ سے اپنی ماں سے کہنے کی ہمت کر لیں تو ان سے کہئے گا مجھ سے بات کریں۔ فیصلہ  
 میں کروں گی۔"

نازش کی آنکھیں بھرا آئیں جس مگر اس نے کمال خوبی سے آنسو لیے۔  
 "فیصلہ تم ہی کرو گی تمہیں پورا اختیار ہے۔ بس میری ایک بات دھیان میں رکھنا۔  
 کیا وقت واپس نہیں آتا۔ حماد نے لوٹنے میں سات برس لگا دیے۔ اب تم فیصلہ کرنے  
 میں سات برس نہ لگاؤ۔"  
 "میں کسی کا ارہار نہیں رکھتی جلد ہی چکا دوں گی۔" اس نے گھاس اٹھا کر گھونٹ گھونٹ  
 پانی پیرا۔

نازی بیگم کی شکل دیکھتی رہ گئیں نازش کا اس بات سے کیا مطلب تھا۔ وہ کچھ کچھ  
 رہی تھیں۔ دل انہا نے خدشے سے گپ اٹھا۔ مگر کچھ کہہ نہ سکیں۔

☆☆☆☆

تم اگر مجھے انعام کرو جتنی کا تم مانو سے لئے آ رہی ہو تو میں گھر پر ہی رک جاؤ۔

تری یادوں کے گلاب  
 رات کو حماد نے اسے فون کیا اور چھوٹے ہی شکوہ کر ڈالا۔  
 "مجھے نہیں معلوم تھا کہ دارو نے اکیلے مجھے انوائٹ کیا ہے۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ سب گھر  
 والے ہی موجود ہوں گے۔" اس نے بڑے سکون سے کہا۔ حالانکہ دماغ تو کھول اٹھا تھا اس کی  
 اپنائیت بھری شکایت پر۔

"مانو بھی بس اپنے نام کی ایک ہی ہیں۔" وہ دھیرے سے ہنسا۔  
 "تمہارے ساتھ تمہارے گھر والے کو بھی انوائٹ کر لیتیں تو کیا کچھ جاتا نا۔" اس نے  
 گھر والے پر زور دے کر کہا۔

نازش خاموش رہی۔ کوئی جواب نہ پا کر وہ عجیبہ ہوا۔  
 "نازش میں تمہیں انوائٹ کر رہا ہوں۔ کل رات ڈنر میرے ساتھ کرو۔ مگر یہ یا کہیں باہر  
 جہاں تم چاہو۔"

حماد! میرا خیال ہے کہ میں آپ کو پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ میں آپ سے باہر کہیں  
 نہیں ٹھوکی۔ "وہ دھیرے دھیرے میں مگر مضبوطی سے بولی۔  
 "ٹھیک ہے۔" وہ فوراً مان گیا۔

"تو گھر پر رکھ لیتے ہیں۔ میں چک کر لوں گا تمہیں کس وقت فارغ ہوں گی۔"  
 حماد کی اس کج ادائیگی پر نازش کو بری طرح ناؤ آیا۔ اس کی بات کا مطلب سمجھ کر بھی وہ  
 اجماع بن رہا تھا۔

"حماد میں اتنی بالاعتبار نہیں ہوں کہ اپنے بچہ ٹرس کے علم میں لائے بغیر آپ کے ساتھ ڈنر  
 کے پروگرام طے کرتی پھر دوں۔" وہ بھڑک کر بول اٹھی تھی۔  
 "خیر یہ تو نہ کہو۔" وہ دھیرے سے ہنسا۔

"تم سختی بالاعتبار ہو اس کا مظاہرہ تو تم سات سال پہلے اپنے شوہر کو دوسری شادی کی  
 اجازت دے کر چکی ہو۔"

نازش چپ کی چپ رہ گئی۔ حماد کو خود ہی احساس ہوا اس نے تھوڑے وقت پر تھوڑے بات کہہ دی۔  
 "سواری میرا مطلب تمہیں برٹ کر نہیں تھا۔ میں تمہیں صرف یہ احساس دلانا چاہتا تھا  
 کہ حماد ارشد برقرار ہے۔ ہم ساری زندگی ریل کی پٹریوں کی طرح متوازی چلتے چلتے نہیں گزار  
 سکتے۔ ہمارا ملنا ایک دوسرے سے بات کرنا بہت ضروری ہے۔" اس نے تھوڑے ہی لمحے میں دوس کی "؟"

”او کے میں گل طارغ ہوتے ہی آپ کو کال کروں گی۔ آپ میرے ٹیکسٹ پر آجانیے گا۔“ نازش نے مزید بات کے بغیر فون بند کر دیا۔

اس نے حماد کے ساتھ جانے کی حالی نہیں بھری تھی۔ اپنے ماں باپ کو امتحان میں لے بغیر وہ کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتی تھی۔

اور حماد کیلئے تو اتنا ہی کافی تھا کہ بلا خروہ اس کی بات سننے کے لئے تیار ہوگئی۔

رات کو کھانے کے بعد وہ سب ل کر بیٹھے تھے۔ ایک اصول بنالیا گیا تھا کہ گھر کا ہر فرد دن بھر کی تھکا دینے والی روشنی سے گزر کر فریڈ کے کچھ لمبے باقی سب گھر والوں کے ساتھ گزارے اسی وقت ہر طرح کے موضوع اور مسئلے زیر بحث لائے جاتے تھے۔ آج نازش نے اپنا مسئلہ ان سب کے سامنے رکھا۔ حماد کوئی فیصلہ چاہتا تھا۔ اور وہ ان سب کی رہنمائی کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتی تھی۔ سب نے ایک زبان ہو کر کہا تھا۔ نازش کا کوئی بھی فیصلہ ان سب کا منظور ہوگا۔

”ہم جیسے ہر حال میں خوش دیکھنا چاہتے ہیں بس۔ تم حماد سے علیحدگی کی چاہتی ہو تو اس کے لئے ہم سارے خاندان سے لڑنے کیلئے تیار ہیں اور اگر تم حماد کے ساتھ آ سکو ساری زندگی گزارنے کا فیصلہ کرو تو اس سے بڑھ کر ہمارے لئے خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ اب فیصلہ ضرور ہو جانا چاہئے۔“ عمر ان کیلانی نے دسپہ بے الفاظ میں اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ اور نازش کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی۔ اس نے ماں کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”ایک بات دھیان میں رکھنا چینی۔ طلاق ایسی کاکیل نہیں ہے اور اس کے لئے بہت نفوس خرچ ہونی چاہئے۔ انتہائی ناگزیر حالات میں بھی فریقین کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ مصالحت ہو جائے تو بیکھرے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے ناپسندیدہ فعل طلاق ہے۔ اور یہ شیطان کا سب سے پسندیدہ مشغلہ ہے۔ میاں بیوی کے درمیان خفاق اور جدائی ڈالنا۔ اللہ ہم سب کو شیطان کے شر سے پناہ میں رکھے۔ اپنے دل میں وسعت پاتی ہو تو حماد کو معاف کر دو۔۔۔۔۔ ورنہ ہماری طرف سے تم پر کوئی دباؤ نہیں ہے۔“ ماں نے بھی اپنے دل کی بہت کبر دی تھی۔

”ای ٹھیک کہہ رہی ہیں نازش۔ حماد کا جرم ناقابل معافی نہیں ہے۔ وہ چاہتا تو وصیت کا مطالبہ کر دیتا مگر اس نے تمہاری خوشی کو نظر میں رکھا ہے اور جیسے فیصلے کا حق دیا ہے ہم لوگ بھی تم کو خوش اور آباد دیکھنا چاہتے ہیں۔ حماد کے لئے ہمارے دلوں میں کوئی کبیہ نہیں رہی۔ تمہارے

ساتھ اس کا جو رشتہ جزا ہے وہ ہمارے لئے قابل احترام ہے۔ تم کوئی بھی فیصلہ کسی دباؤ کے بغیر کر سکتی ہو۔“

دونوں بھائی بھی اپنے والدین کی موافقت میں بولے تھے۔ ان سب کی دلی خواہش نازش پر عیاں ہوگئی۔ وہ سب حماد کو معاف کر چکے تھے۔

معاف تو وہ بھی کر چکی تھی مگر۔۔۔۔۔ اس کا دل نہیں۔

جانے کیوں دل نہیں مانتا تھا۔ حماد نے اس کا دل اجاڑ دیا تھا۔ بے سوت مار دیا تھا۔ دل کی ہستی عجیب ہستی ہے۔ ایک بار آجڑا جائے پھر کبھی نہیں ہستی۔ ایک بار پھر وہ رات نازش پر بہت بھاری گزری۔

رات کے نو بجے کے قریب وہ قارغ ہوگئی تھی۔ حماد اس کے کال کرنے پر چند رو منٹ کے اندر پہنچ گیا تھا۔

”کہاں چلیں؟“ اس نے گھڑی سے اتر کر نازش کے لئے اٹھا دو واڑہ کھولا تھا۔ اور اپنی سیٹ پر بیٹھنے سے اس سے پوچھ رہا تھا۔

”جہاں سکون سے بات ہو سکے۔“ نظریں سامنے جمائے اس نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ حماد نے رخ اس کی طرف پھیر کر اسے بتور دیکھا۔ وہ تھکی تھکی سی لگ رہی تھی۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے نازش؟“ اس نے نرمی سے پوچھا۔

”یہاں ٹھیک ہے۔ بس رات ٹھیک سے سو نہیں سکی تھی۔“ اس نے بڑی صاف گوئی سے اقرار کیا۔

”میں بھی رات بھر نہیں سو پایا۔ کئی راتوں سے نہیں سو سکا ہوں۔“ وہ دودھیرے سے بولا۔

”میرے پاس تو ریزن تھا۔ آپ کیوں نہیں سوئے؟“ نازش نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

”کیا ریزن قاتل تھا؟“ حماد نے اس کا سوال نظر انداز کیا۔

”دو۔۔۔ ہے پر کھڑی ہوں۔“ وہ گہری سانس بھر کر بولی۔

”کوئی ایک راہ چننا آسان ہوتا ہے اور آگ کا دریا پار کرنا بہت مشکل میں نہانے کب سے جلی صراط پر چل رہا ہوں۔ اور اب تھک گیا ہوں۔“ اس کے لہجے میں تھک اتر آئی تھی۔

”راہ چننا اتنا آسان نہیں ہوتا۔“ وہ بھی اسی کے لہجے میں بولی۔



تری یادوں کے گلاب

فیصلہ کرتا تھا کھنٹھن نہیں ہوتا ہازش، میں جانتا ہوں۔ فیصلے کا انتظار کیسا جان لیوا ہوتا ہے۔  
 "سب کو اپنے اوپر بڑی آزمائش زیادہ کھنٹھن لگتی ہے۔" ہازش نے دھیرے سے کہہ کر زرخ  
 چھ لیا۔ حواد خاموش رہا تھا۔ ہازش نے بھی پھر اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ اس وقت چوکی تھی  
 چپ حواد نے گاڑی اس کے پسندیدہ ریٹینوونٹ کے سامنے روکی تھی۔ برسوں گزر جانے کے بعد  
 ہازش کو اب بھی یہاں کا کھانا بہت پسند تھا۔ اور یہاں کا ماحول بہت پرسکون تھا۔ وہ دونوں ہال کے  
 کونے میں چلے آئے جہاں پر نسبت زیادہ پرائیویسی تھی۔  
 "کیا کھاؤ گی؟" حواد نے مینو کا ردھ کھولتے ہوئے ہازش کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنے  
 ہارڈ کو چھوا بھی نہیں تھا۔

"کچھ خاص نہیں۔ آپ اپنی مرضی سے آرڈر کریں۔"

"یہ فٹل کا اظہار ہے تمہیں تمہاری مرضی کے خلاف ڈر پر لانے کا؟" وہ مسکرا کر اپنے کارڈ  
 پر جھک گیا۔

"نہیں۔" ہازش نے ایک نظر حواد پر ڈالی اور اپنی بائیں طرف دیکھے ہوئے اکوریم میں  
 جرتی دید و زیب مچھلیوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھنے لگی۔ جیسے ایک اسی کام کے لئے آئی ہو۔ حواد  
 چار ٹیکس کر رہا تھا۔

اسٹار میں تھا پیکن اور فریش گرین سلاو۔ مین کورس میں فرائیش اور بیماری کا کباب۔  
 "ہر کچھ؟" حواد نے اچانک نظر اٹھا کر ہازش سے پوچھا۔

ہازش اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں کچھ حیرت کچھ الجھن لئے۔  
 "نہیں۔" اس نے بے اختیار نظریں چرائیں۔

"تمہاری پسند میں بھولا نہیں ہوں۔" وہ اب دونوں ہاتھوں کی ٹمٹی پر غور ڈیٹکا سے پوری  
 غرائس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"یہ بھی یاد ہے کہ تم رات کو چاول نہیں کھاتیں۔ البتہ یہ نہیں جانتا کہ آنسکریم اور چاکلیٹ  
 سے فیت کا تمہارا وہی حال بن جائے۔" وہ ہلکے ہلکے انداز میں بولا۔

"نہیں۔ اب وہ حال نہیں رہا۔ چاکلیٹ تو بالکل چھوڑ دی۔" ہازش بھی اب کچھ ایذا بردار تھی۔  
 "یعنی اب تم واقعی بڑی ہو گئی ہو۔" حواد نے اسے چھیڑا۔  
 "مسلم اور سمارت بھی۔"

تری یادوں کے گلاب

"جناب میں سوئی کبھی بھی نہیں تھی۔" وہ سچی۔ "اور ویسے بھی اسٹارٹس کا راز آنس کریم اور  
 پاکلیٹ چھوڑنے میں نہیں۔"

"پھر کیا راز ہے۔ خوبصورت خاتون؟" اب وہ سوڈ میں آرہا تھا۔

"کم کم کھاتی ہوں۔۔۔۔۔ کم سوتی ہوں اور کام زیادہ کرتی ہوں۔"

"نانو کو تم سے یہ ہی شکایت ہے۔ تم اپنا ذرا خیال نہیں رکھتیں۔ ایک رکھوالے کی اشد  
 ضرورت ہے جسہیں۔ یہ نانو کا خیال ہے۔" ہازش کے چہرے کے تاثرات مجز تے دیکھ کر اس نے  
 نور اوضاحت کی۔

"میرا خیال رکھنے والے بہت ہیں۔" وہ خاص طور پر "بہت" پر زور دے کر بولی۔

"بہت۔۔۔۔۔ سے تو کام خراب ہو جاتا ہے۔" حواد بھی جو ہا ہی طرح بولا۔ "بس ایک کافی  
 دتا ہے۔"

"خراب کرنے کو وہ ایک بھی بہت سوں سے بڑھ کر ثابت ہوتا ہے۔" وہ اپنی بات پر بڑی دہی۔  
 "تم بہت بدل گئی ہو ہازش لیکن ایک عادت ابھی بھی ویسی ہی ہے۔" وہ شرارت سے مسکرایا۔  
 "بولتی بہت ہو۔ ضرورت سے زیادہ۔"

ہازش کی سوالیہ نظروں سے دیکھنے پر اس نے ہنس کر کہا۔ اور ویکری طرف متوجہ ہو گیا جو  
 انار زمرہ کر رہا تھا۔ ویکری سو جودگی میں ہازش خاموش رہی تھی۔

کھانا انہوں نے ادھر ادھر کی ہلکی پھلکی باتوں کے درمیان ختم کیا۔ کھانے کے بعد حواد نے  
 وہی مشکوئی تھی۔ ایک سپ لے کر اس نے ہازش کی طرف دیکھا۔ جس نے ابھی اپنے کپ کو ہاتھ  
 میں نہیں لگا یا تھا۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ حواد کی طرف اس کا بالکل دھیان نہیں تھا۔

"ہازش۔" حواد کے پکار نے پر وہ اپنے دھیان سے لگی۔ ایک نظر حواد کی طرف دیکھا۔ حواد  
 نے اسے اشارے سے کافی لینے کے لئے کہا۔ اس نے اچانک اٹھالیا تھا۔ ایک سپ لیکر وہ پھر گم  
 سم ہو گئی۔

"کیا سوچ رہی ہو ہازش؟"

"کچھ خاص نہیں۔" وہ ہلکے سے مسکرائی۔

"مجھے لگا۔ ماضی کی کوئی بات تمہیں اداس کر رہی ہے۔" وہ خوش فہم ہوا۔

"نہیں میں ماضی کو کفر آش کر بھل گئی ہوں۔" اس نے حواد کی خوش فہمی زداری کی۔

فراموش کر چکیں۔ اب اتنے عرصے بعد۔" اس نے خاموش ہو کر کندھے اُچکا۔

"اب اتنے عرصے بعد ہی تو میں اس ہوائت پر آگئی ہوں کہ آپ کے ساتھ زندگی بتانے کی خواہش کوئی اُننگ، کوئی امید ہی نہیں رہی میرے دل میں۔" وہ بڑے سکون سے بولی۔

"واٹ ہاں سنس" وہ بے اختیار جھٹکا گیا۔

"یہ کیا مذاق ہے نازش؟"

"مذاق نہیں حقیقت ہے۔" وہ خطرناک حد تک عجیبہ تھی۔

حماد اسے بے چینی سے دیکھتا رہا۔

"جسٹیس مجھ سے ذرا بھی محبت نہیں؟" کچھ دیر بعد وہ بولا۔

"محبت ذرا یا بہت سی نہیں ہوتی۔ یا تو ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔" اس کی سنجیدگی اور سکون میں ذرا فرق نہیں آیا تھا۔

"او کے، فائن" وہ زچ ہوا۔ "مجھے تم سے محبت ہے۔ شدید محبت۔ جس میں مجھ سے محبت ہے یا نہیں۔"

"کبھی تھی۔ بہت شدید محبت، بہت چاہا تھا میں نے آپ کو۔ آپ نے اس محبت کو مار دیا۔ میں برسوں روٹی ہوں۔ بہت تڑپتی ہوں اور جلتا خراپے آپ کو یہ یاد کرانے میں کامیاب ہو گئی کہ مجھے اپنی چوری زندگی آپ کے بغیر تھکا کرانی ہے۔ آپ کو اپنی زندگی سے نکالنا آسان اور ایک دن کی بات نہیں تھی۔ ان گزرے سالوں میں آپ سوچ نہیں سکتے کہ میں کس کس طرح گزری ہوں۔ کس طرح میں نے اپنے آپ کو مارا ہے۔ اپنے احساسات اپنے جذبہ بات کو بھند کیا ہے کچھ اس طرح کہ درپائے دل کا کوئی کونہ ویران پڑا ہے۔ کوئی خواہش سر نہیں ابھارتی۔ کوئی اُننگ نہیں جاگتی۔ میں آپ کا احترام کر سکتی ہوں۔ خدمت کر سکتی ہوں۔ آپ کی نسل پر وہاں جڑھا سکتی ہوں مگر۔ اس نے خاموش ہو کر گہری سانس بھری۔

"مگر آپ سے محبت نہیں کر سکتی۔"

حماد ایک سانے لڑکی کی حالت میں بیٹھا تھا۔ اس کی نظریں نازش کے چہرے پر جمی تھیں۔

پلٹکیں جھپکائے وہ اسے بے چینی سے تنکھتا رہا۔

"آپ نے کہا تھا میں کہ ہم ایک دوسرے کے لئے نہیں بنے۔ ہمارے راتے الگ ہیں، منزل جدا ہے۔ آئندہ ہمیں مجھے دوستوں کی طرح۔" وہ بڑے درد سے مسکرائی۔

"انجی بات ہے۔" اس نے سر ہلکا کرنا سید کی۔ "میں بھی اپنے تکلیف دہ ماضی کے سارے در بند کر چکا ہوں۔ نئی زندگی شروع کرنے کے لئے یہ بہت ضروری ہے۔ نازش! میں نے تمہیں فیصلے کا مکمل اختیار دیا ہے۔ مگر میں تم پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں Reconcile کے حق میں ہوں۔ نازش نے اس کی بات پوری توجہ سے سنی اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے بولی۔

"ماضی کو بھولی جا ہی بہتر ہوتا ہے۔ مگر مجھے امید ہے کہ آپ اپنا وعدہ نہیں بھولے ہوں گے۔"

"کون سا وعدہ؟" کپ واضح طور پر حماد کے ہاتھ میں لرز اٹھا۔

"ایک ہی وعدہ کیا تھا آپ نے اور کہا تھا کہ مجھے یاد دلانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

اب وہ نظریں تھکا کر اپنے کپ پر اٹھی پھر رہی تھی۔

"اوہ۔۔۔۔۔ اس ہوائت پر تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔" حماد نے کپ میز پر رکھا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہوا۔ ایک جھپکی سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں پر دم توڑا۔

"تمہارے گریز سے مجھے سمجھ لینا چاہئے تھا۔ مگر دل کو خوش فہم ہونے کی عادت سی پڑ گئی ہے۔ بھول گیا تھا کہ سات سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ درمیان میں ایسے فیصلے تو لکھوں میں بھی ہو جاتے ہیں۔ وہ چند ساتوں کے لئے خاموش ہوا۔ نازش پر ایک بھرپور جانمندی ہوئی نظر ڈالی۔

"تو کوئی اور اُچکا ہے تمہاری زندگی میں؟"

"ہیں۔۔۔۔۔" وہ بھڑک اٹھی۔

"نہیں تک سوچ جا سکتی ہے تم مردوں کی۔" حماد کے چہرے پر الجھن کے آثار ابھرے۔

"میں آپ سے منسوب ہوں حماد کسی اور کی جانب دیکھنے کی جرأت کیسے کر سکتی ہوں۔ نہ مجھے اس کی ضرورت تھی۔ میرے لئے تو کسی فیر کا تصور کرنا سببِ رواج ہے۔" وہ مشتعل سی ہو گئی تھی۔

"تو پھر؟" حماد نے سکون کا سانس بھرا۔

"اتنے سال بعد تمہیں یہ وعدہ یاد دلانے کی ضرورت کیوں پڑی جبکہ ہم Reconcile کی کوشش میں ہیں۔"

"ہم نہیں صرف آپ۔" نازش نے جھجکی۔

"او کے صرف میں۔" دوزخی سے بولا۔

"مگر تمہارے پاس کیا جواز بنتا ہے۔ علیحدگی کا۔ کوئی تیسرا درمیان میں نہیں۔ ماضی

تری یادوں کے گلاب

”میں نے آپ کے ارشادات کو پلو سے باندھ لیا۔ کسی وظیفہ کی طرح چوبیس گھنٹے ورد کا اور اپنے آپ کو تیار کر لیا کہ مجھے اب ساری زندگی اپنے والدین کے گھر اپنے بھائیوں کے پاس رہنا ہے کیونکہ یہ قوطے تھا کہ کسی اور کی کوئی گنجائش نہیں میری زندگی میں۔ تو اب وہی میرا گھر ہے۔ وہی میری فیملی ہے۔ وہ سب مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں اور مجھے خوش لاؤڈا باؤ دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان سب کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اگر میں آپ کے حق میں فیصلہ کرتی ہوں تو کیا آپ ایسی شریک حیات کو قبول پائیں گے جو جذبات و احساسات سے عاری محبت سے خالی وجود لے کر آپ کی زندگی میں داخل ہو رہی ہو۔ محبت کے بغیر زندگی کا لمبا سفر کاٹنا بہت مشکل ہے۔ یہ پل دو پل کا ساتھ نہیں۔ ساری عمر کا سورا ہے۔ آپ پہلے ہی ایک ناکام شادی کا دکھ جھیل چکے ہیں۔ سوچ لیجئے حواد۔ ہم جذباتی عمر سے گزر چکے ہیں۔ ہماری سوچ پختہ ہے ہم ہاشعور ہیں۔ آپ بھی سمجھتے ہوں گے کہ آپ کسی سے ذبردستی محبت نہیں کر سکتے۔“

بال حواد کے کورٹ میں پھینک کر وہ خاموش ہو گئی۔ تو حواد نے گہری سانس بھر کر کرسی کی پشت سے ٹپک لگا لی۔ دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھتے ہوئے وہ بھرپور انداز میں مسکرایا۔

”میں سمجھتا تھا کہ تم کافی عقلمند ہو گئی ہو۔ مگر تم تو دیکھی کی دیکھی ہو۔“

”کیا مطلب؟“ حواد کا خلاف توقع رد فعل اور اس کے ہنسنے نازش کو تباہ کئے۔

”مطلب یہ کہ میری بیانی سی بیوی۔“ نازش نے تڑپ کر بات کا لی۔

”اے کسکو زنی۔ میں آپ کی بیوی نہیں ہوں۔“

”اچھا۔“ اس نے بڑی دلچسپی سے اس کے چہرے کو دیکھا۔

”پھر کیا ہو؟“

”سو کا لڑ منگودہ۔“ اس نے ہنک کر بتایا۔

”اللہ اکبر۔“ وہ بے اختیار ہنسا۔

”تم نے میری ہر بات یاد رکھی ہے۔“ طعن پر طعن ماری ہو۔ کیسے کہہ سکتی ہو کہ مجھے بھول گئی ہو۔“

”میں نے بھولنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ صرف یہ واضح کیا ہے کہ۔۔۔۔۔؟“

”محبت نہیں کرتی اب۔“ وہ سچ میں سے اس کی بات لے لڑا۔

”پہلی محبت کبھی نہیں مرتی محبت مر ہی نہیں سکتی۔“

اس نے محبت پاش نظر دوں سے نازش کو دیکھا۔ وہ بھی روٹھی روٹھی اس کو دیکھ رہی تھی۔

تری یادوں کے گلاب

محبت تو اللہ تعالیٰ کا ایک پیش بہا عقد ہے جسے چاہے لوازو دے۔ اللہ نے تمہیں اس عقد سے نواز تم نے مجھ سے بچی اور گہری محبت کی اسی کا عقد تھی۔ اللہ تم سے اپنا عقد واپس کیسے لے سکا ہے۔“

نازش نے پلکیں جھپک کر آنکھ میں آئے آنسو روکنے کی ناکام کوشش کی۔

”البتہ میں تمہاری اس محبت کا مقروض ہوں۔ تمہارے ان قیمتی آنسوؤں کا مقروض ہوں۔“

ہم نے مجھے بھلائے کی کوشش میں بے دریغ اٹھائے۔ میری بے وفائی کا پیراڑ جیسا دکھ تم نے اٹھایا۔ میں۔۔۔ میں اس دکھ کا مقروض ہوں اور میں ساری زندگی تمہارا قرضہ چکا تار ہوں گا۔ مگر تمہیں ”وہ بارہ کھونے کی غلطی ہرگز نہیں کروں گا۔“

حواد نے نازش کے آنسو اپنی پوروں پر لئے اور مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

☆.....☆.....☆

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY  
www.pdfbooksfree.pk



”ہاں ہوں کہ یہ تصویر اپنے اخبار کو نہیں دوں گا۔“

”ایک بات کچھ نیچے مسٹر یوسف! اگر آپ نے میری یہ تصویر اخبار میں چھاپی تو میں آپ سے تلافی کیس کر دوں گی۔“

”نہیں چھاپوں گا۔ آپ سے وعدہ کر چکا ہوں۔ لیکن اگر تصویر اچھی ہوئی تو ایک تصویر آپ کی نذر تو کر سکتا ہوں۔“ یوسف نے ابھی تک ہنگی کی کسی بات کا نہ اٹھیں مانا تھا۔

”جی نہیں۔ مجھے نہیں چاہئے کوئی تصویر۔ آپ اس قلم کو جلا دیجئے جس میں میری یہ تصویر موجود ہے۔“

”یہ بہت مشکل کام ہے محترمہ! کیونکہ اس میں اور بھی بہت سی تصویریں ہیں، ہاں! اور دل میں سے آپ کی تصویر نکال کر میں ضرور جلا دوں گا۔“ یوسف نے کہا اور پھر لا پر واپسی سے آگے بڑھ گیا۔

ہنگی غصے میں اپنی جگہ کھڑی رہی۔ لیکن پھر کسی نے اسے مخاطب کیا۔ یہ کالج کی ہی ایک لڑکی تھی۔ وہ اس کے بعد وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ پھر تین چار دن گزر گئے اور ایک دن اس وقت جب ہنگی کالج کے گیٹ سے اندر جا رہی تھی۔ اسے یوسف نظر آیا۔ عام طور پر اسے وہ اس وقت نظر آتا تھا جب وہ گھر سے باہر نکل کر کالج جانے کے لئے چل پڑتی تھی۔ لیکن پچھلے چند روز سے وہ اسے نظر بھی نہیں آیا۔ وہ جرأت مندانہ انداز میں آگے بڑھ کر بولا۔

”آپ کی تصویر اتنی اچھی بنی تھی۔ محترمہ! کہ میری بہت نہیں ہوئی کہ میں تصویر جلا دوں۔“ یہ ایک فوٹو بنانے کے بعد میں نے ٹیکسٹ ضائع کر دیا ہے اور یہ ایک تصویر صرف آپ ہی کی نذر کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ مجھے معاف فرما دیجئے گا۔“ اس نے تصویر آگے بڑھائی تو ہنگی کا اٹھ بے اختیار آگے بڑھ گیا۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ اسے اپنے آپ کو دیکھنے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ پھر اس نے تصویر دیکھی اور اسے دیکھتی رہ گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تصویر اتنی خوبصورت ہوگی۔ یوسف اپنے کندھے پر لٹکے ہوئے کیمبرے کو سنبھال ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔ ہنگی حیران رہ گئی۔ اس نے یوسف کی طرف توجہ بھی نہیں دی تھی۔ تصویر اس طرح اس کی نگاہوں میں صاف گئی تھی کہ اس پر سے نگاہیں ہٹانے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ پھر جب تصویر دیکھنے سے جی نہ کیا تو پھر اس نے چونک کر یوسف پر نگاہیں ڈالیں۔ لیکن وہ تو جا چکا تھا۔

ہنگی اپنی تصویر دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اتنی خوبصورت تصویر۔۔۔۔۔ وہ تو خود ہی اب تک سوچتی

## بڑی آرزو تھی ملاقات کی

فوٹو گرافروں کی فلیش بار بار چمک رہی تھی۔ پروگرام شروع ہو چکا تھا اور کالج کے بڑے بڑے اساتذہ آنے والے مہمانوں کی خاطر حرات میں گئے ہوئے تھے۔ ہنگی بھی آرمینازم جم کیمپ میں شامل تھی۔ سینے پر کالج کا موٹو گرام سجائے ہوئے وہ ادھر سے ادھر بھاگی بھاگی پھرتی تھی۔ اور جو کام اس کی نگاہوں میں آ جاتا وہ چمک رہی تھی کہ اچانک کسی کیمبرے کی فلیش گن کی تیز لائٹ اس کے چہرے پر بھی پڑی اور وہ چونک گئی۔ اس نے پلٹ کر اس فوٹو گرافر کو دیکھا جس نے اس کی تصویر بنائی تھی اور پھر یوسف کو دیکھ کر اس کے چہرے پر غصے کے دمک لہرا گئے۔

یوسف اس کے گھر سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک گھر میں رہتا تھا اور اکثر کالج آتے جاتے کتنی ہی بار اس سے سامنا ہو چکا تھا۔ دونوں کے درمیان سلام دعا کا کوئی تصور نہیں تھا لیکن یوسف کے بارے میں کتنی ہی بار ہنگی نے اس انداز میں سوچا تھا کہ جیسے یوسف خالص طور پر اس کے سامنے آتا ہو۔ اس سے پہلے ہنگی کی ایک ایسی تصویر بنائی تھی جس میں وہ بالکل الگ تھلک تھی۔ ہنگی غصے میں آگے بڑھی اور اس کے قریب پہنچ کر بولی۔

”یہ کیا بد تمیزی ہے۔ کیا تم نے مجھ سے تصویر اتارنے کی اجازت لی تھی؟“

”میزم میں پریس فوٹو گرافر ہوں ہمیں کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔“

یوسف نے ڈھٹائی سے کہا۔

”ہوں۔ پریس فوٹو گرافر۔“ ہنگی غصیلے لہجے میں بولی۔

”آپ چاہیں تو میرا کارڈ کچھ سکتی ہیں۔“ بہر حال ہنگی کو غصے کے ساتھ حیرت بھی مل رہی تھی۔ بعد میں یوسف نے کہا۔

”اگر آپ میری اس بات سے ناراض ہیں تو میں آپ سے شرمندہ ہوں اور۔۔۔“



”سو جاؤ بیٹا۔ طبیعت ویسے ہی خراب ہے۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔“

”بس امی ابھی سو رہی ہوں۔“ اتنا کہہ کر اس نے لائٹ آف کی اور بیڈ پر دراز ہو گئی۔ آنکھیں تو بند کر لیں لیکن پھر بھی نہبت دیر تک نیند نہیں آئی۔ اور نہ جانے کب اس کی تصویر کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں یوسف بھی داخل گیا۔ وہ سوئی تو اس کی آنکھوں میں یوسف بسا ہوا تھا اور نہ جانے کب تک وہ اس کی آنکھوں کا قیدی رہا۔ پھر دوسرے دن وہ کالج پہنچی اس کے دل میں خواہش تھی کہ یوسف نظر آئے تو وہ اس کا شکریہ ادا کرے۔ لیکن یوسف اسے اس دن کے بعد کالج میں نظر نہیں آیا تھا۔ جس دن اس نے اس کی تصویر بنائی تھی۔ حالانکہ وہ اس کے گھر کے بارے میں جانتی تھی۔ لیکن اتفاق کی بات یہ تھی کہ آج تک کبھی اس کے گھر جانا نہیں ہوا تھا۔ امی بھی ذرا بس محدور قسم کی خاتون تھیں۔ پاس پڑوس میں بالکل آس پاس کے گھر والوں سے ان کی سلام دعا تھی اور بس۔ غالباً پانچواں چھٹا دن تھا کہ یوسف اسے نظر آ گیا۔ وہ کالج کے قریب پہنچی ہی تھی کہ یوسف کی اسکوڑاؤں کے برابر آ کر رک گئی۔

”ہیلو۔ مس چنگی کیسی ہیں آپ؟“ اس نے اس دن پہلی بار اسے براہ راست اس کے نام سے مخاطب کیا۔ دور کہ اسے دیکھنے لگی۔

”آپ خیریت سے تو ہیں کہاں غائب ہو گئے تھے۔“ نہ جانے کیوں اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا اور اس نے یوسف کے چہرے پر خوشی کے تاثرات دیکھے۔

”معافی چاہتا ہوں۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ بس امت نہیں پڑی آپ کے سامنے آنے کی

آپ ہماری پڑوسی ہیں۔ میں اس حساب سے بھی آپ کی بہت عزت کرتا ہوں۔“

”میں آپ سے تصویر کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔“

”یہ تو میری خوش نصیبی ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو وہ سامنے جو ہوئی ہے وہاں بیٹھ کر میرے ساتھ ایک کپ چائے چلیں۔ دیکھئے معافی چاہتا ہوں۔ بہت بڑی جرات کر رہا ہوں لیکن ہم سڑک پر کھڑے ہو کر تو بات نہیں کر سکتے۔“

”ٹھیک ہے۔ آپ وہاں چلیں۔ میں دس منٹ میں وہاں آ جاؤں گی۔“ اس نے بڑی امت کر کے کہا۔ اور یوسف نے بالکل خاموشی سے اسکوڑا آگے بڑھا دی۔

جب وہ سڑک عبور کر کے اس ہوٹل تک پہنچی تو یوسف اسکوڑا پارک کر کے کھڑا ہوا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ دونوں ایک ساتھ ہی ہوٹل میں داخل بھرے اوزر یوسف نے ایک میز منتخب کر

اس کے لئے ایک کرسی تھپٹ لی۔

”شکر ہے۔“ وہ بولی۔

”اب آپ یہ بتائیے کیا کھانا پسند کریں گی۔“

”نہیں۔ کچھ نہیں۔“

”آپ کس کیم؟“ وہ بولا۔

”ٹھیک ہے۔“ چنگی نے بے تکلفی سے کہا اور یوسف نے ویٹر کو بلا کر آئسکریم کا آرڈر دے دیا۔ پھر بولا۔

”پہلے تو میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میرے اوپر اس قدر رحمہ کیا۔ ویسے بھی مس چنگی بہم پڑوسی ہیں۔“

”پہلے یہ بتائیے۔ آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟“ چنگی نے خوشگوار موڈ میں کہا۔

”نہیں جناب یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے میں دوبارہ عرض کروں گا کہ آخر کار ہم پڑوسی ہیں۔“

”وہ تو ہیں۔ بالکل پڑوسی کی حیثیت سے بھی ہماری کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔“

”جب بھی ہو جائے۔۔۔۔۔ اچھا اب آپ مجھے تصویر کے بارے میں بتائیے۔“

”تصویر بہت خوبصورت ہے۔ لیکن میری نہیں ہے۔“

”جی؟“ یوسف حیرت سے بولا۔

”ہاں۔ میں اس تصویر بھی نہیں ہوں۔ تصویر بہت خوبصورت ہے اور مجھے آپ دیکھی رہے ہیں۔“

”جی ہاں۔ میں دیکھ رہا ہوں۔ آپ کو اگر ایک بات عرض کروں آپ سے۔ آپ کو یہ تو پتہ ہی ہوگا کہ کمرے کی آنکھ کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ آپ جیسی ہیں۔ ویسی ہی تصویر آئی ہے۔“

”میں نہیں مانتی۔ آپ کے کمرے نے جھوٹ بولا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ اگر آپ چاہیں تو مجھے بھی جھوٹا کہہ سکتی ہیں۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں سوری۔۔۔۔۔ ایسی بات نہیں ہے۔ آپ یقین کیجئے کہ آپ نے بہت خوبصورت تصویر بنائی ہے۔“

”اب اگر آپ میری بات مان لیں تو میں آپ سے عرض کروں گا کہ آپ کو دیکھنے ہی



تری یادوں کے گلاب

نہانے کیوں اس نے اتنی بے تکلفی سے یہ اجازت دے دی تھی۔ حالانکہ اس سے پہلے کسی اس طرح کے معاملات نہیں تھے۔ بس دل میں یہی آیا تھا کہ یہ شخص نہ انہیں ہے اور واقعی وہ نہ انہیں تھا۔ وہ صاف سحر اور بے ضرری تھا۔ پورے تین ماہ تک یہ لوگ بٹخے میں دو بار بٹھے رہے اور وہ بگنی سے کافی بے تکلف ہوتا چلا گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ دونوں ایک دوسرے سے کافی زیادہ سناٹا ہو گئے ہیں۔ وہ ہمیشہ بگنی کی تعریف کرتا رہتا تھا۔ لیکن پھر تین مہینے کے بعد اچانک ہی یوسف نائب ہو گیا۔

جنگی کے دل میں اس کے لئے بے پناہ محبت پیدا ہو چکی تھی۔ وہ دل کی گہرائیوں سے یوسف کو چاہنے لگی تھی اور کتنی ہی بار اس نے اس بات کی آرزو کی تھی کہ یوسف اسے اپنی زندگی میں شامل کرنے کا تذکرہ کرے۔ بہت سی بار اس نے یوسف سے اپنی قربت کا اظہار بھی کیا تھا۔ اور اس نے اپنے بارے میں ایک ایک بات بتا دی تھی۔ یوسف نے بھی خود اسے اپنے گھر کے بارے میں تفصیل بتائی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ اپنے بڑے بہنوئی اور بہن اور ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ اس کے والد کا انتقال دس سال پہلے بڑی بہن کی شادی کے بعد ہو گیا تھا۔ انتقال کے بعد ہی اس کی بڑی بہن اپنے شوہر اور دو بچوں کے ساتھ ہی اس کے گھر آ گئی تھی۔ اور اس وقت سے یہ لوگ اس کے گھر میں رہتے تھے۔ ایک طرح سے یوسف کی والدہ اور یوسف کی کھال اس کے بہنوئی ہی کرتے تھے۔ یوسف نے تعلیم چھوڑ کر کئی مرحلہ نوکری حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اسے کامیابی ہوئی تھی۔ فوٹو گرائی کا شوق اسے بھیجن ہی سے تھا۔ درجہ اس شوق کو اس نے اپنا پیشہ بنالیا۔ وہ باقاعدہ کسی اخبار سے منسلک نہیں تھا۔ لیکن کئی اخبارات میں اس کی بنائی ہوئی تصاویر لگ جاتی تھیں۔ وہ عموماً اخبارات کے فیشن میگزین کے لئے فوٹو بناتا تھا۔ لیکن اس نے وعدے کے مطابق جنگی کی تصویر کسی فیشن میگزین کے لئے نہیں دی تھی۔ اور واقعی یہ بات اس نے سچ ہی کبھی تھی کہ وہ اس کی تصویر کسی کو نہیں دے گا اور اس نے اس کی تصویر کا ٹیکسٹ ضائع کر دیا ہے۔

بہر حال یہ بات جنگی کے ذہن میں جڑ بکھر چکی تھی کہ یوسف بھی اسے اسی طرح چاہئے گا ہے۔ جس طرح وہ یوسف کو اور اکثر اس کے دل میں یہ خیال ہوتا تھا کہ یوسف جس طرح بھی ہو سکے جلد از جلد اسے اپنی زندگی میں شامل کرنے کا فیصلہ کر لے۔ تقریباً چند دن تک یوسف اسے نہیں ملا تو جنگی کی بے چینی آخری حد تک بڑھ گئی۔ اور آخر کار وہ ایک روز اس کے گھر پہنچ ہی گئی۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ تو یوسف کی بہن نے دروازہ کھولا اور اسے دیکھ کر کہہ دی۔

تری یادوں کے گلاب

میرے دل میں یہ خیال چلا کہ کوئی اتنی خوبصورت تصویر بنائی جائے جس کا کوئی جواب نہ ہو۔ اور میں نے بے اختیار آپ کی تصویر اٹاری۔“

”دیکھئے۔ جناب! آپ کچھ ضرورت سے زیادہ غلط خیالی کر رہے ہیں۔ کیونکہ میں آئینہ روز دیکھتی ہوں۔“

”آپ اپنی نظروں سے دیکھتی ہیں آئینہ۔ اگر میری نظر سے دیکھیں تو حقیقت آپ پر واضح ہو جائے۔ میرا مطلب ہے۔ میرے کمرے کی نظر سے۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”کہہ لیجئے..... کہہ لیجئے آپ مجھے پتہ ہے کہ مرد اس طرح جھوٹ بولتے ہیں۔“

”کمال ہے۔ آپ مجھ سے بہت سے رشتے قائم کرتی جا رہی ہیں۔“

”جی ہاں..... مرد اور کمرے میں فرق ہوتا ہے۔“ وہ بولنا اور چٹکی بے اختیار فیس پڑی۔

بہر حال آنسکریم کھانے کے دوران بہت سی باتیں ہوتی رہیں پھر یوسف نے کہا۔

”ویسے تو میں آپ کو کتنی ہی بار اپنے کمرے کے ایک حصے سے دیکھ چکا ہوں۔ لیکن آج مجھے یوں لگ رہا ہے۔ جیسے میں نے پہلی بار آپ کو دیکھا ہے۔ ایک عرض کر سکتا ہوں۔“

”غذائے“

”کیا آپ سے دوبارہ بھی ملاقات ہو سکتی ہے۔“ جنگی نے ایک لمحے کیلئے سوچا۔ پھر بولی۔  
”کیا حرج ہے۔“

”یہ جگہ تو بہت اچھی ہے۔ آپ کو یہاں آنے میں کوئی دقت تو نہیں ہوگی۔“

”وقت کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر آپ چاہیں تو کالج کی کینٹین میں بھی آ سکتے ہیں۔“

”مس چنگی وہاں۔ بہت سے لوگ ہوتے ہیں۔ میرا مطلب ہے آپ کو تو پتہ ہی ہے کہ لوگ کس طرح رسوا کر دیتے ہیں۔“

”میں کسی کی پرواہ نہیں کر سکتی اور اس لئے میں آپ کے ساتھ اس جوتوں میں بیٹھی ہوں۔  
 محل میں میرا ایک نقرہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب دنیا ہمارے لئے کچھ نہیں کر سکتی تو ہم دنیا کا  
 خوف کیوں کر س۔“

”بات تو بہت اچھی ہے لیکن بہر حال جیسا آپ پسند کریں۔“  
 ”کوئی حرج نہیں ہے فی الحال ہم اسی ہوٹل میں ملا کر رہ گئے۔“ بنگلی نے فیصلہ دے دیا۔

"جی فرمائیے۔ کون ہیں آپ؟"

"میں اصل میں مجھے یوسف صاحب کے بارے میں معلومات حاصل کرنا تھیں۔"

"وہ تو ملک سے باہر چلا گیا ہے۔"

"جی؟" وہ دھک سے روٹ گئی۔

"ہاں..... وہ چلا گیا بہت عرصے سے وہ ملک سے باہر جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔"

"ملک سے باہر؟" جنگی نے بڑے قہج سے پوچھا۔ اس کا سر پکرا سا گیا تھا۔ "ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ وہ اچانک ہی اسے بتائے بغیر اس طرح باہر نکل جائے"

"اصل میں وہ اپنی بنائی ہوئی تصویروں کی نمائش کے چکر میں تھا۔ اور اس کا خیال تھا کہ

اس ملک میں اسے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچے گا۔"

"لیکن وہ گھر میں بتائے بغیر چلے گئے۔ میرا مطلب ہے۔"

"ہاں..... مجھے وہ اسی انداز کا لڑکا ہے۔ لا اہالی۔ بے پرواہ وہ دنیا سے الگ تھلگ جس روز

سے وہ گیا ہے اسی کی طبیعت خراب ہے لیکن خود ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ اسے کہاں اطلاع

دی جائے۔ بس..... گھر سے چلا گیا اور یہ بھی نہیں بتایا کہ کہاں جا رہا ہے۔ یہ تو صرف میرا اندازہ

ہے کہ وہ ملک سے باہر نکل گیا ہے کیونکہ اس نے کئی بار اس کا تذکرہ بھی کیا تھا۔" یوسف کی بہن

کے ایک ایک لفظ پر جنگی کو جکڑا رہے تھے۔ لیکن اس نے خود کو سنبھال لے کر کہا تھا۔

"لیکن بی بی آپ نے مجھے اپنے بارے میں نہیں بتایا۔" یوسف کی بہن نے کہا۔

"جی میرا نام جنگی ہے۔ اور میں اسی محلے میں رہتی ہوں۔ آپ کے گھر کے قہوڑے سے

فاصلے پر۔" جنگی نے سامنے اپنے گھر کی جانب اشارہ کر کے کہا۔

"ارے واہ..... ملاقات ہی نہیں ہوئی آج تک آؤ..... امداد آ جاؤ۔" یوسف کی بہن نے

بے تکلفی سے کہا۔ اور جنگی اس کے پیچھے پیچھے دو گدگداتے قدموں سے اندر داخل ہو گئی۔

"میرا نام شاہدہ ہے۔ اور یوسف میرا اکیلا ہی بھائی ہے۔ ماں اکیلی تھیں اس لئے میں

اپنے شوہر کے ساتھ یہاں آ گئی۔ لیکن میں جنہیں یوسف کے بارے میں بتاؤں کہ شہید کی سے اس

کا دور کا بھی رشتہ نہیں ہے۔ البتہ تمہاراؤ کر اس نے گھر میں کبھی نہیں کیا۔ ویسے بھی ایک بات میں

جنہیں بتاؤں۔ صرف نوٹو کرانی اس کا شوق ہے۔ بظاہر وہ کبھی مجھے کسی لڑکی سے متاثر نظر نہیں آیا۔

اس نے اپنے شوق پر بڑے پیسے برباد کئے ہیں۔ اسی کا ایک مکان اور تھا۔ جسے اس نے فروخت

کردیا اور ساری رقم اپنے شوق پر خرچ کر دی۔"

"گھر اس کی بنائی ہوئی تصویروں تو شاید کسی فیشن میگزین میں....."

"ہاں..... بابا ہاں..... سنہ میں جو آتا تھا کب دیتا تھا۔ کبھی کسی فیشن میگزین سے اس کا

کوئی تعلق نہیں رہا۔ بس وہ خود کو پریس فوٹو گرافر ظاہر کرتا تھا کہ لڑکیوں کی تصویروں وغیرہ بنانے

میں اسے آسانی ہو جائے۔"

"کیا واقعی؟"

"میں نے کہا تھا..... کہ اس نے اپنی ساری زندگی اپنے اس شوق کی نظر کر دی۔ اس کی

ایک ہی خواہش تھی کہ وہ بہت بڑا فوٹو گرافر بن جائے۔ دنیا میں اس کا نام ہو۔ کسی رشتے کو نہیں ماننا

یہاں تک کہ اپنی ماں کے سلسلے میں بھی اس کا کہنا تھا کہ یہ اس کے پاؤں کی بیڑی ہیں جس دن یہ

بیڑی ٹوٹ جائے گی وہ آزاد ہو جائے گا۔" بڑی عجیب سی صورتحال ہے۔ نہانے وہ اور کیا کیا کرتی

رہی۔ لیکن جنگی پر قیاسیں ٹوٹ رہی تھیں۔

یہ کیا ہو گیا..... یہ کیسے ہو گیا؟ بہر حال وہ وہاں سے چلی آئی۔ اس کا دل خون میں ڈوب

گیا تھا۔ یوسف سے اس نے محبت کی تھی۔ اور ہمیشہ یہ محسوس کیا تھا کہ یوسف بھی اسے چاہتا ہے

لیکن یہ کیا ہوا؟ کئی دن تک وہ خاموش رہی لیکن ایک دن پھر یوسف کے گھر پہنچی گئی۔ آج یوسف

کی بہن شاہدہ کو کافی پریشان تھی۔

"کچھ پتہ چلا یوسف کا؟"

"بالکل نہیں۔ اسی بہت بیمار ہیں۔ وہ اس سے بہت محبت کرتی ہیں اور اس کی اس کشش کی

سے سخت غمزدہ ہیں۔"

"کہاں ہیں وہ؟"

"ہسپتال میں۔ میں وہاں جا رہی تھی۔"

"میں بھی چلوں آپ کے ساتھ۔" شاہدہ نے ایک نگاہ سے دیکھا۔ پھر بولی۔

"آؤ۔ چلو۔" راستے میں شاہدہ نے کہا۔

"ایک بات کہوں تم سے جنگی؟ ہر اتو نہیں مانو گی۔"

"نہیں۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"کیا تم یوسف سے محبت کرنے لگی ہو؟"

”کیوں پوچھ رہی ہیں آپ۔“ وہ غم آلود لہجے میں بولی۔

”مجھے لگتا ہے۔ میں بھی عورت ہوں۔ اور عورت ہی عورت کی بے چینی کو سمجھ سکتی ہے۔ میں جیہیں یوسف کے بارے میں بتاؤں۔ وہ کسی کا نہیں ہے اس دنیا میں۔ اس نے جو کچھ بھی تم سے کہا ہوگا۔ وہ سب جھوٹ کہا ہوگا۔ اسے کسی سے محبت ہوئی نہیں سکتی۔ میں تمہارا دل نہیں توڑ رہی۔ اس لئے تم سے کہہ رہی ہوں یہ بات کہ تم سنبھل جاؤ۔ وہ ایک دھوکہ ہے۔ یہ بات ایک بہن اپنے بھائی کے بارے میں کہہ رہی ہے۔ لیکن حقیقت اس وقت میں ایک بہن نہیں ایک عورت ہوں۔“

جنگی خاموشی سے اس کی بات سنتی رہی۔ شاید نے اسے یہ بھی بتایا کہ انجی کے خاندان کی ایک بہت سی حسین لڑکی سے یوسف کے رشتے کی بات چلی تھی اور یوسف نے یہ کہہ کر اس لڑکی سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ اس لڑکی کا سکرین ٹیس نہیں ہے۔ اس کی تصویر بہت خراب آتی ہے اور کمرے کی آنکھ بھی جھوٹ نہیں بولتی۔ یہ اندر سے بھی اتنی ہی خراب ہوگی جتنی اس کی تصویر خراب آتی ہے۔

بیوقوفی کی بات ہے۔ لیکن اس کا اپنا نظریہ تھا۔ جنگی کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ لیکن ایک بات اس کے ذہن میں بار بار ابھرا اور ڈوب رہی تھی۔ وہ یہ کہ اس کی تصویر تو خراب نہیں آئی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ اندر سے بھی اتنی ہی انجی ہے جتنی اس کی تصویر ابھی آئی ہے۔ پھر یوسف نے اسے دھوکہ کیوں دیا۔ جبکہ شاید وہ کی باتوں سے تو یہی لگتا تھا کہ یوسف اب تک اسے بیوقوف ہی مانتا رہا ہے۔ شاید وہ شوہر کا فون آیا۔ جس میں اس نے فائدہ شاید سے کچھ کہا تھا۔ شاید نے فوری طور پر ہسپتال جانے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے کہا۔

”اگر تم میرے ساتھ امی سے ملنے ہسپتال چلتا چاہتی ہو تو شام کو آ جانا صبح میں منسور کو مجھ سے کوئی کام آچرا ہے۔ اس وقت میں وہاں نہیں جا سکتی۔“

”ٹھیک ہے۔“

”پھر یہ بتاؤ آؤ گی۔“

ہاں۔ ہاں کیوں نہیں۔ میں امی کو دیکھنے ضرور جاؤں گی۔

”میں بھی چاہتی ہوں کہ تم انجی دیکھنے چلو۔“ شاید نے پوچھیں کس جذبے کے تحت کہا۔ بہر حال وہ وہاں آ گئی اور مگر آ کر بیٹھ گئی۔ اس کا دل مگر میں نہیں لگ رہا تھا۔ بار بار اسے یوسف کا خیال آ رہا تھا۔ کیا یوسف اتنا بڑا انسان تھا۔ اس کی کہی ہوئی ایک ایک بات اسے یاد آ رہی تھی۔

یوسف کا بیٹا مسکراتا چہرہ بار بار نگاہوں میں محسوس جاتا تھا۔ پتہ نہیں یہ سب کچھ کیا ہوتا ہے۔ میں انجی خاصی اپنا وقت گزاری رہی تھی۔ اس دن وہ کھنت میرے سامنے آیا اور اس نے میری زندگی تہہ و بالا کر دی۔ جنگی سوچ رہی تھی۔ اس دوران امی نے کئی بار پوچھا کہ وہ کیوں کم ختم ہو گئی ہے۔ لیکن امی کے اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

پھر پانچ بجے اس نے ہسپتال جانے کی تیاری شروع کر دی۔ منہ ہاتھ دھو کر اس نے کپڑے تبدیل کئے۔ اور امی سے صرف اتنا کہا کہ وہ صبح ہسپتال تک جا رہی ہے۔

”کیوں۔“ خیریت، کوئی تیار ہے کیا؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ میری ایک دوست کی امی ہسپتال میں داخل ہیں۔“ جنگی نے مختصر سا جواب دیا اور کمرے باہر نکل آئی۔ جب وہ شاید کے پاس پہنچی تو وہ تیاری تھی۔ رکشہ میں بیٹھ کر وہ دونوں ہسپتال چل پڑیں اور پھر یوسف کی والدہ کے پاس پہنچ گئیں۔ یوسف کی والدہ کے کمرے خراب تھے اور وہ بلڈ پریشر کی مریض بھی تھیں۔ ڈاکٹر اس کا خیال تھا کہ وہ زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہ سکتیں۔ شاید نے ان کی طبیعت کا پوچھنے کے بعد جنگی کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

”امی یہ یوسف کی دوست ہیں۔“

”دوست؟“ یوسف کی والدہ نے بڑی مشکل سے کہا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے۔ امی یہ لڑکی یوسف سے محبت کرتی ہے۔“ شاید بہت سی مکلی زبان کی مالک تھی۔ جنگی چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ لیکن شاید نے کسی بات پر توجہ دیے بغیر کہا اور اس کا خیال ہے کہ یوسف بھی اسے پسند کرتا ہے لیکن وہ اسے بتائے بغیر یہاں سے چلا گیا۔

”کیا نام ہے اس کا؟“

”جنگی۔ اپنے ہی محلے میں رہی ہے۔“ شاید نے کہا اور پھر اس نے بہت سی تفصیل سے جنگی کے بارے میں امی کو بتایا اور یہ بھی بتایا کہ اس کی تصویر یوسف کے کمرے سے بہت اچھی آتی تھی۔

”پھر۔۔۔۔۔ پھر وہ کہاں گیا۔ اور کیوں گیا؟“

”معلوم نہیں کیوں گیا۔ جبکہ اس نے بار بار یہی بات کہی تھی کہ جس لڑکی کو اس کے کمرے نے پسند کیا وہ اس سے شادی ضرور کرے گا۔“ جنگی کی تصویر بنانے کے بعد وہ اس سے خود ملا تھا اور اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس سے ایسے ہی ملتا تھا۔ جیسے اس سے محبت کرنے لگا ہو۔“



ترکی یادوں کے گلاب

اسے بہت عرصے سے جانتی ہے۔ بہر حال نعمان نے اس پر کوئی شبہ نہیں کیا تھا۔ اس دن کے بعد وہ دو ہفتے تک نہ شاہدہ کے گھر گئی اور نہ اس نے اس کی ماں کے بارے میں کچھ معلومات کی۔ دو ہفتے کے بعد جب اس کے گھر پہنچی تو اس کی ماں بستر پر تھی۔ معلوم ہوا کہ اب اس کی ماں کی طبیعت قدرے بہتر ہے۔ وہ سوری تھیں اس لئے ہنگی کی ان سے بات چیت نہیں ہو سکی لیکن شاہدہ نے بتایا کہ یوسف کا خط لندن سے آیا ہے اور وہ خبریت سے ہے۔ فی الحال اس کی واپسی کا کوئی ارادہ نہیں ہے کیونکہ وہ کسی فوٹو گرافری کی نمائش میں حصہ لینے والا ہے۔ اس نمائش کے بعد ہی شاہدہ واپس آئے گا۔

”اوہ! کیا آپ نے اُن کی کو یہ بات بتادی۔“

”ہاں..... اسی خط کی بناء پر ان کی طبیعت ٹھیک ہوئی ہے اور میں انہیں ہسپتال سے واپس

گھر لے آئی۔“

”بہر ایشا ایل ہے شاہدہ باجی آپ کو اس طرح انہیں نہیں بتانا چاہئے تھا۔“

”کیوں؟“

”بس ایسے ہی۔“

”میں نے انہیں وہ خط بھی دکھا دیا ہے اور اس سے جابھی بہتر ہو گئی ہیں۔“ کافی دیر تک وہ شاہدہ کے پاس رہی۔ شاہدہ نے اس سے اتنے دن نہ آنے کی وجہ سے شکایت بھی کی اور اس نے بہت سی دھڑا دھڑکی باتیں کہیں تھیں۔ بہر حال یہ لوگ یوسف کے بارے میں باتیں کرتے رہے جب ہنگی گھر آئی تو اس کے دل و دماغ پر یوسف ہی چھایا ہوا تھا اور وہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ فوٹو گرافی کی نمائش کے بعد وہ واپس آ جائے۔ بہر حال وقت گزرتا رہا۔ تقریباً ایک مہینے کے بعد یوسف نے لندن سے شائع ہونے والا ایک رسالہ شاہدہ کے ہام پوسٹ کیا۔ یہ رسالہ فوٹو گرافی سے متعلق تھا اور اس نے لندن میں فوٹو گرافی کی ایک نمائش کی روداد بھی شائع کی تھی۔ شاہدہ باجی نے بڑے غرے کے بعد یہ رسالہ ہنگی کو دیا اور جب ہنگی نے رسالے کا سرورق دیکھا تو ایک دم اس کا دل دھک سے ہو کر رو گیا۔ سرورق پر ہنگی کی تصویر شائع ہوئی تھی۔ اپنا فوٹو سرورق پر دیکھ کر اس کی جو حالت ہوئی۔ اسے شاید الفاظ میں بیان نہ کیا جاسکے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو اُبل پڑے تھے۔

”ارے..... ارے ہنگی یہ کیا کر رہی ہو۔ جیسے تو خوش ہونا چاہئے۔“

ترکی یادوں کے گلاب

”پھر تو..... پھر تو وہ ضرور واپس آ جائے گا۔ واپس آ جائے گا۔“ یوسف کی والدہ کے پرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی۔

”لیٹی رہیں..... لیٹی رہیں امی۔ دماغ پر زیادہ زور دینے کی کوشش نہ کریں۔“ شاہدہ نے انہوں سے پکڑ کر اپنی ماں کو لٹانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

ہنگی کی صورت حال اس وقت بہت عجیب تھی۔ اسے نبھانے کیوں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ بیمار نہ توں ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ یوسف ضرور واپس آ جائے گا۔ جب یوسف کی بیمار ماں کو جو اس کی فٹ سے بالکل ناامید ہو گئیں تھیں، اس سے ملنے کے بعد اس کی واپسی کی امید ہو سکتی ہے تو پھر تو یہی تو بھی اس کی واپسی کا یقین کر لینا چاہئے۔ کمرے کی آنکھ نے کوئی دی ہے کہ وہ اندر سے خوبصورت ہے۔ پھر تو یوسف ضرور واپس آئے گا۔ بہر حال پھر اچانک ہی ایک خیال اس کے ذہن میں آیا کہ اس کے کمرے کی آنکھ نے کسی اور لڑکی کو پسند کر لیا تو کیا ہوگا۔

”کیوں جی تم بتاؤ۔ کیا یوسف واپس آئے گا؟“ یوسف کی ماں نے براہ راست اس سے سوال کر لیا۔ لیکن ہنگی کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ البتہ شاہدہ بول پڑی۔

”کچھ نہیں کہا جاسکتا وہ عجیب و غریب فطرت کا مالک ہے۔ وہ کس وقت کیا کر دے گا اس کا اندازہ کرنا بہت مشکل کام ہے۔ بہت سی مشکل۔“ بہت دیر تک یہ دونوں ہسپتال میں رہیں اور پھر یوسف کی ماں کو تسلی دے کر کہ وہ بہت جلد صحت یاب ہو جائیں گی۔ ہنگی اور شاہدہ گھر واپس آ گئیں۔

”ہنگی جب گھر واپس پہنچی تو مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ نعمان اپنے کام سے واپس آ گیا تھا اس نے براہ راست اس سے سوال کر ڈالا۔

”کہاں گئیں جیسے تم ہنگی؟“

”وہ میں ہسپتال گئی تھی۔ شاہدہ باجی میرے ساتھ تھیں۔“ ہنگی نے کہا لیکن نعمان کسی شاہدہ باجی کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔

”کون شاہدہ باجی؟“

”وہ پڑوس میں رہتی ہیں۔ میرے ان سے بہت اچھے تعلقات ہیں۔“ ہنگی نے کچھ بچ اور کچھ جھوٹ بولا۔ اس نے یوسف کے بارے میں بھی بتایا کہ وہ اپنی ماں کو بتائے بغیر باہر چلا گیا اس لئے اس کی ماں کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہے۔ اس نے شاہدہ کے بارے میں کہا کہ وہ

جنگی نے اپنے آنسو خشک کر لئے اور بولی۔

"یہ رسالہ میں رکھ لوں باقی!"

"ابھی نہیں۔ ابھی تو اسے کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ نہ میرے شوہر نے نہ امی نے۔" اس تصویر کے بارے میں اندر ایک مضمون بھی ہے۔ بعد میں یہ رسالہ میں جنہیں دے دوں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ جنگی بہت دیر تک شاہدہ باجی کے ساتھ رہی پھر گھر آ گئی۔ اس کے بعد وہ ایک ہفتے تک روزانہ ان کے گھر جاتی رہی کہ وہ رسالہ اسے دے دیں مگر لیکن انہوں نے رسالے کے بارے میں اتنی سیدھی باتیں بیان نہ کیں۔ جنگی کو صاف لگا کہ وہ یہ رسالہ اسے دینا نہیں چاہتیں۔ جنگی شہر بھر کے ہنگ سٹالوں اور کتابوں کی دکانوں پر اسے تلاش کرتی رہی اور اسے یہ رسالہ بھی نہیں ملا۔ پھر ایک دن وہ شاہدہ باجی کے گھر پہنچی تو علیک سلیک کے بعد اس نے کہا۔

"شاہدہ باجی۔ اگر آپ رسالہ نہیں دینا چاہتیں تو مجھے بتا دیجئے۔ میں اسے منگو لوں گی۔"

شاہدہ باجی نے عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھا اور بولیں۔

"جنگی میں جنہیں اس کا سرواق پھاڑ کر دے سکتی ہوں۔ رسالہ میں جنہیں نہیں دوں گی۔"

"کیوں شاہدہ باجی! ایسی کیا بات ہے؟"

"یہ بات ہے جنگی میں نے اس رسالے کا ذکر اپنے شوہر تک سے نہیں کیا۔ نہ امی کو یہ

رسالہ دکھایا۔"

"مگر کیوں؟" جنگی کا نہ حیرت سے کل گیا۔

"تھما رہے اس کیوں کا جواب میرے پاس ہے۔ مگر میں اسے دینا نہیں چاہتی۔ میرے

اس جواب سے تھما راول ٹوٹ جائے گا اور تم جنگی! میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔"

"باجی پلیز! ایک بار مجھے دکھا تو میں آخر کسی کیا بات ہے؟"

"لو۔" آخر کار شاہدہ باجی نے رسالہ جنگی کے سامنے پھینک دیا۔

"لو اسے چھو اور خود بخوبی کر لو۔" رسالے میں یوں تو بہت کچھ تھا لیکن تصویروں کے

درمیان چھوٹے چھوٹے مضمون بھی تھے۔ جن پر نشان لگے ہوئے تھے۔ یہ نشان شاہدہ باجی نے

لگائے تھے۔ ایک مضمون رسالے کے اوپر کی طرف سے تھا۔ اور دوسرا مضمون فوٹو گرافر یوسف

کے سلسلے میں تھا۔ جسے رسالے کی کسی طرف نے لکھا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ

"یوسف پاکستان کا ایک جنوبی فوٹو گرافر ہے۔ اس کا خیال ہے کہ وہ

لاکیاں جن کے اسکرین فیس ہوتے ہیں وہ اندر سے بہت

خوبصورت اور باہر سے دیکھنے کے قابل بھی نہیں ہوتیں۔ اس نے یہ

بھی کہا تھا کہ سرفرق پر جس فوٹو کو نمائش میں اول قرار دیا گیا ہے۔

اس فوٹو کے پیچھے جو لڑکی ہے وہ ایسی بھی نہیں ہے کہ جسے نظر بھر کر

دیکھا جائے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ فوٹو گرافری کی دوسری نمائش

میں وہ جس لڑکی کی تصویر رکھنے والا ہے وہ ایک اور لڑکی ہے اور گزشتہ

چھوٹے سال سے لندن ہی میں رہتی ہے۔ یہ لڑکی اندر سے اتنی حسین

ہے کہ وہ نمائش کے بعد اس سے شادی کرے گا۔"

اس مضمون میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ یوسف کو چھٹی رقم اس نمائش کے بعد دی گئی ہے اس کے

موض سے برطانیہ کی شہرت بھی مل سکتی ہے۔ رسالہ ہاتھ میں لئے جنگی بھانے کیا کیا دیکھتی اور سوچتی

رہی تھی۔ پھر اس نے اپنے دل میں فیصلہ کیا کہ یوسف باہر سے جتنا خوبصورت تھا اندر سے اتنا

ہی بدصورت تھا۔

☆.....☆.....☆

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

www.pdfbooksfree.pk

بکھڑا تا تو گوشت کا سالن یک جایا کرتا تھا۔

کھانے کی میز پر شاہزاد اکثر منہ بناتے کہ میں ہر روز دوسرے دن ایک سی بانڈی پکارتا رہتا ہوں لیکن صبح سویرا انگڑاوتے وقت سمجھ میں ان کی بھی نہیں آتا تھا کہ آج پھر کیا پکایا جائے۔

حیدر نے یہ مشکل بھی حل کر دی تھی۔ اس نے سب کی پسند معلوم کر کے مجھ سے فہرست بنوائی اور پھر ان چیزوں کو سات دلوں پر تقسیم کر دیا۔ اس طرح کبھی میز پر پسند سے نکل آتے تو کبھی وال بھری روٹی۔ کبھی آلوکا بھرتہ اور کبھی شاہی کباب۔ اور لوہی کا رائیہ۔

میں حمیدہ سے اکثر کہتی کہ

”اوری اس سلیقے پر اگر تو اعلیٰ تعلیم حاصل کر لینی تو کہیں رانی بن کر راج کرتی۔“ کیونکہ وہ  
مذہب تک پڑھی ہوئی تھی۔

اور حیدرہ ہر پارک کی جواب دہی۔ ”بڑی بیگم راج پاٹ سلیقے اور تعلیم سے نہیں مقدر سے ہے۔“

میں نے اسے بار بار قائل کرنے کی کوشش کی کہ مقدر کے دوسرے معنی کوشش کے ہیں۔ انسان کے اپنے حالات اور اس کی جدوجہد ہی وہ چیز ہے جس کے تحت بھی کامیابی ہوتی ہے۔ یہ اور بھی نام کامیابین میری زندگی میں اسے بھی قائل نہ کر سکے۔ وہ جواب میں یہی کہتی۔

”بڑی بیگم، اللہ میاں نے ہر انسان کو اس کی اوقات کے مطابق دکھ اور خوشیاں دی ہیں مگر اے مجھے کیا کیجئے۔ جو مجھ ملے۔ شاید میں اس سے زیادہ کے قابل نہ تھی۔“

اور میں یہ سوچ کر چپ ہو جاتی کہ بصیرت زدہ انسان خود کو بھلائے رکھنے کے لئے کچھ مفروضات قائم کر لیتے ہیں تاکہ دل کے سکون کا کچھ ذرا سامان ہو۔ پھر میں بحث کر کے ان کا یہ سکون بھی برباد کیوں کروں؟“

حمیدہ بنتے میں ایک بار چھٹی لے کر اپنی بیٹی سے ملنے ضرور جاتی۔ کبھی کبھی میں اسے سو بچاس روپے دے دیتی کہ وہ بیچے کے لئے پھل پاکستان خرید کر لے جائے۔ میں نے محسوس کیا کہ بیٹی سے مل کر آنے کے بعد وہ تھکنوں چھپ چھپ کر رہتی تھی۔ میں خود بھی ایک ماں ہوں۔ چنانچہ جہاں میں ماسٹا کے جذبے کی سرگوشی سے واقف تھی وہاں مجھے اس کے کرب کا اندازہ بھی تھا۔

میں نے کئی بار سوچا بھی کہ عیدہ سے کیوں کر وہ اپنی بیٹی کو یہیں لے آئے۔ اس مسئلے میں، میں نے شاذ ب سے منظور کیا۔ انہوں نے بڑی خوشی سے اجازت دے دی۔ چنانچہ میں نے عیدہ

آئے گا کون ریت کی دیوار تھا منے

خدا بھلا کرے شاہانہ بیگم کی ملازمت نوری کا۔ حمیدہ کو دینی لائسنس تھی۔ حمیدہ کو ایک بھادو کہتے تھے میں نے اس کی نوکری کی کر دی تھی۔

میں نے کہتی تھی جیم صاب کر آپ کو کام کاج کیلئے بڑی اچھی عورت دوں گی۔ اس بیچاری کا بھی بھلا سوچا دے گا۔ بیچاری بچہ عورت ہے۔"

"اگر یہ جیو ہے۔ بیچ بیچ بڑھیب بے چاری، کوئی بچہ بھی ہے اس کا؟" میں نے دکھ سے پوچھا اور حمیدہ جب ہی رہی اس کے بجائے نور بیوی۔

”ہاں..... ایک لڑکی ہے۔ چھ سال کی ہے غریب“  
”کہاں ہے؟“

”یتیم خانے میں۔“ اس کے بھائی حمید نے جواب دیا۔ میں نے دیکھا اس کے زرد چہرے پر مایوسی اور کب کی سیاد لگیں اس ابھریں اور چہرہ یوں دھواں ہو گیا جیسے دنوں وقت گھٹل رہے ہوں۔

میں نے اسے قلعہ دی اور پھر اس نے دھیرے دھیرے چھوٹے سونے کا میں نے لنگر بڑے کام تک کچھ اس خوش اسلوبی سے سنہال لئے کہ میں گھر کے بہت سے کاموں سے ناواقف رہی ہو گئی۔ مثلاً دھوپ کو کپڑے دینا، دھل کرانے والے کپڑوں کی حرمت اور انہیں ان کی مناسب جگہ پر رکھنا۔ گھر کے لئے مینے گھر کا سودا اٹکھا مٹکواتا۔ حتیٰ کہ روز بچنے والی ہانڈیوں کا تھیں کر لیا گیا تھا۔ اور اب اس کے مطابق ہفتے کے ساتھ دونوں مختلف چیزیں پکا کر تھیں اور دوسرے خوان پر روز ایک نا ڈالتا تھا۔ ورنہ پہلے تو روزانہ ای بات پر گھنٹوں کل کل ہوا کرتی تھی کہ آج کیا بچے گا اور جب کچھ



تری یادوں کے گلاب

سے کہا کہ اب کے جب وہ جائے تو بچی کو سہیلی لے آئے۔ یہ سن کر حیدہ کی چہرے پر گھال سا چہرہ گیا۔ ایسی خوشگئی ایسی تاباکی میں نے اس کے چہرے پر پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ یوں گھٹا تھا جیسے کسی نے بیک وقت اس کے دونوں ہاتھوں پر چاند اور سورج رکھ دیے ہوں۔ وہ پہلے تو ایک نلکے جیسے دیکھتی رہی پھر ٹیکس جھپکا جھپکا کر مسکرائی جیسے یقین کر لیا جا رہی ہو کہ وہ کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی۔ بلکہ یہ حقیقت ہے اور جب اسے حقیقت کا یقین ہو گیا تو وہ بے اختیار میرے پیروں سے لپٹ گئی۔

”بڑی نیگم! میں آپ کا شکر یہ کس طرح ادا کر دوں۔ میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔“ اس کے آنسوؤں نے میرے چہرے پر ٹپک دیے۔

”افسوس! میں نے اسے اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔

”تم یہ کیوں بھول جاتی ہو کہ میں بھی اس ہوں۔ مجھے خوشی ہوگی کہ تمہاری بچی تمہارے پاس اور اس گھر میں رو کر کسی قابل ہو جائے۔“

”خدا آپ کی کوکھ خضی رکھے بڑی نیگم اور سنے بھیا کو پک پک خوشیاں نصیب کرے۔“ وہ گود پھیل کر دماغ میں دینے لگی۔

ویسے حیدہ اتوار کو صبح ہی بچی سے ملنے چلی جاتی تھی۔ اور پھر شام کو کوئی تھی۔ لیکن اس دن وہ دوپہر کے کھانے کے بعد گئی کیونکہ اسے وہاں ہی میں بچی کو اپنے ساتھ لانا تھا۔ اس دن میں نے اسے بچی کی پسند کی مٹھی چیز پوچھ کر کھانے میں مزہ ایک ڈش کے اضافے کے لئے کہہ دیا تھا۔ جاتے وقت حیدہ کے چہرے پر مسرت پھوٹی پڑی تھی۔ اور اسے خوش دیکھ کر خود میرے اپنے امدادنگی کے غرور اور ایک نئی مسرت کی سرشاری تھی۔

شام کو وہ اپنی بچی کو لے کر آئی تو حیدہ میرے پاس آئی۔

”بڑی نیگم صاحب! یہ ہے۔ نویدہ.....“ اس نے بچی کو میرے سامنے کر دیا۔

”میں نے بچی کے سر پر ہاتھ پھیرا اس کے گالوں پر پیار کیا اور پھر اسے اپنے پاس بٹھا کر باتیں کرنے لگی۔ بچی سسکی سسکی سی جواب دیتی رہی۔ دو ایک بار جب میری نگاہ بچی سے ہاتھیں کرتے ہوئے حیدہ پر پڑی تو میں نے اسے بڑے غور سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔ میں کچھ الجھی گئی تھی کیونکہ مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے بچی کا چہرہ کچھ مانوس اور دیکھا دیکھا سا ہے۔ پھر حیدہ کی نظر اس جن کے حلق سے نکلتی تھی کہ ان میں جتنی بھی نہ اطمینان نہ ہے۔ بچی۔ اگر میں

تری یادوں کے گلاب

غروں میں جھپی ہوئی کیفیت کو کوئی نام نہا یا جاسکتا ہے تو وہ حسرت کی کیفیت تھی۔ میں سوچ نہ کر کے حیدہ نے مجھے اس طرح کیوں دیکھا تھا۔ میں نے بچی سے ہاتھیں کرنے نے تو بڑی دیر بعد حیدہ سے کہا کہ وہ بچی کو اپنے ساتھ لے جا کر چائے پلاوے۔ حیدہ جلی گئی اور میں نئے حادثے کا سویر بننے لگی۔

حادثے اپنے ابو کے ساتھ پارک کی سیر کیلئے گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ حادثے آئے گا تو وہ جینا نویدہ کو دیکھ کر خوش ہوگا۔

حادثے کی عمر آٹھ سال تھی۔ اسے اپنے ہم عمر بچوں کی تلاش رہتی تھی۔ شاذب کی خواہش تھی کہ حادثے کا کوئی بہن بھائی ہو۔ لیکن میں چاہتی تھی کہ ابھی کچھ عمر سا اور میں اس مصروفیت سے بچی رہوں۔

سویر بننے ہوئے میں اپنی پھوٹی سی جنت کی بہت سی خوشگوار یادوں میں گھوٹی۔ اور پھر اس وقت چونکہ جب حادثے میرے گلے میں اپنی بانہیں ڈال کر جھول گیا۔

”بہت خوش ہیں تو آج آپ.....“ میں نے اسے اپنی گود میں سمیٹ کر پیار کیا۔

”ہاں..... آئی..... آج پارک میں میرا دوست عمران بھی آ گیا تھا۔ ہم خوب کھیلے اس کے ساتھ۔“ ننھا بچہ دوست کے ساتھ کھیلنے کی مسرت سے ابھی تک بے چین ہو رہا تھا۔

”بٹے اپنی اسی سے کیونکہ تمہارے لئے چھوڑا بھائی لے آئیں۔“ شاذب نے شرارت سے کہا۔ میں نے دیکھا وہ ننھا بچہ میرے سامنے کھڑے آئینے میں شوخ نظروں سے مسکرا کر مجھے دیکھ رہے تھے۔

”ننھے ہم تمہارے لئے بھیا تو نہیں۔ بہن لے آئے ہیں۔“ میں نے شاذب کی شریر لہروں سے آنکھیں چراتے ہوئے غصے سے کہا۔ اور پھر حیدہ کو آواز دی۔

”حیدہ نویدہ کو لے آنا یہاں۔“

”کیا وہ اپنی بچی کو لے آئی؟“ شاذب نے پوچھا اور میرے جواب دینے سے پہلے حیدہ

وہ آٹھ میں جانے کی نرے اور دوسرے ہاتھ میں نویدہ کی انگلی تھامے کرے میں داخل ہوئی۔

”آؤ..... نویدہ..... دیکھو یہ تمہارا بھیا حادثے ہے۔“ میں نے نویدہ کو قریب بلا دیا اور وہ

ٹ کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی اور اسی لمحے جیسے میرا دل دھک سے رو گیا۔ کچھ دیر بعد میرے

میں ایک عجیب سی الجھ رہی تھی۔ جو کچھ بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔“

تری یادوں کے گلاب

ایک بیانی مجھے بنا کر دی۔ اور ایک شاذب کو۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔ لیکن وہاں کوئی اضطرابی کیفیت نہ تھی۔ کوئی نیا تاثر نہ تھا۔

”میں رہی ہے۔“ میرے اندر کی عورت چیچی اور پہلی بار میں نے حیدرہ کے لئے اپنے دل میں رقا بت اور بیزاری محسوس کی لیکن مصلحت کا خفا خفا تھا کہ میں ان جذباتوں پر قابو رکھوں میں بغیر غموس ثبوت کے شبے کی پنکھاریوں کو ہوا نہیں دینا چاہتی تھی۔

اب ارادی اور غیر ارادی طور پر میری نظر میں حیدرہ کے چلت بھرت اور اس کے رویے کا جائزہ لینے لگیں۔ اسی دوران شاذب کی امی زمینوں پر سے ہمارے پاس آ گئیں۔ ویسے وہ ہر دوسرے ماہ ایک ہفتہ ہمارے پاس گزارتی تھیں لیکن اس بار میری بڑی نند کی بیماری کی وجہ سے تین ماہ تک وہ ہمارے پاس چکر نہ لگا سکیں۔ میری بڑی نند کے ہاں ولادت ہونے والی تھی اس وجہ سے آئے دن اس کی طبیعت کچھ بگڑی بگڑی رہتی تھی۔ وہ بھی گاؤں ہی میں رہتی تھی۔ لیکن اس کے شوہر شہر میں ایک بینک میں برانچی منیجر تھے۔ عجیب بات ہے تھی کہ میری نند کے سر بھی زمیندار تھے اور میرے سر بھی لیکن ان کی اولادوں نے زمینداری میں کبھی دلچسپی نہ لی۔ انہوں نے شہروں میں زیادہ وقت گزارا۔

شاذب بھی تعلیم کے سلسلے میں زیادہ تر شہری میں رہے اور پھر ملازمت اور شادی کے بعد انہوں نے شہری میں مستقل رہائش اختیار کر لی اور ہم سال میں صرف ایک بار فصل کے موقع پر گھوڑاں جاتے تھے۔ لیکن اماں پابندی سے ہر دوسرے ماہ ہمارے پاس آ جاتی تھیں۔ اب کے اماں آئیں تو وہ بھی حیدرہ کی مستعدی اور خدمتگاری سے بے انتہا متاثر اور خوش ہوئیں۔ کوئی اور موقع ہوتا تو ان کی خوشی میں، میں برابر کی شریک ہوتی لیکن اب تو حالات ہی دوسرے تھے۔ حیدرہ کو دیکھتے ہی جانے کیوں میرے چہرے پر بیزاری کی ٹیکرس ابھرتیں۔ لیکن اماں کے آنے کے بعد میں اور بھی جھکا ہو گئی تھی۔ میں اپنے شہبے کا اظہار ان کے سامنے کر کے اپنے عورت پن کی توجہیں کرنا نہیں چاہتی تھی۔ چاہے پس منظر میں جو بھی تھا۔ پھر بھی حیدرہ ہی جھلا میرا کیا مقابلہ وہ ایک ادنیٰ نوکرانی۔ اور میں بہر حال ایک شریف اور باعزت گھرانے کی بیو اور بیٹی تھی۔ میری رگوں میں شریف خون تھا اور اس کی پاکیزگی کا خفا خفا تھا کہ میں اس معمولی نوکرانی کو کوئی اہمیت نہ دوں۔ پھر بھی ایک محسوس تھا۔ ایک جتنو تھی اور وہ جتنو تھی نویدہ اور عمارت کی مشابہت! حیدرہ کو کچھ کہاں بھی چوکی تھیں۔

تری یادوں کے گلاب

میں کبھی نویدہ کو دیکھتی اور کبھی عمارت کو کتنی مشابہت تھی۔ وہوں میں نویدہ کی طوڑی نے واقعی طرف ایک سیاہل تھا اور عمارت کی طوڑی پر بھی ٹھیک اسی جگہ ایک سیاہل تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ نویدہ کا کل ہلکا سیاہ تھا۔

مجھے یوں لگا جیسے مجھے چکر سا آ رہا ہو۔ حیدرہ نے میری کیفیت دیکھی اور وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

”شاذب۔“ میری آواز میں غیر ضروری طور پر تیزی بھی تھی اور ارتعاش بھی شاذب چاہے پیچے ہوئی چونک پڑے۔

”کیا بات ہے۔“ فرزانہ!

آپ نے نویدہ کو دیکھا؟“ یہ عمارت سے کس قدر مشابہہ ہے اور پھر یہ جل۔ میں بے چین ہو کر بولی۔ لیکن شاذب کے لئے یہ جیسے کوئی انجینے کی بات ہی نہ ہو۔ انہوں نے شام کے انہار سے سرائی کر ایک نظر نویدہ کو دیکھا اور پھر اخبار کی سرخیوں پر نظر جاتے ہوئے بولے۔

”ہاں۔“ یہ تو مشابہت لیکن اس میں جبریت کی کیا بات ہے۔ ایسا خفا خفا تو کبھوتے ہیں۔“ میں خاموش ہو گئی۔ میرا دل اس بات کو اس مشابہت کو اتنا ہی ماننے کو تیار نہ تھا مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے شاذب نے مجھ سے بہت کچھ چھپانے کی کوشش کی ہے۔

رات کو سوتے وقت کتنی ہی شبہات میرے دل میں پیدا ہوئے۔ لیکن میں نے پیلو بلی کر نیند میں ڈوبے ہوئے شاذب کو جب دیکھا تو یہ دوسرے کبھی دم توڑتے ہوئے معلوم ہوتا۔ اور کبھی حقیقت کے سنبھلے بن کر مجھے ڈبے لگتے۔ اور میں سوچنے لگتی۔

بھٹا یہ کیوں لیکن ہے۔ جبکہ شاذب حیدرہ کو پہلے سے جانتے نہیں۔ نہ کبھی ان کی گفتگو سے کبھی کوئی شبہات محسوس ہوئی پھر یہ مشابہت کیا تھی۔ تب میرے دل نے چپکے سے کہا۔

”جانتے کیسی نہ ہوں گے۔ لیکن دونوں نے کامیاب اداکاری کے ساتھ مجھ سے یہ بات چھپانے کی کوشش کی ہو تو مجھے کیا معلوم؟“

اور میرے خدا۔ میں کروٹیں بدلتے بدلتے ٹھک گئی۔ نیند جیسے مجھ سے کوسوں دور بھاگ گئی تھی۔ پھر فنوڈی کے عالم میں بھی نویدہ اور عمارت کی تصویریں گڈھ ہو کر میرے ذہن کے پردے پر ابھرا بھر کر ڈھکی رہیں۔

مناجیب میں جاگی تو کسلندی سے میرا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ حیدرہ بیڈی لے آئی۔ اس نے

لے راضی کیا جائے۔ آخر بے چاری اس طرح کب تک اپنی جوانی خوار کرے گی۔

نوری چلی گئی تو میں باورچی خانے کی طرف جا گئی کیونکہ شاذب نے سوئچ کی بجلی دال اور بھجور کے طلوے کی فرمائش کی تھی۔ میرے ہاتھ کی پکی ہوئی یہ دونوں چیزیں شاذب کو بے حد پسند تھیں اور وہ اکثر و بیشتر مجھ سے ان چیزوں کے پکانے کی فرمائش کرتے تھے۔

لیکن باورچی خانے پہنچ کر میری تو جان ہی جل گئی۔ حیدرہ نے یہ دونوں چیزیں پہلے ہی تیار کر کے رکھ دی تھیں۔

”اف یہ شخص ماری عورت تو مجھ سے میرے گھر کے یہ چھوٹے چھوٹے سگے بھی بھین لینا چاہتی ہے۔“

”ارے میرا تو انتظار کر لیا ہوتا۔ اب ایسی بھی کیا جلدی تھی۔ صاحب کے آنے میں تو ابھی دیر ہے۔ میں نے کہا تھا میں خود پکاؤں گی۔ لیکن تم ہو کہ ہر کام کا سہرا اپنے سر لے لینا چاہتی ہو۔“ میں نے جھلا کر کہا۔

”صاحب تو آگئے بڑی بیگم اور میں نے سوچا کہ آپ کو رحمت ہوگی۔ اس لئے.....“ حیدرہ کی پوری بات سننے سے پہلے ہی مجھے لگا جیسے میرے تن بدن میں کسی نے چنگاریاں ہی بھردی ہوں۔ شاذب آگئے اور مجھے پتہ بھی نہیں چلا۔

میں نے غصے میں اپنے ہونٹ سمجھنے لگے۔ میرا جی چاہا کہ اس کی پٹیا پکڑ کر پوچھوں کہ اپنے میاں کا کام کر کے مجھے رحمت ہوگی اس لئے کہ یہ کام میرے لئے رحمت بن چکے ہیں؟ لیکن میں ضبط کر کے چپ رہ گئی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

شاذب بستر پر لیٹے اخبار پڑھ رہے تھے۔ ان کے ایک ہاتھ میں چائے کی پیالی تھی اور دوسرے میں اخبار۔ میرے ذہن میں آندھیاں سی اٹھنے لگیں۔ شاذب مجھے دیکھ کر بولے۔

”کہاں ہو گئی تھیں آپ بیگم؟ آپ کے انتظار میں چائے بھی ٹھنڈی ہو چکی ہے۔“

”تو بلا لیا ہوتا آپ نے مجھے۔ لیکن عاقلانہ اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی ہوگی۔“ میں نے جمل کر کسی قدر خشکی سے کہا۔ لیکن شاذب میرے لب و لہجہ کو نظر انداز کرتے ہوئے بولے۔

”ضرورت تو آپ کی ہر لمحے محسوس ہوتی ہے۔ لیکن آپ کیا جانتیں۔ میں نے حیدرہ کو کہا بھی تھا کہ آپ کو بھیج دے لیکن.....“

”لیکن کیا.....؟“ میں خراش کر جلدی سے بولی۔ لیکن شاذب کے جواب دینے سے پہلے

تری یادوں کے گلاب

”یہ چہرہ کچھ جانا بچانا تھا۔ جانے میں نے اسے کہاں دیکھا ہے؟“ انہوں نے پہلے مجھ سے کہا تھا۔ اس وقت اور پھر دو چار بار بعد میں، میں نے اماں کے ذہن کو کھنگال لیکن وہ اپنے ذہن پر زور دینے کے باوجود یہ یاد نہ کر سکیں کہ حیدرہ کو انہوں نے کہاں دیکھا تھا۔ انہوں نے حیدرہ سے پوچھنا چاہا۔ لیکن میں نے خود ہی انہیں منع کر دیا۔ اس لئے کہ مجھے یقین تھا کہ حیدرہ کبھی بھی حقیقت نہیں بتائے گی۔ کون اپنے کرتوتوں ہی پر وہ اٹھنا پسند کرتا ہے۔

ایک ہفتے بعد اماں چلی گئیں اور میری جتنی وہ اپنے معمولات میں داخل گئی۔ لیکن اماں نے جانے کے بعد اپنے خط میں جہ انکشاف کیا اس نے ایک بار پھر مجھے چونکا دیا۔ اماں نے لکھا تھا کہ حیدرہ ان کے گاؤں کی لڑکی ہے اور اب سے کئی سال قبل گاؤں سے بھاگ گئی تھی۔

”بہت خوب“ میں نے خط پڑھ کر سوچا۔ تو یہ صورت سے معصوم اور بھولی نظر آنے والی عورت ایسی بھولی نہیں جیسا وہ خود کو ظاہر کرتی ہے اور یہ اس کی بیوگی یہ بھی ایک ڈھونج ہے۔ اب میرا تجسس انتہا کو پہنچ گیا۔ میں خواہ مخواہ کا ہنگامہ نہ کرنا نہیں چاہتی تھیں لیکن یہ ضرور چاہتی تھی کہ کوئی معقول ثبوت ملے تو ایک بار اس عورت کو ایذا دہاں کر دوں کہ مجھے سکون مل جائے یا نہ اس کی بری محبت میں سما جا کر نہ کہاں سے آگئی تھی۔

میں نے شاذب نے بیگم کی ملازمت نوری کو بلا بھیجا۔ وہی نوری جو حیدرہ کو میرے ہاں ملازمت کے لئے لائی تھی۔ میں نے اس سے باتوں باتوں میں پوچھا کہ حیدرہ کو کب سے جانتی ہو اور شہر میں آنے سے پہلے حیدرہ کہاں تھی۔ لیکن وہ مجھے کچھ بھی نہ بتا سکی۔ کیونکہ اس کی اور حیدرہ کی ملاقات بس میں ہوئی تھی۔ حیدرہ اپنی بیٹی سے ملنے بیگم خانے جا رہی تھی۔ حیدرہ کے پاس کرایہ دینے کے پیسے نہ تھے۔ اس پر کتنے کینٹرا سے بری طرح گھر کر رہا تھا اور اگلے اسٹاپ پر اتار دینے کی دھمکی دے رہا تھا۔ حیدرہ کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ نوری کو اس کی بے بسی پر بڑا اثر آیا۔ اس نے حیدرہ کا ٹکٹ خرید لیا۔ پھر باتوں باتوں میں حیدرہ نے اپنی روداد اسے سنائی اور نوری نے اپنا پتا بتا کر اس سے وعدہ کر لیا کہ اس کے لئے ملازمت ضرور تلاش کرے گی۔

اس کے چند دنوں بعد حیدرہ میرے ہاں ملازم ہو گئی تھی۔

یہ تھی پوری کہانی جسے سن کر بھی مجھے حیدرہ کے ماضی کا کوئی اور سراغ نہ ملا۔ ویسی میں نے نوری کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا تھا کہ حیدرہ کے خاندان کا پتہ چلے تو کسی کے ذریعے اسے عقد دہانی کے





تری یادوں کے گلاب

شاذب کو اب بھی اس عورت سے بھردہ ہی ہے اور یہ عورت کتنی اذیت ہے۔ جواب تک اس گھر میں موجود ہے۔ اسے تو کب کا دفنانا ہو جانا چاہئے تھا۔ لیکن وہ کیوں جانے کی وجہ اس گھر پر مان کرنے کے خواب دیکھ رہی ہے۔

”اوہ۔۔۔ میرا سر دوڑنے دیکھنے لگا۔ میں بے چین ہو کر اٹھی۔ تجھے مجھے قدموں سے باہر نکلی۔ اسٹور روم کی جی مل رہی تھی۔ یہی حیدہ کا کمرہ بھی تھا۔ میں شاذب کی دایہیں تک اس اس سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن پھر کیوں میرے قدم غیر ارادی طور پر اسٹور کی طرف اٹھ گئے۔ دروازے کے دونوں ہت کھلے ہوئے تھے۔ میں نے آہستگی سے اندر جھانکا۔

حیدہ اندر نہ تھی۔  
صرف نویدہ ایک بکس پر گھڑی سی بی بی پی تھی۔ میں نے قریب جا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی کئی لکیریں گالوں تک آ کر خشک ہو گئی تھیں۔ وہ خند میں اب بھی ہوئے ہوئے سسکیاں لے رہی تھی۔

”بد نصیب لڑکی“ میرے منہ سے نکلا۔  
”تو اپنی ماں کا کیا جھگڑ رہی ہے۔“ میں باہر جانے کے لئے پلٹ پڑی۔ پھر اس خیال سے رک گئی کہ شاید کبھی بچی بھوکے ہو گئی ہو۔ میں نے اسے دھیرے سے جگایا۔  
”نویدہ۔ نویدہ! اٹھو۔ تمہاری اہلی کہاں ہے۔ تم نے کھا؟ کھالیا؟“ وہ ایک دم چونک کر اٹھی پھر آنکھیں ملنے ہوئے بولی۔

”ای۔ ای۔۔۔ وہ چلی گئیں۔“ وہ پھر گھٹنوں میں منہ دے کر سسکیاں لینے لگی۔  
”کہاں گئیں تمہاری اہلی؟“ میں نے اٹھی پکڑ کر اسے بکسن سے نیچے اتارتے ہوئے پوچھا۔  
”پتہ نہیں۔“ اس نے میری طرف مصوہیت سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک جہاں کی ویرانی سمٹ آئی تھی۔

”یہ کاغذ دے گئی ہیں۔ آپ کے لئے۔“ اس نے اپنے فرائک کی جیب سے ایک مزار کا کاغذ نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے جلدی جلدی کاغذ کھولا اور وہیں کھڑے کھڑے پڑے گئی۔ حیدہ نے کھٹکھا۔  
”بڑی پیغم!“

آپ کا خضر بھی بجا اور آپ کا خشک بھی۔ میرا تو تھا اسی دن ٹھنکا تھا۔ جب میں نے

تری یادوں کے گلاب

اماں جی کو دیکھا اور پھر ان کی تجسس لگا جس بھی مجھے یقین ہو چلا تھا کہ میری خواست کے دن ابھی ختم نہیں ہوئے۔ لیکن جب اماں جی خاموش چلی گئیں تو میں نے سوچا کہ سکون کا سانس لے سکوں گی۔  
نویدہ کو دیکھ کر آپ کے دل میں جانے کتنے شبہات ابھرے ہوں گے۔ حادثہ میاں کو دیکھ کر میرا جی بھی بھرا آتا تھا۔ لیکن میں نے سوچا تھا کہ اپنا اپنا مقدر ہے۔ کوئی بہرے موتیوں میں کھینچا اور سونے کا نوالہ کھائے۔ اور کوئی ایک روٹی کیلئے خیم خانوں کے دروازے کھٹکتا ہے۔  
بڑی پیغم صاحب! آپ بڑے گھر کی بیٹی تھیں۔ اس لئے بڑے گھر کی بہو بننا آپ کا مقدر تھا اور میں غریب گھر کی بیٹی۔ اس لئے تاریک راہوں میں ماری گئی اور یہ میری غربت ہی تھی جس کے سہارے میری شرافت اور عزت کی بوٹی بڑی آسانی سے لگا دی گئی۔

میں کون ہوں اور نویدہ نے کس شریف خون سے جنم لیا آپ اس کی گتھی کو بہت دنوں سے سلجھا چاہ رہی تھیں۔ آئیے میں آپ کی انجمن دور کر دوں۔

میں صاحب جی کا گاؤں کی رہنے والی ہوں۔ ہاں میں انہیں جانتی ہوں۔ لیکن آپ یقین کریں کہ میں نے انہیں صرف دو چار مرتبہ دور ہی سے دیکھا ہے۔ زمیندار کے اگوتے اور لاڈلے بیٹے ہونے کے باوجود انہیں گاؤں یا گاؤں کی روایات اور رسم و رواج ہی کوئی دلچسپی نہیں۔

یہی وجہ تھی کہ وہ تعظیم حاصل کرنے کیلئے ہمیشہ گاؤں سے باہر رہے۔ وہ چھینلوں میں آتے بھی تو کسی نے انہیں کھیتوں، کھلیاؤں، یا میلوں، بھیلوں میں نہیں دیکھا۔ میں اپنے گاؤں کی ایک اہلہ اور محصور لڑکی تھی جو اپنے بوڑھے باپ اور اندھی ماں کا سہارا تھی۔ میرا باپ ایک کسان تھا جو صاحب کے زمیندار باپ کی زمینوں میں اپنا خون پسینہ جذب کر کے کمانا لگا گیا کرتا۔

ایک دن شام کو میں اپنی پہلیوں کے ساتھ کھیت سے واپس آ رہی تھی۔ گھر کی دہلیز پر قدم رکھا تو اچانک پتہ چلا کہ میرا چاندی کا بندھ کھیں راستے میں گر پڑا ہے۔ میں اگلے قدموں واپس مڑی اور جن راہوں سے آئی تھی انہی راہوں پر بندھا موڑتی ہوئی بہت دور جا گئی۔

جب اچانک کسی کے پیروں پر نظر پڑی اور میں وہیں ٹھٹھک کر رو گئی۔ میری جھکی نظریں پیروں سے اٹھیں تو میں نے اپنے سامنے زمیندار کو کھڑے پایا۔ صاحب کے اہلہ اور ہمارے ماں باپ۔ وہ مسکرا رہے تھے اور میرے کانوں کا بندھا ان کے ہاتھ میں بھول رہا تھا۔

”تو اسی کو ڈھونڈ رہی تھی ماں حیدہ۔۔۔ لے لے اسے یہ حیرانی ہے۔“ میں جھپکی تو زمیندار بڑے زور سے فٹسے۔

"بے خوف لڑکی مجھ سے کیوں شرماتی ہے۔ ادھر آ، لے یہ اپنا ہندا" ان کے لہجے میں حکم بھی تھا اور اہمیت بھی۔ میری آنکھیں ان کی آنکھوں سے چار ہونیں اور میرے اندر سے اٹھنے والی جھنجھیں گھٹ کر وہ گئیں۔ ان نگاہوں میں جو طلب تھی۔ اس نے مجھے بھانجے پر مجبور کر دیا۔ لیکن میں بھاگ بھی نہ سکی۔ چچ بھی نہ سکی۔ اور تم یہ کہ فریاد بھی نہ کر سکی اور جب میں اپنے ناکرہ گناہ کا پھل پانے کی منزل میں آگئی تو میرا غریب اور مجبور باپ یہ صدمہ سہار نہ سکا اور اس نے کنوئیں میں گر کر جان دے دی۔

اب میں تھی اور ماتم کرنے کو میری تہائیاں۔ لیکن میں جلد ہی اس خول کو توڑ دینے پر مجبور ہو گئی۔ میں نے رات کی تاریکی میں اپنے گھر کے قریب پاؤلی میں پناہ لی تھی لیکن میری بزدلی آڑے آ گئی۔ پھر میں نے گاؤں چھوڑ دیا۔ اور کیا سناؤں..... بیگم کہ میں نے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھائیں۔ قاتلے کئے، ہردی گری کے دکھ جھیلے اور آخر کار قسمت مجھے آپ کے در تک لے آئی میں نے سوچا میں چور دروازے سے کئی۔ لیکن اپنے گھر تک پہنچ گئی ہوں۔ محنت کروں گی، خدمت کروں گی اور بدلے میں دو روٹیاں مل جائیں گی۔ اور میں ان دو روٹیوں کے سہارے زندگی کاٹ لوں گی۔ لیکن میری قسمت نے یہاں بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا اور آج میں نے محسوس کیا کہ محض ایک شے کی بناء پر کہیں بنتا کھیل گھرا جڑ نہ جائے۔ اس لئے میرا چاہا جانا ہی بہتر ہے۔ آپ مجھے تلاش کرنے کی کوشش نہ کیجئے گا کہ یہ سب بے سود ہوگا۔ میں نوید وگو لے کر نہیں جا رہی ہوں۔ اس لئے کہ یہ اگر میرے ساتھ رہی تو میری خواست کا شہ اس پر زندگی بھر لگا رہے گا۔ اس لئے اسے آپ کے حوالے کر رہی ہوں۔ اگر انسانیت کے نامے آپ انصاف کر سکیں تو اپنا خون سمجھ کر اسے اپنے پیلو میں جگہ دے دیجئے گا۔ ورنہ اس شہر کے ختم خانوں کے دروازے تو ابھی کھلے ہوں گے۔"

خط میرے ہاتھوں میں تھا اور نوید و میرے پیلو میں۔ اور میں سوچ رہی تھی کہ اگر حمیدہ غریب نہ ہوتی، کمزور نہ ہوتی تو آج نوید و، شاذب کی جائز کہن ہوتی اور میرے زمیندار سسر کی وراثت کی حقدار بھی۔ لیکن.....

☆.....☆.....☆

## بھگی بھگی پلکیں

نگار نے کھڑکی بند کر دی۔ مہدی حسن کی پرسوز آواز دل چیرے دے رہی تھی۔ اس سے زیادہ نہیں جتا جا رہا تھا۔ آواز تو تھی ہی درد بھری، گیت کے بول بھی دل کے ٹکڑے ٹکڑے کئے جا رہے تھے، اور خسار آنسوؤں سے بھگ رہے تھے۔ ہر شعر حسب حال تھا۔

کھڑکی بند کر کے اس نے رخ بدلا اور ایک نگاہ شیراز عرفانہ اور نوشیلہ پر ڈالی سب کی سب وہی تھیں۔ وہ غنڈی سانس لے کر اپنے بستر پر آ گئی۔ وہ ایک ایسے گھرانے کی لڑکی تھی جہاں لڑکیوں کو کم تر مخلوق کا درجہ دیا جاتا ہے اور لڑکوں کو زندگی کے ہر شعبے میں اہمیت و اولیت سے نوازا جاتا ہے۔ سن شعور تک بیچنے بیچنے نگار کے دل و دماغ میں یہ بات انجمنی طرح چب چک تھی کہ وہ ایک ایسی زندگی ایک ایسا وجود ہے جس کا موازنہ صرف جانوروں کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔ جانور..... اپنی سوچ..... اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ جہاں بانداھا کیا، بندھ گئے، جو کھلا باندا لیا، بھی کبھی یہ بھی پڑ جاتے مگر بے زبان فریاد بھی نہ کر سکتے۔

ہاں آنسو وہ لٹا سکتے ہیں خوب خوب جتنے بھی ممکن ہوں سو نگار بھی نہ کچھ کہہ سکتی تھی نہ اپنی مرضی چلا سکتی تھی وہ ابھی بے زبان جانور تھی لیکن آنسوؤں پر اسے بھی قدرت حاصل تھی۔ چنانچہ وہ انیس رات کے اندر میرے میں لٹائی رہتی اور اپنا دامن بھگوتی رہتی۔

وہ خدا سے شکوہ کرتی کہ یارب! جب تیری دنیا میں ہم لڑکیاں اتنی ہی کتر حقیر اور بے مایہ مین تو نہیں اتنی سوچ، فکر کیوں دے دیتا ہے۔ ہمارا دماغ بھی بے صلاحیت کر دیا ہوتا ہماری اباں کو بھی چھین لیا کہ ہم یہ سوچ ہی نہ سکیں کہ ہمارے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟

مجروحہ سسک اٹھتی اور رات اس کے آنسوؤں کی نمی پا کر بھگ جاتی۔ نگار گھر میں سب سے بڑی تھی۔ اس کے بعد اس کا بھائی عاشر اور پھر تین بہنیں شیراز عرفانہ



اور ٹھیلے۔ ایک لوزر ڈل کلاس کے لیے جہاں کمانے والا ایک اور کھانے والے ڈھیر سارے ہوں وہاں چار بیٹیوں کا بوجھ کھڑے کھڑے دیکھ جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ نکار کے اماں اپا بیٹیوں سے آگے رہے تھے۔ پھر زمانے بھر میں لڑکیوں کی شادی کے مسئلے انہیں تنگ کر کے دیتے تھے کہ یا اللہ یہ بھڑکی سلیس کب نکھکیں گی اپنی جگہ سے؟ لڑکیوں کے بھی مسائل تھے کہ ان کے نزدیک ان کی وقعت محض بوجھ کی تھی۔

گھروں کے سارے گھرے ہوتے گئے نکار کی ماں رشتوں کے لیے مکر مند تھیں۔ نکار کا رنگ دیتا ہوا تھا۔ نقوش بھی واجبی سے تھے البتہ گڑبستی میں اس کا مانی نہیں تھا۔ پکانے سے لے کر پینے پر رونے تک اس کا سلیقہ سارے خاندان میں ضرب المثل تھا لیکن آج کے لوگ سیرت بعد میں دیکھتے ہیں اور صورت پہلے۔ نکار کے بعد شیراز بھی جو خاصی پرنسش تھی۔ اس کی ماں اسے دیکھ کر بولی ہی جاتیں کہ پروردگار غریبوں کی بیٹیوں کو اتنی جلدی بڑا کیوں کر دیتے ہو؟ وہ اپنا دل موسس کر رہ جاتیں۔

بڑی جگہ دو دو کے بعد ایک رشتہ آیا۔ لڑکا ایک کنبی میں ملازم تھا۔ بی اے پاس اور خاصا اچھا گھرانہ۔ نکار کے والدین نے اس رشتے کی حامی بھر لی اور جب لڑکے والے لڑکی دیکھنے آئے تو انہیں شرم سے کنبی نکار کے بجائے شوخ، اپنی باجی سے مذاق کرتی شیراز پر انداز آئی۔ گھر میں طوفان کھڑا ہو گیا۔ ابا کسی طور پر راضی نہ ہوئے کہ بڑی سے پہلے چھوٹی کا رشتہ ہو جائے لیکن اماں نے خشنی سا سانس بھر کر جب یہ کہا کہ آج کدے مانے میں بڑی چھوٹی کے چکر میں رہے تو دونوں کو لیے بیٹھدے ہو گئے تو ابا میاں نے چپ سا دھلی۔

رشتہ منظور ہو گیا۔ شادی کی تیاریاں شروع ہونے لگیں۔ وہ جتنے جو نکار اپنے لیے بنی تھی اب شیراز کے نام ہو چکا تھا۔ نکار نے اپنی شکل آئینے میں دیکھی تو سوچنے لگی کہ کیا یہی ہے مجھ میں۔ کالی ہوں، نقلی ہوں، لاولی ہوں، کیا عیب ہے مجھ میں۔ اگر کوئی نہیں تو پھر مسترد کیے جانے کی وجہ؟ وہ اپنا چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپے سسک پڑی۔

گھر میں بڑے ڈول بعد آئی چیل چیل کو دیکھ کر اس کا من سنہیل گیا اور وہ اپنے خیالات کو خضاب کر کے نہ بات اور احساسات کو سکون کی نیند سلا کے شادی کی تیاریوں میں لگ گئی۔ اگلے ہفتے شیراز کی شادی تھی۔ ابا میاں نے حسبِ توفیق بھیج دیا۔ نکار کے ہاتھوں کے کڑھے ہوئے سینٹ ٹوٹوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے وہ اس کے سلیقے اور بھرپور مدد کی تعریف کرتے

لیان یہ قریف بس یہیں فتم ہو جاتی آگے بات نہ ہو پاتی۔ شادی کے ہنگاموں میں ہی ذوالفقار کے گھر والوں کے ساتھ آنے والی ایک خاتون نے عرق نہ دیکھا اور پسندیدگی کا اظہار کر دیا۔ ذوالفقار جو شیراز کا شوہر تھا۔ یہ ان کی دور کی رشتہ دار تھیں۔

ابا میاں نے فی الحال بات نال دی کیونکہ ان کی شیراز کی شادی سے پہلے ہی جگہ کر دوہری ہو چکی تھی اور عرفانہ کی شادی کا بوجھ ان سے برداشت نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن اماں جو بعد سے میں گریں تو انہوں نے درود کر جائے نماز تر کر دی۔

”یارب تیرا شکر یہ جہنگ رزبان کیسے ادا کرے یارب تو اتنا بہت دے دے کہ یہ بوجھ اتر جائے میں ان کے فریاض سے سبکدوش ہو جاؤں۔“

دور کھڑی عرفانہ سہم کر رہ گئی۔

”تو اماں ہمیں اتنا بڑا بوجھ کبھی ہیں؟“ وہ بھیجی آنکھوں کے ساتھ پلٹ آئی اماں نے ابا کی بات کی اور انہوں نے یہ طے کر لیا کہ سادگی سے منگنی کر کے بات کو نہ جانے دیں اور پھر ماں بھر کے بعد اس کے بھی ہاتھ پہلے کر دیں۔ ابا میاں نے ایک نظر باورچی خانے میں مشغول نکار کے وجود پر ڈالی اور دل شگت انداز سے گردن ہلا دی۔

وہ خاتون پھر آئیں اور جب تک انہوں نے اقرار نہ کروا لیا انہیں نہیں۔ شیراز کی شادی ہو گئی۔ نکار کو بہن کی جدائی نے تڑپا دیا۔ وہ اس کے گلے لگ کر نہی طرح رو پڑی اور ایسے میں نہ جانے کیوں اماں نے ایک کرخت انداز سے اسے شیراز سے الگ کر دیا۔

اس کے دل پر چوٹ سی پڑی۔ شاید اماں آپ سوچ رہی ہیں کہ میری منہوس زندگی کا سایہ بڑا کی زندگی پر نہ پڑ جائے۔ دل خون ہو چکا تھا، آنکھوں سے ابونک رہا تھا۔ وہ سسکیاں لیتی اندر آئی۔ کسی سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی اور پھر کبھی بھی کیا؟ آخر کی پڑھائی فتم ہو چکی تھی اور اب وہ نوکری لے کر تاش میں تھا۔ ابا میاں نے بڑی کوششوں اور سفارشوں کے بعد اسے اپنی ہی کنبی میں جہاں وہ کام کرتے تھے کا ڈنٹ کے شیعے میں لگوا دیا۔ آخر نے بی کام کیا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ کسی بینک کو لے آئے کرے لیکن جب تک اسے اپنی مرضی کی نوکری نہیں ملتی اس نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ لیا اور ابا میاں کے ساتھ ہی کام میں مصروف ہو گیا۔

گھر کی آمد فی میں کچھ اضافہ ہوا تو سکون بھی آیا۔ ذوالفقار کے گھر والے آئے تھے شیراز

تری یادوں کے گلاب

وہ سوالیہ انداز سے آسمان کی جانب دیکھتیں۔ انہی دنوں آشر اپنی نئی نوکری کے سلسلے میں بے پناہ مصروف ہو گیا۔ وہ دلجمعی سے کام کر رہا تھا۔ نئی نوکری کا معاملہ تھا اس لیے اس نے کوئی کوتاہی نہ رہنے دی۔ پابندی وقت کا خیال رکھنا اور توجہ سے کام کرنا۔ بینک کے اسٹاف میں ایک لڑکی بھی تھی جو آشر کے ساتھ والی نشست پر کیشئر کے عہدے پر فائز تھی۔ شروع میں تو آشر اپنی توجہ کام کے علاوہ کہیں اور مرکوز نہ کر سکا تھا لیکن جیسے جیسے وقت گزرا ویسے ویسے اس کی توجہ اطراف میں بھی مائل ہوئی اور نیا معلقہ احباب بنا۔

اب کام کرنے میں اسے زیادہ لطف آتا۔ گھر کے مسائل ٹھکرا کر یہاں کے خوبصورت ماحول میں جھلکے جھلکے انداز سے باتیں کرتے ہوئے اسے ایک گونہ طہایت کا احساس ہوتا اور یوں اچانک اس کی طبیعت میں ایک سرکش جذبہ لمحہ بھر کو بیدار ہوانے سوچا کہ گھر کی ذمہ داریوں کی خاطر آخر میں کیوں اپنی زندگی کو تباہ کروں۔

اس نے اپنے وجود کا جائزہ لیا معمولی سے کپڑے، کوئی اہتمام نہیں، کوئی تیاری نہیں، وہ شرمندہ سا ہو گیا۔ پھر جب نگار کا سنا ہوا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوما وہ ششیں کی طرح کام میں جھٹ گیا۔

وہ اپنے ارد گرد سے بے پروا ششیں کی طرح سب کام کئے جا رہا تھا کہ اچانک خاموش فضا میں ایک مترجم آواز گونئی۔

”آپ کھانا نہیں کھائیں گے؟“ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

ساتھ والی کرسی پر بیٹھی یہ وہی لڑکی تھی جو اکثر بڑے چٹھے انداز سے آشر کو دیکھتی اور آشر مصوم بچے کی طرح گردن جھکا کر اپنے کام میں مشغول ہو جاتا۔ آشر نے دیکھا اس کی آنکھوں میں بڑی فتنہ انگ چمک ہے۔ لب مسکرا رہے ہیں اور وہ مجسم سوال بنی اس کی جانب غور سے دیکھ رہی ہے۔ وہ صرف یہی کہہ سکا۔

”جی نہیں میں شتم کر کے کھاؤں گا۔“

”اور سہ دینے دیجئے جان ہے تو جہان ہے دیکھئے میں نے بھی کھانا نہیں کھایا۔ آئیے مل کر کھاتے ہیں۔“ فتنیہ نے محبت بھرے انداز میں کہا۔

آشر نے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر مصوم خواہشوں کے سائے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ انکار کر دے مگر وہ بول نہ سکی۔

تری یادوں کے گلاب

سسرال میں خوش تھی۔ غریب والدین کی اس سے بڑھ کر اور خواہش کیا ہو سکتی ہے کہ ان کی بیٹیاں سسرال جا کر خوش و خرم زندگی بسر کریں۔ آشر کو بھی خیال تھا کہ ابھی اس کی تین بہنیں اور ہیں مگر میں سے نگار اور عرفانہ شادی کے قابل ہیں۔

وقت گزرتا رہا۔ پھر عرفانہ کی سسرال والوں نے شادی کا تقاضہ شروع کر دیا اور کہہ دیا کہ لڑکا سعود یہ جا رہا ہے۔ اگر آپ فوراً شادی نہیں کر سکتے تو ہم کسی دوسری جگہ بات کر دیں۔ نگار نے اس ارزاؤں سے انکار کیا۔

”نہیں نہیں نگار کے باپ پر رشتہ ہاتھ سے نکلنے نہ دینا کچھ بھی کر عرفانہ کی رضامندی کا بندوبست کر دو۔“ ابا میاں خود بھی کہتے تھے کہ ابھی انہیں تین بیٹیوں کو بیاہتا ہے۔ ان کی کوئی جائیداد یا ہونگہ نہیں تو بے نہیں جس کے بل بوتے پر وہ نالائے رہیں۔ سو وہ خاموش ہو گئے اور شادی کے ہنگامے ایک بار پھر گھر میں رنگ بھانے لگے۔

آشر نے کپہنی میں پوری محنت سے کام کیا اور بینک میں سروس کی تلاش بھی جاری رکھی۔ انہی دنوں جب عرفانہ کی شادی کی تاریخ پڑی، بینک میں نئی نوکری بھی مل گئی جو برلہ سے چلی نوکری سے بہتر تھی۔ لہذا ابا میاں کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ کبھی کبھار ابا میاں سوچنا کہ کاش نگار کے بجائے ان کا پہلا بیٹا ہی ہوتا تب یہ بوجھ کتنا ہلکا ہو جاتا۔ اس خیال سے وہ خاصے مطمئن ہوتے مگر نگار کا بھاری وجود جلد ہی انہیں اپنی حقیقت کا احساس دلانا پتا اور وہ تڑپ کر رہ جاتے۔

شادی میں ایک مہینہ رہ گیا تھا۔ اماں نے جو نکاح نگار کے لیے رکھ چھوڑے تھے، عرفانہ کو سونے دیئے گئے۔ نگار کے نصیب کا تو کچھ پتا نہیں تھا اور عرفانہ کی مانگ بھر گئی تھی نہ اس کے ہاتھ خالی کیوں رہتے۔ اپنی استطاعت سے کچھ بڑھ کر انہوں نے عرفانہ کا جھنجھٹایا تھا۔ ابا میاں ایک عرصے سے اس کپہنی میں ملازم تھے اس لیے وہاں سے خاصی رقم ایڈوانس مل گئی اور بات بن گئی۔

عرفانہ شادی کر کے چاکر سہارا میں خاصا سکوت چھا گیا۔ نوشیلا ابھی چھوٹی تھی اور اس کی کوئی ایسی فکر تھی تو نگار کی جیسے دیکھتے ہی اس کے سینے میں کچھ جلنے لگتا اور آنکھوں میں سر جھکی ہی بھر جاتیں۔

”یہ بوجھ کب ہٹائے گا خدا..... کب ہٹائے گا؟“

تری یادوں کے گلاب  
 ”آج اپنے ماں پلیز۔ مجھے زور کی جھوک لگ رہی ہے۔“ یہ سن کر آشر سوچنے لگا کہ کوئی تو ہے جو میری اتنی پروا کرتا ہے مجھے شین نہیں گوشت پوست کا انسان سمجھتا ہے۔ سرکش جذبہ پھر ابھرا اور وہ سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کھانے کے بعد گفتگو ہوئی۔ ایک دوسرے کے بارے میں مکمل تعارف ہوا۔ نام پوچھا تو اس نے ایک ادا سے کہا۔  
 ”میرا نام شفیعہ۔“

تکلفات کی دیواریں گرتی گئیں۔ اب آشر اور شفیعہ آپ جناب کی حدود سے نکل کر تم اور ٹو پر آگئے تھے۔ آشر شفیعہ سے بات کرتے وقت احساس ہوا کہ جیسے ساری دنیا میں جی ایک اس کی تھکس اور سچی دوست ہے جو اس کے جذبات و احساسات کو سمجھتی ہے۔  
 وقت پر لگا کر آشر رہا تھا۔ عرفانہ امید سے تھی اور چاہوید کے گھر والوں نے یہ کہہ کر اسے سینک بھیج دیا تھا کہ بھوک پیلی اولاد اس کے گھر ہوتی ہے اور اباسماں نے مسکرا کر اس کو خوش آمدید کہا۔ لیکن دل میں مسائل کی تھمسیں اٹھیں اندر ہی اندر خوفزدہ کیے جاری تھی۔ انہوں نے شام کو آشر سے بات کی۔

”بیٹا عرفانہ گھر آئی ہے۔ اس کے خرچے کے لیے پیسوں کی ضرورت ہوگی۔ میں ابھی اپنی کپھنی سے اور ایڈوانس نہیں لے سکتا تم کو کشش کرو تو۔۔۔“

اباسماں کی نرم آواز کمزور پڑ گئی اور انہوں نے بات ہی ادھوری چھوڑ دی۔ آشر کی پیشانی پر سلوٹش اور گہری ہو گئیں۔ دل نے سخت فیسے سے کہنا چاہا۔ ”ابا مجھے آپ مشین کیوں سمجھتے ہیں۔ میری ضرورتوں کا بھی تو کچھ خیال کیجئے۔ میری زندگی کو بھی تو پیسے کے علاوہ کسی نظر سے دیکھئے۔“

گھر اس کی زبان پر یہ الفاظ آتے آتے رو گئے۔ اباسماں کا پریشان چہرہ اسے کچھ کہنے سے باز رکھ رہا تھا۔ مگر لگا ہوں میں آکٹاہٹ صاف دیکھی جا سکتی تھی۔ اس نے بے دلی سے کہا۔  
 ”اچھا اباسماں میں کو کشش کروں گا۔“ نگار بھائی کو دیکھ کر کڑھتی۔ یا اللہ اگر تو مجھے لڑکا ہی بنا دیتا تو کیا حرج تھا اور پھر اس نے ایک فیصلہ کیا اور اس کے بعد جیسے وہ بے حد مطمئن ہو گئی ہو۔

اگلے روز آشر دفتر گیا تو اس کے چہرے پر لگر کے سائے تھے۔ عرفانہ کا زور چہرہ لگا ہوں میں آتا تو وہ سوچتا یہ نہیں کیا ایسے ہی اذیت دینے والی ہوتی ہیں؟ پھر وہ کام میں مصروف ہو گیا۔ ایڈوانس مانگنے کے خیال سے وہ جھجکا جا رہا تھا۔ ابھی اسے کام کرتے ہوئے عرصہ ہی نکٹا ہوا تھا کہ

تری یادوں کے گلاب  
 ”ایڈوانس مانگ بیٹھے۔ آج کام میں اس کا دل نہ لگ رہا تھا۔ جب سر پکڑا لے گا تو اس نے آکٹا کر خال بند کر دی اور سر پکڑ لیا۔ شفیعہ اسے دیکھتی رہی۔  
 اس نے دلی دلی آواز میں کہا۔

”کیا ہوا آشر کیا بات ہے۔ سر میں درد ہے؟“ آشر نے سر اٹھایا اور لاچارگی سے شفیعہ کی جانب دیکھا اور سر ہلا دیا۔

”ٹھیکٹ دول میرے پرس میں ہے۔“ وہ خاصی نگر مند نظر آ رہی تھی اور آشر نے سوچا کچھ اپنے ہو کر اپنے نہیں بن پاتے اور کچھ پرانے ہو کر اتنا خیال کرتے ہیں کہ اپنوں سے بڑھ کر عزیز ہو جاتے ہیں۔“ اس نے شفیعہ کی جانب دیکھا اور مسکرایا۔

لچک بیک میں شفیعہ نے اس سے پوچھا۔  
 ”آج بہت چپ چپ ہو کوئی خاص بات ہے؟“ آشر نے ٹال دیا۔  
 ”نہیں کوئی خاص بات نہیں بس ویسے ہی۔“ وہ نظریں چرا گیا۔

”اچھا اب مجھ سے بھی چھاؤ گے۔ مجھے بھی نہیں بتاؤ گے؟“ وہ روٹنے والے انداز میں بولی تو آشر نے ایک گہری نگاہ اس پر ڈالی۔ کتنی اپنی اپنی لگ رہی تھی وہ کہ جسے اس کی پریشانی کا احساس تھا۔ جو اسے خوش دیکھنا چاہتی تھی۔ پھر آشر نے ہلکا جھک ساری صورتحال شفیعہ پر واضح کر دی۔

شفیعہ نے چند لمحوں تک اس کے پریشان چہرے کی جانب دیکھا اور بولی۔  
 ”بس اتنی سی بات پر خود بھی پریشان ہوئے اور مجھے بھی پریشان کر دیا۔ یہ بھی بھلا کوئی مسئلہ ہے کہ جس کا حل نہیں۔ یہ رقم تم فجر سے ایڈوانس لینے کی بجائے مجھ سے قرض لے سکتے ہو۔“ کتنی بڑی بات اور کتنی آسانی سے وہ کہہ گئی تھی۔

آشر کی رگوں کا خون تیزی سے گردش کرنے لگا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔  
 ”تم نے مجھے اس قدر گرا ہوا اکب سے کچھ لیا کہ میں تم سے۔۔۔ تم سے قرض لوں گا۔“ وہ نیت ناراض نظر آ رہا تھا۔ شفیعہ نے مسکراہٹ کے جال پھینکے اور بڑی دلکش ادا کے ساتھ اس کے لبوں ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔

”آشر تم مجھے پتا سمجھتے ہو یا نہیں؟“  
 اس کی مسکراہٹ میں کیسا عرق تھا۔ کیسی کشش تھی؟ آشر کا فصد جہاں کی طرح بیٹھے نکٹا تھا۔



”اینانہ بھتا تو تم سے ساری باتیں کیسے کر لیتا؟“ وہ سادگی سے بولا۔

”تو پھر اپنے لوگوں کے کام آنے پر غصہ نہیں کرتا چاہیے ہاں“ وہ مسکرا کر بولی تو آشر کے دل کی نیا ڈوبنے لگی۔ اس نے اس کے گورے نازک ہاتھوں کو دیکھا۔ خوبصورت ہاتھ نری کے ساتھ اس کے مضبوط ہاتھوں کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھے۔ پھر اس کے چہرے، اس کی آنکھوں اور اس کے لبوں کی جانب وہاں اس کے لیے پیاری پیاری جگہاں چھوڑ چکا تھا وہ چونک کر نرم لہجے میں بولا۔

”مگر دیکھو غصہ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں تم سے.....“ وہ پھر جھجکا تو غصہ اپنا تیت سے بولی۔

”میں تمہیں قرض دے رہی ہوں اور قرض دے کر میں کبھی بھولتی نہیں یاد رکھتی ہوں۔ تم سے وصول کر لوں گی بے فکر ہو۔“ اور پھر غصہ کے ساتھ آشر کو تہہ لگاتے وقت احساس ہوا کہ اس کی اصل زندگی اب غصہ کے ہاتھوں میں ہے۔ جس نے اسے ہنسنا سکھایا ہے اپنے لیے جیتا سکھایا ہے۔

وہ گھر آیا تو خاصا سرور تھا لیکن آکر اسے معلوم ہوا کہ عرفانہ کی حالت خراب ہو گئی ہے۔ اسے ہسپتال لے جایا گیا ہے۔ وہ پریشان ہو گیا اور سیدھا ہسپتال پہنچا۔ عرفانہ کا آپریشن ہوا اور اس کے ہاس لڑکی پیدا ہوئی۔ اماں کا دل دھک سے رو گیا۔ ان کے ارمان بھگنے گئے۔ بیٹیوں کے بوجھ سے وہ واقف تھیں۔ عرفانہ کے سسرال والوں کے تیار بدلے بدلے معلوم ہو رہے تھے۔ اپنے سوال آنے کے بعد عرفانہ کو احساس ہو چکا تھا کہ اس کی حیثیت وہ نہیں رہی جو پہلے تھی۔ بیٹی نے اس کی گردن جھکا دی تھی۔

کتنے عجیب قانون تھے دنیا کے۔ بیٹی کو ختم دینے والی بھی ایک بیٹی، پیدا ہونے والی بھی ایک بیٹی اور نفرتوں کے تیر چلانے والی بھی ایک عورت..... کسی کی بیٹی۔

گویا کہ یہ اتصال عورت کا عورت کے ہاتھوں ہو رہا تھا اور وہ خاموش تھی۔ اسے خاموش ہی رہنا ہوگا۔ اسے زمانے بھر سے کیا مطلب؟ اسے تو جاوید کا خیال تھا۔ جاوید اس سے خوش رہے اسے اور کیا چاہیے۔

لیکن رات کو جب جاوید نے غصے سے بیٹی کی طرف انگلی کرتے ہوئے کہا۔

”اے دوسرے کمرے میں سلا یا کرو۔ نیند حرام کر دی کم بخت نے۔“ جاوید یہ کہہ کر کروٹ بدل کر شایہ سو گیا لیکن پھر عرفانہ پر وہ رات بھاری گزری۔ اس غمی ہی معصوم جان کو سنبھالنے سے لگائے ہوئے کسی نے کسی نے کہا اب تو اسے عمر بھر سکنا تھا۔

چند ہی دن بعد گوہر جس نے کہا تھا کہ وہ مسودہ یہ عرفانہ کو لے کر جائے گا تھا یہاں نے بنا کر چلا گیا کہ جلد ہی وہ بندوبست کر کے اسے بلا لے گا اور اب جلد سالوں پر محیط ہو رہی تھی۔ گھر والوں نے اس کو وہ درجہ دیا تھا جو ایک ادنیٰ ترین نوکرائی کو ملتا تھا ہے۔ لیکن عرفانہ نے چپ سادہ دل۔ وہ جیسے پتھر کی ہو گئی تھی۔ احساسات اور جذبات نے غاری۔ اسے معلوم تھا وہ سرنگی کرے تو کس شل بوتے پر آخر رہتا تو اسے نہیں ہے۔ اپنی بیٹی کی خاطر اسے سب جھیلنا تھا۔

لوہر غصہ نے خود ہی آشر سے شادی کا تذکرہ پھینک دیا۔ آشر نے سوچا تو ہزار بار تھا مگر مرد ہو کر بھی اس کی ہمت نہ پڑی تھی کیونکہ ذاتی مطابقت کے باوجود معاشرتی اور سماجی طور پر ان میں کوئی ہم آہنگی نہیں تھی۔ غصہ ایک امیر گھرانے کی ضدی اور خود پسند لڑکی تھی جو صرف اپنے شوق کی خاطر اور پابندیوں کے خلاف عمل پیرا ہونے کے لیے بینک میں سروس کر رہی تھی جبکہ آشر ہامیاں کی ریٹائرمنٹ کے بعد کبھی طور پر گھر کا ذمہ دار تھا۔ اس کی نوکری صرف اس کی نہیں گھر میں موجود اماں، ابا نوشیل اور پہاڑ سے ڈنی لگا کر بھی زندگی کا سرمایہ تھی۔

وہ صرف سوچ کر وہ غصہ خودی بولی۔

”کیا سوچنے لگے مجھے ہو تم کیا میں اچھی نہیں لگتی؟“ اس کی آواز میں وہی روضا ہین اٹھ آیا اور آشر اس کی ناراضی کب برداشت کر سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ تھام کر بولا۔

”مجھ میں اور تم میں بہت فرق ہے میں تمہیں وہ خوشیاں نہ دے سکوں گا جن کی تمہیں ضرورت ہے اور جو تمہارا حق ہیں۔ ایک دوست کی حیثیت سے۔ تمہیں سمجھا رہا ہوں اور منع کر رہا ہوں۔“

”بس بس کوئی نہیں تم میرے دوست، دوست ہوتے تو یوں دل توڑ دیتے میرا؟“ غصہ وہ پڑی اور آشر کے دل پر وہ آنسو بگی بن کر گرتے رہے۔

”تم مجھے کی کوشش کر غصہ۔“

”مجھے کوئی ضرورت نہیں سمجھنے کی۔ میں نے تم پر احماد کیا، تم کو اپنا جانا لیکن اب مجھے احساس ہوا کہ میں غلطی پر تھی۔ یاد رکھنا میں خود کو ختم کر لوں گی۔“ وہ بڑے عجیب لہجے میں بولی تھی۔ آشر کو احساس تھا کہ وہ بہت ضدی لڑکی ہے جو کبھی سے کہہ رکھا ہے کہ ”ختم“ بھی کر سکتی ہے۔ آشر اس کو اس حال میں ہرگز نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ یوں سماں کے مارے محبت سے بھرے دل نے بے بس ہو کر محبت کا اقرار کر لیا اور زندگی بھر ساتھ جمانے کا عہد کر لیا اور غصہ کے گرد

اجالوں کے وسیع حصار قائم ہو گئے۔

پھر کسی قدر جھجک کر آثر نے ماں سے بات کی۔ اماں جواب نوشیلہ کی فکر میں آدمی روہی تھیں چونک گئیں۔ وہ تو خود کسی موقع پر آثر سے نوشیلہ کے سلسلے میں بات کرنا چاہ رہی تھیں۔ ایک رشتہ تھا ان کی نظر میں۔ لیکن لڑکا نوشیلہ سے کافی بڑا تھا۔ لیکن اب بات کچھ اور ہو گئی تو انہوں نے خاموشی سے آثر کا کہا مان لیا۔ انہیں احساس تھا کہ بیٹا جذباتی ہے پھر سارے گھر کا دار و مدار بھی اسی پر تھا۔ اس کی خوشنودی بہر حال مقدم تھی۔

ابامیاں بھی خوش ہوئے لیکن ان کو ساتھ کام کرنے والے ارشاد کی بیٹی یاد آگئی جس میں انہوں نے اپنی بیٹیوں کا سارونپ دیکھا تھا اور چاہا تھا کہ وہ ارشاد کا بوجھ ہلکا کر دیں۔ آخر وہ بیٹیوں والے تھے اور اس بوجھ کو بخوبی سمجھتے تھے لیکن اب کیا ہو سکتا تھا، آثر تو فیصلہ کر ہی چکا تھا۔ بات صرف رضا مندی کی تھی اور ابامیاں کو یہ بھی احساس تھا کہ ان کے انکار سے اور تو کیا لڑکی بڑے گا مگر اتنا ضرور ہو گا کہ آثر ناراض ہو کر گھر سے بھی جاسکتا ہے۔ اس لیے انہوں نے دانشمندانہ فیصلہ کیا اور آثر کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

رات جانے کیوں ابامیاں کی آنکھوں سے دو سونے سونے آنسو چھٹک پڑے۔ کیا کر سکے تھے وہ اپنی اولاد کے لیے، کچھ نہیں، نہ آرام نہ سکون، نہ اطمینان نہ اچھا منی نہ اچھا حال اور نہ ہی اچھا مستقبل اور لڑکا تو دیکھ کر ان کی آنکھوں سے تھری ہی لگ گئی۔ انہوں نے اس کی زندگی بچا کر دی تھی، اس کے متعلق سوچنا چھوڑ دیا تھا یہ جانے بغیر کہ ان کی نظر اندازی سے کیا یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔

دو اچھے اور وضو کر کے جانے نماز پر گر گئے اور رو کر خدا سے کہتے رہے کہ مالک یا تو یہ بیاں دیتا ہے تو ان کے فرائض سے سبکدوش ہونے کی توفیق بھی عطا کر دیا کر۔

نکار دروازے میں ٹھٹھک کر رہ گئی۔ ابامیاں کہتے پریشان تھے اس کے وجود کے لیے۔ اس کی روح نے ماتم کیا تو اسے اپنا وجود کراہیت آمیز محسوس ہوا۔ وہ جانے کس خیال سے اپنے کمرے تک آئی کہ اماں نے آواز دی۔

”نکار..... اونکار..... کہاں ہے؟“

”بچ..... جی اماں اب یہی جی۔“ وہ یوں کہتی تھی۔ جانے کیا دل میں آیا تھا اس کے ایک دم اگر اماں اسے آواز نہ دیتیں تو وہ فیصلہ کرنے کے بعد عمل درآد کا سوچ رہی تھی۔ اپنی زندگی کو ختم

کرنے کا ارادہ کر لیا تھا اس نے۔

کنز دلای کہ جس کے اختیار میں حالات نہ رہے تھے۔ اب لاچار ہو چکی تھی۔ اس کی ذات بہت سوں کے لیے تکلیف کا باعث بن رہی تھی۔ وہ بہت مستحق تھی کہ اماں نے اپنا مدد عاید کیا۔

”نکار بھائی کی شادی سر پر ہے اور تو بالکل بے پروا کھوتی پھر رہی ہے۔ بری تیار کرنی ہے۔ ذرا میرا ہاتھ تو بٹا دے۔“ اور نکار بیٹھ کی طرح سر جھکا کر رہ گئی۔

پھر جو وہ دھیمیں سلاخیوں اور سونوں میں ابھی تو اپنی سمدھ بدھ ہی بھول بیٹھی۔ اس کے ہاتھ میں دو حسن تھا جو تخلیق پا کر اپنے منہ سے بول اٹھتا۔ اپنی بیٹیوں کے بھیڑ تیار کر کے اور اب اپنے بھائی کی نئی تیار کر کے اس کے دل نے ایک بار پھر گل کر بڑی زور سے کراہی اور وہ دل سوس کر رہ گئی۔

شادی کے دن قریب آگئے تھے۔ آثر اپنی استطاعت کے مطابق بہت کر رہا تھا۔ ابامیاں کو پشیمانی تھی۔ جس میں سے جانے کس مقصد کے تحت انہوں نے کچھ رقم بچالی اور باقی آثر کے پرادر کردی۔ آثر کچھ کچھ نہ سکا بس بچھ کر رہ گیا۔

میں نے اپنی زندگی اس گھر کے پیچھے بچا کر دی اور ابامیاں نے خوشی کے آنکھوں سے موقع پر بھی کجی دکھائی۔ اپنا پیسہ اپنا ہوتا ہے۔ وہ دل سوس کر رہ گیا۔ اس کے سرکش جذلوں کو فیصلہ نے بھی تقویت دی تھی۔ اکثر دفتر میں جب بھی وہ ایسے مسائل اٹھاتا فیصلہ جانے کہاں کہاں سے قسے وحوادث لاتی کہ فلاں لڑکے نے اپنے گھر کے لیے یہ کیا، اس کے والدین نے اس کے صلے میں اسے گھر سے نکال دیا اس کمانی اٹھائی۔

آثر کے ذہن کا کوئی نوعمر لڑکا نہیں تھا پھر بھی عورت اور وہ بھی خوبصورت، اکی عمرزدہ ہاتھوں میں بھٹک کر رہ گیا۔

شادی کا دن آن پہنچا شیزا کی سہراں بہت اچھی تھی۔ جس کا ثبوت شیزا کی بھری گود خوشیوں سے دستا چہرہ اور اس کا اطمینان و سکون تھا۔ وہ شادی سے ہفتہ پہلے آگئی تھی۔ جبکہ عرفان کو صرف دو دن پہلے آنے کی اجازت مل سکی تھی اور وہ بھی اس شرط پر کہ وہ ویسے کے دوسرے روز ہی واپس آجائے گی۔

انہوں نے پرنسز آنکھوں کو کاپتے ہاتھوں سے پونچھا اور اس کی دلجوئی میں لگ گئیں۔ جاوید نے پیسے بھی پیسے تھے سلمان اور کپڑے بھی۔ یہ مالگ بات تھی کہ اس کی ساس نے اسے کسی چیز کا

عرفانہ کی کہانی کھلی کتاب کی طرح میاں تھی مگر اس بچاری نے جو ایک نقطہ منہ سے نکالا ہو۔ تربیت بھی تو اماں ہی نے کی تھی وہ کس طرح چوک جاتی۔ اماں نے اس کے مرجھائے ہوئے چہرے سے نئے نئے لفظوں کے باوجود اس کی داستان پڑھ لی اور غنڈی آؤ بھر کر وہ چپ ہو گئیں جو تیری رضاناک۔

شادی کے دن بڑا ہنگامہ رہا۔ عرفانہ کے چہرے پر برسوں بعد دلکش مسکراہٹ آئی تھی۔ بھائی کی شادی بہنوں کا سب سے بڑا ارمان جو ہوتی ہے۔ وہ بھائی سے خوشی کے مارے لپٹ لپٹ جاتی اور آشر کے نرم دل میں بہنوں سے محبت کا طوقان جوش میں آ جاتا۔ شادی کی رات آشر کو گاہ کہ جیسے شفیعہ نے اس کے اطراف اچالے ہی اچالے نکھیر دیئے ہیں۔ رتھیں اچالے خوشبودار اچالے اور وہ اس رنگینی اور خوشبو میں کھو گیا۔

شفیعہ کے گھر والے اونچی سوسائٹی کے لوگ تھے۔ انہوں نے آشر کے گھر کے کوئے کوئے کو بڑی عقارت سے دیکھا اور سخت لفظوں میں طعنہ تجسّے دینے سے بھی باز نہ آئے۔ یہ دشت انہوں نے صرف اور صرف شفیعہ کی ضد پر طے کیا تھا۔ وہ بھی اس وعدے پر کہ وہ جلد ہی اسے لے کر ان کے ہاں واپس آ جائے گی یعنی گھر وادادان معاملہ۔

یہ ساری صورتحال آشر سے چھپی ہوئی تھی۔ اسے اس حقیقت کا کچھ علم نہ تھا۔ شادی کے دن گزرے اور حالات معمول پر آنے لگے۔ آشر نے نیک جانا شروع کر دیا تو شفیعہ نے ضد کی۔ "آشر میں اپنی سروس جاری رکھنا چاہتی ہوں۔ سارا دن تمہارے ساتھ تو رہوں گی یہاں اکیلے۔" اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے آشر نے سادگی سے جواب دیا۔

"اکیسے؟ کسی باتیں کر رہی ہو۔ شفیعہ نگار ہے، نوشیلہ ہے ابامیاں اور اماں ہیں پھر اکیلا پن کیسا؟ سروس نہیں اب تمہیں گھر سنبالنا ہے۔ باہر کے کام میری ذمہ داری ہیں۔ اوکے۔" اس نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ مگر شفیعہ روتھ کر اندر جا چکی تھی۔ وہ غصے دیا بالکل بچوں کی طرح ضدیں کرتی ہے۔ مان جائے گی خود ہی مجھ و ابامیاں اور اماں کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا۔

شام کو دواہی ہوئی تو شفیعہ کا فصرہ بدستور پایا۔ اس نے اسے سمجھایا تو وہ ایک ادا سے بولی۔ "آشر میں چاہتی ہوں ہم دونوں مل کر کچھ کریں۔ اس گھر کی حالت تو سدھرے۔ یہاں

یہی ہی کھانے والے کیا کم ہیں جو میں بھی ان میں شریک ہو جاؤں۔ ابھی تو تمہارے کانٹوں پر اکا اور نوشیلہ کا بوجھ بھی ہے۔"

اس کے لہجے کی نفرت میاں تھی لیکن وہ حقیقت سے دور بھی نہیں تھی۔ آشر لہجہ بھر کو سوچ میں پڑ گیا۔ پھر مردانہ خود اعتمادی کے ساتھ بولا۔

"اللہ مالک ہے سب ہو جائے گا۔ تم ابھی سے فکر میں لگ گئی ہو۔ چلو کھانے لے آؤ بڑی بوک لگ رہی ہے۔"

وقتی طور پر بات آئی مئی ہو گئی۔ آشر کو پر دوشوں مل گئی تھی۔ اس کے مہدے میں ترقی کے ساتھ ساتھ محظوظا میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا تھا۔ وہ خوشی سے پھولے نہیں مار رہا تھا۔

"شفیعہ تم نے واقعی اس گھر میں اچالے نکھیر دیئے۔ یہ دیکھو آج اچالوں کی ابتداء میری زنی سے ہو گئی ہے۔" سرشاری اس کے لفظوں سے لپک رہی تھی۔ مگر آشر کو اس وقت سخت مایوسی ہوئی جب شفیعہ کی طرف سے کوئی اچھا پاسہ نہیں ملا۔

"بڑے خوش ہو رہے ہو تم اس چند سو کی ترقی پر۔ نگار اور نوشیلہ کی منگوس شکلیں تمہیں نظر نہیں آتیں؟ کہاں تک کر دے ان کے لیے یہ لوگ تمہیں گھاس تک نہیں ڈالتے۔" شفیعہ کے لہجے میں زہری زہر تھا۔ آشر یک لخت چپ ہو گیا۔ وہ اس خوشی کے موقع پر ان باتوں کا تصور تک نہ کر سکتا تھا۔

"تم کیا کہنا چاہتی ہو؟" وہ جیسے دور اندھیرے میں بول رہا تھا۔

"میں بھلا کیا کہہ سکتی ہوں۔ تم نے بیوی بنا کر اس گھر کو میرے پر دیا تھا مگر تمہاری اماں اور بہنیں مجھے اس حق سے محروم کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ ان میں سے کسی کو تم سے محبت نہیں ہے۔ سب تم سے پیسے کی لالچ میں یہ کھادے کی محبت جتاتے ہیں۔ ابھی میری شادی کو کتنے دن ہوئے ہیں کہ اماں نے نئے کپڑے جو وہ میرے لئے لائیں تھیں۔ نوشیلہ اور نگار کے لیے رکھنے شروع کر دیئے۔ یہ دونوں میری جان کا عذاب ہیں۔ یہ مجھے جیسے نہیں دینا گی۔"

آشر کا سکون تباہ ہو چکا تھا۔ دن بھر کا تھکا ہارا گھر میں سکون نہ پاتا تو اس کے اعصاب شل ہو جاتے۔ کوئی غیر متوقع بات نہیں تھی۔ صبح نگار بڑی توجہ کے ساتھ ناشتہ بنا رہی تھی۔ نوشیلہ اور نگار نے دونوں کی شادی کے کٹنی ماہ گزر جانے کے باوجود بھائی کو ایک کام نہ کرنے دیا تھا۔ وہ صبح خود ہی بھائی کو ہمیشہ کی طرح ناشتہ بنا کر دیتیں۔ چائے کے گھونٹ لیٹے وقت اس نے بے



حفیظہ نے آشر کے بدلے تھوڑے کیچے تو چالاک سے بات بتائی اور روتے ہوئے بولی۔

”آج لباساں نے نگار کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ وہ یہ قسم نہ سکے اور۔۔۔“ آشر اس کے قرب میں ان کمرورنگوں میں اپنے آپ سے ہار گیا۔ نگار کے خلاف نفرت کا لاوا اس کے خون میں گردش کرنے لگا۔ اب وحشت میں نگار کا وجود لباساں کے بعد اسے پہاڑ سے زیادہ وزنی محسوس ہوا۔ پھر ایسا ہوتا رہا کہ وہ بات بات پر نگار کو نرئی طرح جھڑک دیتا۔ سخت گفتگوں میں زانت دیتا اور وہ صرف آنسو بھائی خاموش پلٹ جاتی۔ مگر بن گیا تھا سب لوگ نئے گھر میں شفٹ ہو گئے۔ اماں کی حالت غیر ہو چکی تھی ابابھٹا کے بعد اور اب بہو کے کرتوت دیکھ کر وہ اور لاغر ہو چکی تھیں۔ بہو انہیں آشر کے جانے کے بعد بات بات پر نہ بھاؤ کی سناپی کہ وہ کچھ بول بھی نہ پاتیں۔ جن کی بڑی سے بڑی بات پر لاوا دے بھی نہ کی نظر اٹھا کے بھی نہ دیکھا تھا، ان کی بہو ان کے منہ پر وہ باتیں کر جاتی کہ ان کے دل کی دھڑکن معدوم ہونے لگتی۔

جب اس نے یہ نیک کہہ دیا کہ تم لوگ کتوں کی طرح روٹی کے ٹکڑوں کی لالچ میں آشر کی جان سے لگ گئے ہو تو ان سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ اتار و نہیں کہ کچھ بھر کو حفیظہ بھی ڈر گئی لیکن دوسرے ہی لمحے دوسرے جھک کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

شام کو نوشیلہ سے برداشت نہ ہو سکا۔ اس نے اپنے بھائی سے بھالی کی شکایت کر دی اور جب آشر نے یہ سنا کہ حفیظہ نے ان گفتگوں میں اماں سے بات کی تو وہ کھول کر رہ گیا اور قبل اس کے کہ وہ اندر جا کر حفیظہ سے بات کرنا دو روٹی ہوئی باہر آئی۔

”خود نکادی مچوئی چلی۔“ وہ نوشیلہ سے مخاطب تھی ”تمہاری بیٹیں ڈانٹیں ہیں۔“

”حفیظہ۔“ آشر بری طرح گرجا۔

”مجھ پر غصہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اپنی بہنوں کو قاتل کرو جو کسی کے سنبھالنے میں نہیں آ رہیں۔ ایک پرانے محلے کے ادھار سے کتنی زہی ہے اور دوسری کسی اور کو چھانسنے لگی ہے۔ گل میں نے خود دیکھا اس نے کھڑکی سے کسی سے چھپ چھپ کر بات کی نہ اور پھر اس کے ہاتھ میں ہزار ہزار کے نوٹ تھے۔ میں نے پوچھا تو اس نے کہا اس کی سبکی نے رکھوائے ہیں اس کے پاس۔ ارے جیسی یہ خود وہی اس کی سہیلیاں۔“

حفیظہ کی زبان نے جو زہر اگلا اس نے ایک ایک کو سر پہ کر دیا۔ ایک فیرت مند بھائی یہ بھلا کب برداشت کر پاتا۔ غصے نے سوچنے بھننے کی ساری صلاحیتیں ختم کر دیں۔

خیالی میں نگار کی جانب دیکھا جو پر اٹھا بنا رہی تھی۔ اور شاید اس کا ہاتھ جل گیا تھا۔ اچانک نگار نے پوچھا۔

”بھیا اگل دوں۔۔۔۔۔“ اور۔۔۔۔۔ اور آشر حواسوں میں لوٹ آیا۔ نگار بھائی سے بڑی نہیں تھی مگر محبت اور چاہت میں وہ آشر کو خود سے بڑا سمجھتی۔ اس کی سمجھتوں کے عوض وہ اسے کیا دے رہا تھا؟

وہ بالکل کر رہ گیا۔ مگر آیا تو ایک اور مصیبت تیار تھی۔ حفیظہ کی بیٹیں اور کزنز آتی ہوئی تھیں اور اس کو سخت گفتگوں میں ملامت کر رہی تھیں کہ تو اس جھوٹیزی میں پڑی ہے حیرا مگر نہیں ہے کیا؟ آشر سے یہ باتیں برداشت نہ ہوئیں اور وہ بول پڑا۔

”شوہر کا گھر بیوی کے لیے محل ہے خواہ وہ جھوٹیزا ہو یا۔۔۔۔۔ اور آپ کون ہیں ہمارے معاملات میں دخل دینے والے؟“ آشر کوچ کوچ غصہ کیا۔ اس نے نگار نے آکر کہا۔

”بھیا پہلے کھانا کھا لو۔“ اس کا اتنا کہنا غصہ ہو گیا۔ حفیظہ زہمی تا مگن کی طرح پنکھاری۔

”اس کھیت نے بھائی کو ایسا سر چڑھا رکھا ہے کہ وہ کسی دوسرے کی ستنے تک نہیں۔ اس نے انہیں میرے شوہر کی بجائے اپنا بھائی بنا کر قید کر دیا ہے۔“ وہ رونے لگی پھر بولی۔

”آشر آج فیصلہ ہو ہی جائے میں اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔ تمہیں الگ گھر لینا پڑے گا۔“

بات بڑھ رہی تھی چنانچہ ابابھٹا نے مصالحت کروادی آشر بھی خطا ہو گیا۔ اسے علم تھا کہ حفیظہ کس ماحول میں پئی ہے۔ مگر وہ کیا کرنا وہ مجبور تھا۔ پھر اس نے بینک سے لون لیا اور زمین خرید کر خیر شروع کروادی۔

حفیظہ کو نگار سے خدا واسطے کا ہیر تھا۔ وہ اس کی عقل دیکھتے ہی ایسے منہ بتاتی کہ نگار کا کچھ بچھلنی ہو کر رہ جاتا پھر حفیظہ کو کچھ اور نہ سوجھا تو اس نے اخرام لگا دیا کہ نگار گلی کے کسی لڑکے کو اشارے کرتی ہے۔ ابابھٹا کا دل دلی گیا۔ آج یہ بات حفیظہ نے کئی کل یہ سارا محلہ دہرائے گا۔ جبکہ بات کچھ نہیں تھی۔ وہ نگار کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ بڑی صابر، شریف النفس اور خود ارادگی تھی۔ وہ بہو کو بھی کچھ نہ کہہ سکے۔ دل پڑ کر ایسے ہنہ گئے کہ پھر اٹھ ہی نہ سکے۔

انہیں دل کا شہید دورہ پڑا اور ہزار کوششوں کے باوجود وہ سنبھل نہ سکے اور سب گوردتا بلکہ چھوڑ کر آرام کی فیند سو گئے۔ نگار کی رورور کر حالت خراب ہو رہی تھی۔ بہنوں نے اسے سنبھالا۔

وہ بچے چہرے آئے تو وہ کھٹکلا کر ہنس پڑی۔ اتنا ہنسی اتنا ہنسی کہ پوری دنیا اسے فقط ایک قہقہہ معلوم ہوئی۔

آج وہ پاگل خانے میں اپنی کوفٹری میں دیکھی بیٹھی رہتی ہے۔ کھلی آنکھوں سے دور غلاؤں میں دیکھ کر جانے کیا سوچتی اور پھر اس قدر ہنستی ہے اس قدر ہنستی ہے کہ آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ اس کی بھیگی پپ لگا ہیں، منٹا ہوا چہرہ موت سے قریب اور زندگی سے دور ہوتا جاتا ہے۔ عورت کے ہاتھوں عورت کا اتصال۔ یہ لگا کر جانے کی تو پاگل خانے میں لگا رہی کوئی اور صابر عورت جس کا صبر ختم ہو چکا ہو بھرتی ہو جاتی ہے اور میں سوچتی رہتی ہوں کہ آخر عورت کو کتنا صبر ملنا چاہیے۔ آخر عورت کو کتنا صابر ہونا چاہیے آخر عورت کو کتنا شاکر ہونا چاہیے۔

مگر اس کا مجھے جواب نہیں ملتا اور سوال مزید الجھتا جاتا ہے۔ عورت کو کتنا آسان نہیں یہ کھلی کتاب ضرور ہے مگر اس کی زبان سادہ نہیں یہ ایک الجھا ہوا مسد ہے کہیں سے کچھ کہیں سے کچھ۔ عورت، عورت کو کبھی سمجھے گی بھی یا نہیں۔۔۔ یہ کون جانے؟؟؟؟

☆.....☆.....☆

تری یادوں کے گلاب

”یہ میں کیا سن رہا ہوں نوشیلہ؟“ نوشیلہ کی تو جیسے قوت گویائی سلب ہو کر رو گئی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کی بھابی کیا کچھ کہہ رہی ہے۔ وہ بے طرح رو پڑی۔

”یہ جھوٹ ہے، بھیا اثرام ہے۔ اثرام ہے یہ بھیا۔“ وہ ہاتھوں میں چہرہ چسپا کر اس طرح رو رہی تھی کہ اماں کا کچھ پھٹ گیا۔

”اگر یہ جھوٹ ہے تو دیکھو اس کی الماری میں اس نے میرے سامنے دو ٹوت رکھے تھے۔“ آخر خوشخوار نظروں سے اسے گھورتا ہوا الماری کی جانب بڑھا اور اس نے ایک جھٹکے سے الماری کھول کر سارے کپڑے گرادیے اور پھر اس کے ہاتھ میں ہزار ہزار کے کی نوٹ تھے۔ جو نوٹ نہیں انکارے تھے شیلے تھے، خون تھے، سرخ سرخ خون۔

نوشیلہ کو سکتے ہو گیا۔ اس نے خواب میں بھی ہزار کے اسٹے نوٹ نہیں دیکھے تھے۔ یہ بھابی کی چال ہو سکتی ہے۔ اس کو معلوم تھا فطرت بہت دنوں سے یہ کہہ نہیں گئی اور نہ ہی اس کے پاس اسٹے پیسے تھے۔ وہ غصے سے اندر گیا اور بولا۔

”اب میں اس مگر میں نہیں رہوں گا۔ تم لوگوں کی خاطر میں نے اپنی زندگی کو زندگی نہ سمجھا اور تم نے..... اب میں ایک ٹپ بھی نہیں رہوں گا اس مگر میں۔ چلو فطرت۔“ اور فطرت نے ایک فاحشاں نگاہ اطراف میں دوڑائی۔ مسکرا کر نوشیلہ نگار اور بے دم ہوتی اماں کو دیکھا اور پھر آشر کے ساتھ چل پڑی۔ اماں کے لبوں سے بھٹکل نکل سکا۔

”آ..... آشر..... نہ نہ نہ چاہیے۔ نہ چاہیے۔“ مگر آشر اس وقت اپنے آپ میں کہاں تھا۔ ماں کی دم توڑتی پکار نے اس کے قدم نہ روکے اور وہ بچتے رو واڑے کو دیکھتی رہ گئیں۔ اور انتظار بھی نہ کر سکیں۔ انہوں نے خاموشی سے آنکھیں موند لیں اور نگار پچھلی پچھلی آنکھوں سے کبھی اماں کو دیکھتی اور کبھی نوشیلہ کو..... کبھی نوشیلہ کو اور کبھی اماں کو..... نوشیلہ کے شفاف دامن پر آنسوؤں کے داغ تھے۔ اور ماں کے جھریاں بھرے چہرے پر تاسف کے سائے۔ وہ اپنی بیٹیوں کو ذلت کے غار میں گرنا دیکھتی رہیں۔ اس نے نوشیلہ کے معصوم چہرے کی جانب دیکھا جہاں اب ابدی سکون تھا۔

اور پھر..... اور پھر..... نگار کو ساری کائنات گھومتی محسوس ہوئی۔ بھابی کی صورت نظر آئی۔ وہ گھوم گئی۔ گھومتی گئی..... اور پھر جیسے نگار کے صبر نے دامن چھڑا لیا۔ وہ صبر کر رہی تھی مگر کہاں تک کرتی۔ نگار کا صبر اب تمام ہو چکا تھا۔ اس کی نگاہوں میں اپاسیاں، اماں اور نوشیلہ کے روئے





تری یادوں کے گلاب

سالہ دلا چٹا اور سارٹ جوان تھا۔ تین برس پہلے جب وہ ان کے چنگے کا ایک حصہ کرائے پر لینے آیا تو سارہ نے صاف انکار کر دیا۔ اس انکار کی وجہ یہ تھی کہ ریاض تن تھا تھا۔ اس کا نظریہ تھا کہ کرائے دار شادی شدہ اور بچوں والے ہونا چاہیے۔ لیکن جب ریاض نے وردناک انداز میں اسے بتایا کہ کس طرح اس کا پورا خاندان بنگلہ دیش میں مارا گیا اور وہ خود سختی تکلیفوں سے پاکستان پہنچا تو اس کا دل پیچنے لگا۔ ریاض کا کہنا تھا کہ اس کے باپ نے فقط بالقدم کے طور پر اپنے کچھ اثاثے پہلے ہی پاکستان منتقل کر دیئے تھے۔ اس کے بل بوتے پر اس نے اپنا اپورت ایک سپورٹ کار بزنس جمایا تھا۔

سارہ نے ہٹا کر چنگے کا ایک حصہ اسے کرائے پر دے دیا۔ ریاض نے وعدہ کیا تھا کہ وہ کسی شکایت کا موقع نہیں دے گا۔ گزشتہ تین سالوں سے سارہ کو یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ وہ رات کو کبھی دیر تک باہر نہیں رہا اور نہ ہی کبھی اس نے اپنے کسی دوست کو اپنے ہاں دعوت کیا۔ غزل نے وائیکس آکر اس کو بتایا کہ ریاض اس کی حراج پرسی کے لیے آتا چاہتا ہے۔ اس کو یہ جان کر ایک عجیب سی طمانیت کا احساس ہوا کہ اس کی بیٹی کے علاوہ کوئی اور شخص بھی اس کی پیاری سے پریشان ہے۔ ان نے فوراً اسے بلوایا۔ ریاض تمہاری دیر بیٹا اپنی عادت کے مطابق نظریں نیچی کیئے نہایت اپنائیت سے باتیں کرتا رہا۔ پھر کا ایک شکایت آ میرے لیے میں بولا۔

”آئی مجھے اس بات کا بعد قفل ہے کہ آپ نے مجھے اپنی پیاری کے بارے میں از خود بتانا پسند نہیں کیا۔ یہ درست ہے کہ میرا آپ کے ساتھ خون کا رشتہ نہیں بہر حال انسان اور مسلمان ہونے کے ہٹے تو میرا آپ سے کبھی نہ ٹوٹنے والا تعلق ہے۔ آپ یقین کریں کہ میں آپ جیسی اولوالعزم اور بلند حوصلہ خاتون کو دل کی گہرائیوں سے حقیقی ماں کی طرح چاہتا ہوں۔ آپ مجھے اجازت دیں کہ جب تک آپ بیمار ہیں ڈاکٹر اور دواؤں کے لیے میں خود بھاگ دوڑ کروں۔“

ریاض کی اپنوں جیسی باتیں سن کر سارہ کا دل بھرا۔ دنیا میں اس کا بیٹی کے سوا کوئی نہیں تھا۔ ایک شام اس کی طبیعت اچھا ہو گئی۔ ریاض اس کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ غزل باورچی خانے میں کھانا تیار کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ سارہ نے ورد سے غل حال ہو کر ریاض کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُکھڑے اُکھڑے لہجے میں بولی۔

”بیٹا میں جانتی ہوں کہ اب میں زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہ سکوں گی میرا آخری وقت آ گیا ہے۔ لیکن میرا دل غزل کے لیے پریشان ہے۔ میں نے اپنی پھول جیسی بیٹی کو بڑی تشناؤں اور

تری یادوں کے گلاب

آرزوؤں سے پالا ہے۔ کبھی غم کی پر چھائیاں اس کے پاس نہیں چھٹکتے دیں سوچتی ہوں میرے بعد اس غریب پر کیا بیٹے گی۔ کاش میں نے اس کی شادی کر دی ہوتی۔“

ریاض نے فوراً گھوٹ کر لہجے میں جواب دیا۔

”آئی آپ درست کہتی ہیں۔ دنیا بہت غراب ہے۔ تھلاڑی کو جیسے نہیں دیتی۔ مجھے بھی یہی لگ رہا تھا۔ چارے ہی ہے خدا خواست میرے منہ میں خاک، اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو میں بھی اس کی دیکھ بھال کرنے سے معذور ہوں گا ورنہ لوگ فوراً بات کا پتھر پٹا دیں گے۔“

بے بس سارہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے قدرے وقف کے بعد ریاض نے چنگے ہوتے کہا۔

”آئی میرے دل میں ایک بات ہے۔ لیکن ڈرتا ہوں کہیں آپ نہ اذیت کریں۔ دیکھیں غزل کی طرح میں بھی دنیا میں تنہا ہوں۔ اگر آپ مجھے اس قابل سمجھیں تو غزل کو میری زندگی میں شامل کر دیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں اسے بے پناہ پیار دوں گا اور میری زندگی میں اس پر غم کی پر چھائیاں بھی نہیں چڑے گی۔“ کہتے کہتے اس کا خلق سوکھ گیا اور وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ اس کی توقع کے برعکس اس کی بات سن کر سارہ کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ وہ خوشی سے بے قابو ہو کر بڑبڑائی۔

”بیٹا اتم ایک ایک اور شریف انسان ہو مجھے تم پر مکمل اعتماد ہے اپنی بیٹی کی رائے پر چلوں ویسے مجھے اُمید ہے کہ وہ انکار نہیں کرے گی۔“

ریاض کے جانے کے بعد اس نے غزل کو بلا کر مڑوہ ستایا تو اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے ابھی تک شادی یا کسی مرد کے متعلق سوچا ہی نہیں تھا اس کی زندگی کتاہوں کے گرد گھومتی تھی۔ وہ ریاض کے بارے میں صرف یہ جانتی تھی کہ وہ ان کا کراہیہ دار ہے اور اس نے کرائے کی بروقت ادائیگی کے علاوہ بھی انہیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ لیکن اس کا ماضی کیا ہے۔ اس کے ذاتی خیالات کس نوعیت کے ہیں۔ وہ زندگی کو کس زاویے سے دیکھنے کا عادی ہے۔ اس بارے میں وہ غور مند ہو گئی۔ ظاہر ہے ایک تعلیم یافتہ لڑکی کے ذہن میں اپنے ہونے والے شوہر کے متعلق اس قسم کے سوالات قدرتی طور پر اٹھتے ہیں۔ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن ورد سے ترقی ماں کے تاثرات دیکھ کر اس نے اندازہ لگا لیا کہ وہ اس کے منہ سے صرف ہاں سننا چاہتی ہے۔ چنانچہ اس نے جذباتی لہجے میں جواب دیا۔

احساس دلادیا۔ "ریاض نے غزل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔  
"غزل خدا کے لیے مجھے غلط نہ سمجھو۔ تم جانتی ہو کہ دنیا میں تمہارے سوا میرا کوئی نہیں ہے۔  
مجھے تم سے اتنی محبت ہے کہ میں آفس میں تمہارے ہی تصور میں کھویا رہتا ہوں۔ یہ ایک معمولی سی  
کاروباری پریشانی ہے دور ہو جائے گی۔"

اگلے روز غزل نے رات کے کھانے پر پوچھا۔ "آپ کے مسئلہ کا کوئی حل نکلا۔"  
اس نے نرم سامنے ہاتھ کر جواب دیا۔ "قسمت خراب ہے میں نے مختلف دوستوں سے قرض  
لینے کے لیے رجوع کیا ہر ایک نے اپنی اپنی مجبوری کا دوا دوا دیا۔ کاش کسی طرح یہ رقم میرے پاس  
آ جاتی تو پچاس ہزار کے بجائے ڈیڑھ لاکھ کا سامنا ہوتا۔"

غزل نے آہستگی سے سوال کیا۔ "اگر کوئی بندہ دست نہ ہو سکا تو کیا ہوگا؟"  
ریاض نے سر ہلکے میں کہا۔ "مجھے چند سالوں کے لیے جیل جانا پڑے گا۔"  
اس کا یہ ہولناک جملہ سن کر اس پر ہلکی کرکھی اور وہ ہڑا کر اٹھ بیٹھی۔ خوف کے مارے  
اسے پیسے آنے لگے۔ ریاض کے جیل جانے کے بعد اس کا کیا ہوگا۔ اس نے کپکپاتی آنکھوں میں کہنا  
شروع کیا۔

"خدا کے لیے ریاض کچھ کرو۔ اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو میں جیتے ہی سرجاؤں گی۔ میرا آپ  
کے سوا ہے کون؟"  
ریاض کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ اپنے ہونٹوں پر زبان بھیر کر گھو گھر لپچے  
میں بڑبڑایا۔

"میں خود پریشان ہوں۔ پچس کر رہ گیا ہوں۔ کوئی بڑی چیز بھی پاس نہیں جسے چاکر کر تم  
حاصل کر سکو۔" وہ خاموش ہو کر اپنے ہونٹ کاٹنے لگا بھر زیر لب بڑبڑایا۔ "ایک صورت ہے،  
لیکن مجھے ذاتی طور پر پسند نہیں۔"

غزل کے اصرار پر اس نے تجویز پیش کی کہ "ہم فی الحال یہ بلکہ فروخت کر دیں۔ یقیناً اس  
نے سات لاکھ لاکھ روپے مل جائیں گے۔ سامان چھڑانے اور فروخت کرنے کے بعد ہم ہی رقم  
سے کسی اور جگہ کوئی بلکہ خرید لیں گے۔ یہ کہتے کہتے اس نے غزل کو کن انکھوں سے دیکھا۔ غزل کو  
دھچکا لگا۔ اس ہنچلے کو اس کے مرحوم باپ بے بڑے شوق سے تقریر کر رہا تھا اور اس کے ایک ایک  
کوشے سے اس کے ہاضی کی حسین اور خوشگوار یادیں وابستہ تھیں۔ پھر بھی اس نے اپنے دل پر پتھر

"ای میرے مستقبل کی بابت فیصلہ کرنے کا اختیار صرف آپ کو ہے آپ جو کچھ کریں گی  
وہ میرے حق میں بہتری ہوگا۔" دوسرے دن چند پڑوسیوں ڈاکٹر اور اس کی فرس کی موجودگی میں  
نہایت سادگی سے غزل کا نکاح پڑھوایا گیا۔ اس مختصر تقریب میں شرکت کرنے والا ہر شخص دل  
ہی دل میں سائزہ کی حالت زار پر افسوس کرتا رہا۔ چند عورتیں آبدیدہ بھی ہوئیں کیونکہ انہیں صدمہ  
تھا کہ اس کی شادی عداوت کے سبب غزل کی شادی دھوم دھام سے نہ ہو سکی اور جس شادی میں  
ہنگامہ رانی نہ ہو بھلا وہ بھی کوئی شادی ہے؟

تیسرے دن سائزہ سوتے میں چل بسی۔ اس کے مردہ چہرے پر ایک آسودگی طاری تھی۔  
غزل پر قیامت ٹوٹ گئی۔ ریاض کی اپنی حالت خراب تھی۔ ہم اس نے غزل کو مدت وصولیہ  
کے لیے بادل خواست اپنے آپ کو سنبھالا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ غزل کے غم میں کمی آ  
گئی۔ ریاض ایک عام سادہ تھا لیکن اس کے غلوں سے متاثر ہو کر غزل اسے دل و جان سے  
چاہنے لگی۔ وہ اکثر تنہائی میں سوچتی کہ اس کی مرحوم ماں نے بروقت اس کی شادی کر کے اچھا ہی  
کیا اب وہ دنیا میں بے سہارا نہیں۔  
اس طرح چھ ماہ گزر گئے۔

ایک دن کھانا کھانے کے دوران غزل نے غصے سے کہا کہ ریاض کچھ اچھا اچھا اور کھانا کھوایا  
سا ہے۔ اس نے پریشان ہو کر اس سے اس کا سبب پوچھا تو اس نے ہال دیا لیکن جب غزل کا  
اصرار بڑھتا گیا تو وہ وہاں سے ہل گیا۔

"میں نے بیرون ملک سے سات لاکھ روپے کا سامان امپورٹ کیا۔ ایک مقامی پارٹی  
نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ رقم ادا کر کے سامان چھڑائے گی۔ اس طرح پچاس ہزار روپے مجھے  
بچ جائیں گے لیکن میں موقع پر پارٹی غائب ہو گئی۔ اب میں پریشان ہوں کہ اتنی بڑی رقم کہاں  
سے لاؤں۔"

"آپ بینک سے قرض لے لیں۔" غزل نے مشورہ دیا۔  
اس نے اس نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔  
"بینک سے مجھے ایک لاکھ تک قرض مل سکتا ہے۔ میں نے وہی لے کر ایل سی سکھوائی تھی۔  
بہر حال تم پریشان مت ہو، یہ میرا مسئلہ ہے۔" غزل شکایت آمیز لہجے میں بولی۔  
"یعنی آپ کا مسئلہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔ آپ نے بڑا اچھا کیا جو مجھے میری حیثیت کا

تری یادوں کے گلاب

رکھے ہوئے ریاض کو اجازت دے دی۔ بگھر فروخت ہونے کے بعد وہ ایک چھوٹے سے مکان میں منتقل ہو گئے جس کا کرایہ زیادہ نہیں تھا۔ نئے احوال میں غزل کو پہلے پہل آگاہی ہوئی، اکثر اس کا دل ڈوب ڈوب جاتا تاہم وہ یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دیتی کہ چند ہفتوں کی بات ہے۔ مال کی فروخت کے فوراً بعد ایک شاندار بگھر خرید لیا جائے گا۔ ممکن ہے وہ پہلے کی نسبت زیادہ پرکشش ہو۔ ایک دن ریاض خوش خوش گھر آیا اور اس کے سامنے چند کاغذات پھیلا تاہواچکا۔

”جان میں ایک نیا کاروباری ادارہ تمہارے نام سے رجسٹر کرانے لگا ہوں۔ تم نے میری محبت میں جس طرح بلا چرن و چراں اپنے باپ کا بگھر فروخت کر دیا، اس نے مجھے تمہارا زرخیز نظام بنادیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس دوسری کمپنی کی قانونی طور پر تم خود مالک تصور کی جاؤ۔ میں ٹیبلر کی حیثیت سے کاروبار کی دیکھ بھال کروں گا۔“ غزل کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس نے اسے موقع دینے بغیر اس کا ہاتھ تھام لیا اور جذباتی انداز میں بڑبڑایا۔

”خبردار میری مخالفت نہ کرنا۔ میری ایک چھوٹی سی خواہش تھی جس کی تکمیل ہو رہی ہے۔ اس میں ایک فائدہ بھی ہوگا کہ ہمیں انکم ٹیکس بچانے میں مدد ملے گی۔“ غزل نے اس کے آخری منٹے کو ذہن میں رکھتے ہوئے خاموشی سے کاغذات پر دھیلا کر دیئے۔ کمپنی تشکیل پانے کی ریاض بہت خوش تھا۔ وہ بات بات پر قہقہے لگاتا۔ غزل کے لیے اس نے نت نئے تحائف کی بھرمار کر دی تھی۔ غزل کا خیال تھا کہ نئی کمپنی پہلی کمپنی کی طرح اسپورٹ ایکسپورٹ کا کام کر رہی ہوگی۔ لیکن ایک دن جب اس نے ریاض کے بیک میں درجنوں پاسپورٹ دیکھے تو حیرت سے ان کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

”مجھے سعودی عرب کی ایک کمپنی نے ریکرونگ کا ٹھیکہ دیا ہے۔ تم دیکھنا تمہاری کمپنی ایک ڈیڑھ سال میں مال مال ہو جائے گی۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے برف کیس میں رکھے ہوئے نوٹوں کے ذخیرہ دکھائے۔

غزل تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود زندگی کے عملی پہلوؤں کے بارے میں بہت کم علم رکھتی تھی۔ اس کا ایک سبب یہ تھا کہ اس کی ماں نے اس کو شروع ہی سے تنہائی پسند بنا دیا تھا۔ کالج میں اس کی ایک دو سہیلیاں تھیں مگر وہ بھی اسی طرح کی۔ ہر وقت مطالعے میں مصروف رہتیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے ریکرونگ کے بزنس کو ایک عام سا بزنس جان کر اس کے متعلق اپنے شوہر سے کوئی پوچھ کچھ نہیں کی۔

تری یادوں کے گلاب

ایک ماہ بعد ریاض نے راتوں کو گھر سے غائب رہنا شروع کر دیا۔ پہلی بار اس کی اس حرکت پر فکر تشویش کے سبب غزل کے اعصاب جھنجھٹا اٹھے۔ وہ ساری رات جاگتی رہی اور ایک بل بھی در پیچے سے بٹا گوارہ نہیں کیا۔ اسے لگتا تھا کہ ابھی اس کے شوہر کی گاڑی آتی دکھائی دے گی لیکن وہ نہیں آیا۔

صبح اس نے اس کے دفتر فون کیا۔ وہ وہاں موجود تھا۔ اس کی آواز سنتے ہی اس نے معذرتوں کا ایک طویل سلسلہ شروع کر دیا۔ دوپہر کے وقت وہ مگر پہنچا اور اسے سمجھانے لگا۔ ”کاروباری مصروفیات یقیناً بڑھ گئی ہیں۔ سعودی عرب جانے والوں کے انتظار کے سلسلے میں مجھے دوسرے شہروں میں جانا پڑتا ہے۔ اگر میں بروقت اطلاع نہ دے سکوں تو طویل نہ کرنا۔ بس ایک دو ماہ کی بات ہے۔ افرادی قوت کی سپلائی کا ٹھیکہ پایہ تکمیل تک پہنچ جائے پھر تمہیں یورپ کی سیر کرانے لے جاؤں گا۔ ہم روم بیس اور جنیوا میں کم از کم چار ماہ گزاریں گے۔“ اس نے ہشاش بشاش انداز میں قہقہہ لگایا۔ غزل مستقبل کے حسین پسوں میں کھو گئی اور اسے ایک بل کے لیے بھی شبہ نہ ہوا کہ ریاض نہیں اُس کی بد نصیبی عین مقصد میں کمزری اس پر قہقہہ لگا رہی ہے۔

ایک بار ریاض مسلسل تین ہفتوں کے لیے غائب ہو گیا۔ پہلا ہفتہ تو اسلام آباد اور کراچی سے روز اس کے فون آتے رہے لیکن پھر یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ایک دن اس کو ایک مختصر سا خط اسے ملا جو حیرت سے لکھا گیا تھا۔ جس میں لکھا تھا کہ وہ اس سے آگاہ کیا ہے اور اب اس کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتا۔ اس خط کے ساتھ ہی طلاق نامہ منسلک تھا۔ وہ پہلی پہلی آنکھوں سے اس کاغذ کے پڑے کو دیکھ کر جا رہی تھی اور پھر یکدم بیہوش ہو کر گر پڑی۔

جب اسے ہوش آیا تو وہ یہ دیکھ کر پٹکرائی کہ پولیس کے درجنوں سپاہی اور چند پڑوسی اسے گھیرے کھڑے ہیں۔ اس کو پانی پلایا گیا۔ حواس بحال ہوئے تو اس پر بدھشت ناک انکشاف ہوا کہ اس کی بیہوشی کے دوران پولیس نے اس کے گھر کا دروازہ توڑ کر ہر کوئی کی تلاشی لی اور اس تلاشی کے دوران کلی سو جھلی پاسپورٹ، جھلی مہر کی اور تیس ہزار روپے نقد برآمد کر لیے۔ متعدد افراد کی شکایت پر پولیس نے پہلے ریاض کی ریکرونگ ایجنسی پر چھاپہ مارا اور وہیں سے اس کے گھر کا پتہ حاصل کیا۔

ریاض لا پتہ تھا لیکن غزل کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس نے اپنے بیان طوطی میں جج بولتے ہوئے



تری یادوں کے گلاب

اعتراف کر لیا کہ پاسپورٹ مہر میں اور میں ہزار روپے ریاض نے آخری بار جاتے وقت اس کے سپرد کیے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے پولیس کو اصل مال سے بھی آگاہ کر دیا۔ وہ بے سہارا تھی۔ اسے اپنے شوہر کی جعل سازی کا کافی بھرا اندازہ نہیں تھا۔ اس نے اس کا آخری خط اور طلاق نامہ دکھایا لیکن اس کی صداقت پر کوئی کان دھرنے کو تیار نہیں تھا۔

پولیس نے ریاض کو مسرور قمر دے کر غزل کے خلاف دھوکہ دی اور جعل سازی کا پالانچ عدالت میں پیش کر دیا۔ چند ماہ تک اس مقدمہ کی کارروائی جاری رہی۔ اس کے بعد ایک عدالت اسے مجرم قرار دے کر دو سال قید با مشقت کی سزا سنائی۔

تقدیر کے اس بھانک مذاق پر وہ بہت روٹی۔ لیکن بے گناہوں کے تو بے پنیے سے چاند اور سورج کی گردش پر کیا فرق پڑتا ہے۔ پھول کھلتے ہیں، نشان دکھاتے ہیں اور پھر دھول میں گھر جاتے ہیں۔ موسموں کی آنکھ بچوئی اس پر کوئی اثر نہیں ڈالتی۔ زندہ رہنے کی لاشعور خواہش انسانوں کو مہر پر رخصت کر لیتی ہے۔ یہی کچھ غزل کے ساتھ ہوا کب تک روتی اس کی آنکھیں قبرستان کی طرح سنسان ہو گئیں اور اس نے بے بسی سے سوچا کہ میرے ساتھ جو ہوا اس میں سرور اللہ کی کوئی مصلحت ہوگی۔

شاید اسی سوچ کا نتیجہ تھا کہ وہ چھ ماہ سے بھی کم مدت میں جیل کے ماحول سے ماؤں جو مٹی۔ معاشرے کے تشکیل دیے ہوئے اس جبر سے اس نے اپنے آپ کو محفوظ پائی تھی۔ یہاں کوئی عورت دوسری کو کھنڈ نہیں دیتی تھی کیونکہ قانون کی نظر میں وہ سب کی سب مجرم تھیں۔ معاشرے نے ان کو بے رحمی سے دھتکار دیا تھا اور انھیں اپنے ٹھکانے جانے کا بے حد فہم تھا۔ پھر بھی یہ گوشان کے لیے گوش عافیت تھا۔

جیل میں اپنی آخری رات گزارتے ہوئے غزل ایک جلی کے لیے نہیں سوئی۔ وہ دروازے کی سٹافوں کے ساتھ سرنگائے ڈرے ڈرے انداز میں مسلسل سوچ رہی تھی کہ ہوائے کے بعد وہ کہاں جائے گی اور کیا کرے گی۔ ماں کی موت کے بعد اس کا واحد سہارا اس کا شوہر تھا لیکن طلاق کے بعد اس کی یہ بھانگی بھی ٹوٹ گئی۔ اس کا بھگ اس کا واحد اٹا تھا، ریاض نے دھوکے بازی سے اس کو بکوا کر ساری رقم ہتھیائی تھی۔ اب وہ بالکل فلاح تھی۔ اس نے خوفزدہ ہو کر سوچا، جیل سے رہائی پا کر مجھے کون سر پیمپانے کے لیے جگہ دے سکتا ہے اور پھر کھانے پینے کا بندوبست فوری طور پر کیونکر ممکن ہو سکتا ہے؟

تری یادوں کے گلاب

اس کی یہ مشکل حیرت انگیز پر جیل کے پرنسٹن فنڈ نے حل کر دی۔ رہائی کے وقت ضابطے کے کاغذات پر اس کے حقدار تھے اسے اس نے اس کو اخلاقی قدروں پر ایک طویل اور جذباتی لیکچر دیا جس کا لب لہجہ تھا کہ اسے باقی بھلا سنا دے زندگی میں کسی قسم کا جرم نہیں کرنا چاہیے۔ غزل کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ پرنسٹن فنڈ یہ سٹیج سوچ کر بہت خوش ہوا کہ اس کے پند اثر وعظ کے سبب وہ عداوت کا اظہار کرنے پر مجبور ہوئی ہے۔ نام۔ اس نے اس سے اس کے گھر کا پتہ پوچھا۔ وہ ہکا کر ہوئی۔

”سراسیمہ کوئی تھا کہ نہیں۔ میں نے آپ کو بتا دیا تھا تھاں کہ میرے شوہر نے مجھے طلاق دے دی تھی اور پولیس نے مجھے گرفتار کرتے وقت میرے گھر گھر کی تمام اشیاء ضبط کر لی تھیں۔ ظاہر ہے مالک مکان نے اپنا مکان کبہا نہ رائے پر دے دیا ہوگا۔“

پرنسٹن فنڈ سوچ میں پلٹا، گلے ملے وہ انھیں اور اسے اپنے ہمراہ آنے کا اشارہ کیا۔ جیل کے گیٹ سے باہر نکل کر اس نے بھولی آنکھوں سے چاند و آسمانوں طرف دیکھا اسے ایک عجیب سے کھیلنے والے کا احساس ستار پالانچ کے بیرونی اماں ٹھکانے میں اسٹاف کے کوارٹر رہنے ہوئے تھے۔ پرنسٹن فنڈ اسے اپنے کھنڈ لایا۔ راست میں چاند وہ اسے بتا چکا تھا کہ اس کی بیوی بڑی نیک دل اور درجہ ہے لیکن قیات ہے کہ اس کے حراں شرابچ میں شک کا عنصر غالب ہے۔ غزل کو پہلی نظر میں وہ ادیبہ عورت بہت مہم گئی۔ اس کے شوہر نے ہر نے جوں ہی غزل کی داستان سنائی تو اس نے بے اختیار اسے اپنے ٹھکانا کیا لیکن پرنسٹن فنڈ سمجھ کے جاتے ہی اس کے چہرے پر خنکی کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اس نے اذیت آج اندازہ انداز میں اپنے شوہر کی بے وفائی کے قصے سنائے شروع کر دیے۔ غزل نے پاؤں کے نیچے سے زمین پر لپٹا کر رک گئی۔ وہ چند چپے پہلے بہت خوش تھی کہ اللہ نے قیام سے غرضت کچھ جس کی مدد کی ہے۔ وہ لگتا وہ کچھ دن اس کے گھر میں گزارنے کے بعد اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرے گی۔ پرنسٹن فنڈ نے قیام کی بیوی کے انکشافات کے بعد اس کا یہاں قیام ناممکن تھا۔ اچانک وہ اٹھ کھڑی اور کمرے سے چلی نکلی تھی تو بڑی دیر بعد وہیں آ کر اس نے غزل کو دوسروں سے دیکھے اور پھر اپنا داناں میں ہوئی۔

”خدا کا واسطہ تم اس نے سے پہلے چلی جاؤ۔ میں زندگی بھر تمہارا احسان نہیں بھولوں گی۔ میرا شوہر دو سال پہلے اسی طرح ایک رہا۔ ہاں، ہونے والی لڑکی کو گھر میں لایا تھا، لیکن ایک ہفتے بعد وہ اسے میری سہیل پر چل گیا۔ میں نے اسے اس کو کسی نہ کسی طرح چٹا کیا لیکن

”تم نے لباس تبدیل نہیں کیا؟“

میں اس وقت وہ غزل کو دیکھ کر خشک۔ وہ ڈولی کا بھائی حسین تھا، تین یکنخت خوشی

سے چلایا۔

”آپ..... آپ اکیلی آئی ہیں آئی نہیں آئیں؟“

غزل کو ایک جھٹکا لگا۔ وہ اس کی مرحومہ ماں کے بارے میں سوال کر رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ اس نے اپنی ماں کی موت کی خبر ڈولی کو نہیں دی تھی۔ وہ اپنے اوپر قابو پاتے ہوئے افسردہ لہجے میں بولی۔

”اوی کا انتقال ہو چکا ہے ڈولی کہاں ہے؟“

اسی اثنا میں گاڑی والا شخص بھی اندر آ گیا تھا لیکن اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔

حسین پریشان لہجے میں بولا۔

”ڈولی اور گھر والے مری گئے ہوئے ہیں۔“ اس دہشت ناک انکشاف نے اسے ہلادیا۔

کراچی میں وہ کسی اور کو نہیں جانتی تھی۔ اگر گھر میں حسین تھا ہے تو وہ وہاں کیوکر قیام کر سکتی تھی۔ اس کا ذہن پریشان ہو گیا۔ دوسرا شخص حسین کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

”تم عجیب انسان ہو۔ ہمیں انہیں کیا کھڑے کھڑے چن کر دے۔ جانے کہاں سے

سڑکر کے آئی ہیں۔ پھیلے مانس انہیں ڈرائیج روم میں بٹھاؤ۔“ حسین نے شرمندہ ہو کر ذرا ذرا

کھولا اور سڑک کے اشارے سے اندر آنے کو کہا۔ غزل چنگاپائی لیکن طویل سفر کی جھک کے زیر اثر

اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ حسین نے فریج سے کوئلہ ڈربک نکالنے کے لیے کیا تو

انہی نے ہچکچاہا۔

”آپ کہاں سے تعریف لائی ہیں؟“

”لاہور سے۔“ اس کا جواب مختصر تھا۔

انہی نے اپنے ہونٹ سکیڑے اور بولا۔ ”ڈولی لوگ دو ماہ بعد مری بسے واپس

آئیں گے۔“

”دو ماہ بعد۔“ اس نے گھبراہٹ میں اسی کا جلد ہرایا۔ انہی کبیر ہاتھا۔

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ نے جب تک رہتا ہو، یہاں رہیں۔ حسین موجود

ہے۔“ اس نے حسین کو لٹو ڈربک لے کر آ گیا۔ وہ جو شیلے لہجے میں چلایا۔

پھر جاتی ہو میرے شوہر نے مجھے کیا سزا دی۔“ وہ خاموش ہو کر استغماپہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی پھر خود ہی بولی۔

”مجھے ایک سال اپنے سینکے میں گزارنا پڑا۔“

غزل نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے کوارٹر کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ اس کے قدم تیزی سے سڑک کی طرف اٹھ رہے تھے۔ ایک طویل عرصہ کے بعد اس نے ٹھیلے دوکا نہیں، تیز رفتار گاڑیاں اور انسانوں کے جھوم دیکھے تھے۔ اسے حیرت اور پریشانی کا ملا جلا احساس ستانے لگا۔ اس وقت موسم صاف اور دھوپ تھی۔ اس نے ایک رکشہ کو لیا اور تارنگی آگئی۔ اس کا ذہن ایک فیصلہ کر چکا تھا۔ پرنٹنگ نے بھی دوسروں سے دے دیے تھے۔ پرنٹنگ نے اسے بتایا تھا کہ ڈربح سال کی سزا بھگتے کے دوران اس سے حکام نے جو شقت لی ہے یہ دوسروں سے اس کا معاوضہ ہے۔ غزل نے ایک اچھی کپڑے اور پہنے کے لیے چند کپڑے خرچ لیے اور اس کے بعد اس نے ایک بار پھر رکشہ غمرا یا اور اس میں بیٹھ گئی اور اسے انہیں کی طرف چلنے کے لیے کہا۔ وہ لاہور کو خبر یاد کہ کر کراچی جا رہی تھی۔

سفر کے دوران اس کی حالت بت بھی تھی۔ اس نے کسی سے بات نہیں کی۔ مسکراہٹ تو جیسے اس کے چہرے سے تاپہ ہو چکی تھی۔ آزاد دنیا میں اس کا وجود انہی جیسا تھا۔ کراچی آنے کا فیصلہ اس نے اس لیے کیا کہ اس کا خیال تھا کہ صرف اسی طرح وہ لاہور اور لاہور سے وابستہ تھی اور زہریلی یادوں کی ہولناک گرفت سے وہ نجات پاسکتی ہے۔ وہ اپنی مرحومہ ماں کے ساتھ دو پار کراچی آ چکی تھی۔ اس کے سکول کی سبلی ڈولی بھی چاہ کر سیک آئی تھی۔ ماں بیٹی دونوں نے ایک بار اس کے ہاں قیام بھی کیا تھا۔ غزل کے ذہن میں تھا کہ وہ فی الحال ڈولی کے گھر قیام کرے گی۔ بعد ازاں ملازمت مل گئی تو علیحدہ مکانے کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ کینٹ انہیں پرگاڑی رکھی تو وہ جلدی سے نیچے اتری۔ باہر آ کر وہ ایک گلی میں بیٹھ گئی اور ڈربا بھوکہ پھینکے۔ جب وہ ایک چھوٹے چھوٹے کھلے ہوئے گیت میں داخل ہوئی تو متحجب سے ایک گاڑی کے پارن کی آواز ابھری۔ اس نے سڑک دیکھا ایک لمبو سے چہرے والا نوجوان سمجھا۔ نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔ دونوں کی نظریں چارہوئیں۔ غزل نے فوراً اپنا منہ موڑ لیا۔ اس نے دو قدم پیٹھے اٹھائے تھے کہ اندر سے ایک سانو لے رنگ کا نوجوان تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔ گاڑی میں سوار شخص غالباً اس کا بے تکلف دوست تھا، کیونکہ وہ اس کو دیکھتے ہی چلایا۔

تری یادوں کے گلاب

”بالکل..... بالکل“ غزل کو یوں لگا جیسے وہ نیل کی مصیبت سے نجات پانے کے بعد ایک نئے عذاب میں مبتلا ہو گئی ہے۔ اس نے ان دونوں کے اصرار پر سیون اپ لی اور گہرا سانس لے کر کہنے لگی۔

”یہ مناسب نہیں ہے میں آپ لوگوں کی مسمون ہوں گی اگر آپ کسی شرط نہ اور سستے ہوٹل میں میری رہائش کا بندوبست کر دیں۔“ ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا قدرے توقف کے بعد تین بولا۔

”کسی تھلاڑی کے لیے ہوٹل کا ماحول اچھا نہیں، آگے آپ کی مرضی۔“ غزل کے دل پر ایک اور چرکا لگا۔ اگر وہ تنہا ہوتی تو اپنی بے بسی پر پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ دلتا انجینی نے اپنا پاپ سلاکتے ہوئے دریافت کیا۔

”کیا آپ کراچی میں دفتر تنقیر کے لیے آئی ہیں؟“

اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

”جی نہیں۔ میرا ارادہ یہاں مستقل قیام کا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ کچھ عرصے کے لیے میری رہائش کا بندوبست ہو جائے۔ اس دوران میں ملازمت تلاش کر لوں گی، پھر سارے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔“ تین نے بے صبری سے کہا۔

”غزل آخر تمہیں ہمارے گھر میں ٹھہرنے میں اعتراض کیا ہے؟“ وہ سوچ رہی تھی کہ منہ باندا انداز میں اپنا مقبوم اس کو کس طرح پہنچائے گا انجینی بولا۔

”ایک غیر شادی شدہ لڑکی کا اس طرح اکیلے تنہا رہنا یقیناً معیوب ہے۔ میں ان کی ہنگامہ بازی کا راز کچھ نہیں سمجھتی۔“ غزل نے جواب دیا۔

”میرا مشورہ ہے کہ آپ دائی ڈبلیو اے ہوٹل میں رہائش کر لیں۔ جب ڈولی واپس آ جائے تو پھر آپ لوگ یہ معاملہ خود طے کر سکتی ہیں۔“ اس کی یہ تجویز غزل کو ڈوبنے کے لیے جیسے تھکے کا سہارا تھی اس نے پہلی بار اس کو غور سے دیکھا اور پوچھا۔

”دائی ڈبلیو اے ہوٹل ہے کہاں؟“

اس کے بجائے تین جلدی سے بولا۔

”ہندو روڈ پر بی بی پاکستان کے بالمقابل۔ لیکن غزل میں پھر اصرار کروں گا کہ آپ اس گھر کو اپنا گھر تصور کریں، جو بی بی پاکستان کو غم ہو گا کہ آپ نے دائی ڈبلیو اے کو ترجیح دی ہے تو یقیناً وہ

تری یادوں کے گلاب

آپ سے ہمارا ضرور ہوگی۔ آپ عابدی باتوں پر توجہ نہ دیں اس کا دماغ ہر وقت لفظ میں الجھا رہتا ہے۔ ظاہر ہے ایسے اچھے لوگ.....“ عابد نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

”اچھا اچھا تم اپنی کواں بند کرو۔ یہ پیادری پریشان ہے اور تمہیں دل لگی سوچنی ہے۔“ غزل کے دل میں یکوقت عابد کے لیے احترام کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ اس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”آپ مجھے دائی ڈبلیو اے تک پہنچانے کی زحمت برداشت کریں گے؟ میں کراچی کے راستوں سے تانا شتا ہوں۔“

غزل نے جواب دیا کہ وہ اس کو گاڑی میں بٹھا کر دائی ڈبلیو اے لے آئے۔ تین نے بھی ساتھ چلنے کی ضد کی، لیکن عابد نے اسے سختی سے منع کر دیا۔ اس کے تاثرات سے لگتا تھا کہ اس نے عابدی اس بات کا خاصا برا مانا ہے۔ غزل کی خوش قسمتی تھی کہ ہوٹل کی انچارج عابد کی شاسا نگلی، اس لیے وہاں کمرہ حاصل کرنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ غزل نے نہایت عقیدت سے اس کا شعر یہ ادا کیا اس پر وہ ہنسنا اور اس کو خندہ احافظ کہہ دیا اس چلا گیا۔

غزل دور دورہ بند کر کے لباس تبدیل کئے بغیر اپنے بستر پر دراز ہو گئی۔ سفر کی محنت اس کی جڑوں میں سرایت کر چکی تھی۔ ایک طویل مدت کے بعد اسے وقتی طمانیت کا احساس ہوا تھا۔ اس نے دھشت زدہ ہو کر سوچا۔ ”عابد ایک اچھا انسان ہے اگر وہ نہ ہوتا تو نہ جانے اس وقت وہ کد

حال میں ہوتی۔“

اس کے پاس بیسوں کی کمی تھی۔ اس لیے اس نے ہوٹل کی مگران سے کہا تھا کہ وہ ایک بیچ کے قیام و طعام کے ایڈوانس پیسے ادا کرنے کو تیار ہے۔ عابد بھگداز انسان تھا۔ اس نے اس کی معاشی مجبوری کا اندازہ لگا دیا اپنی جیب سے ایک ماہ کے اخراجات کی پیشگی ادائیگی کر دی تھی۔ غزل نے اسے بہت روکا لیکن اس نے ایک نہ سنی۔ رخصت ہوتے ہوئے اس نے اپنے محسن سے پوچھا۔

”آپ کیا کرتے ہیں؟“ وہ آہستگی سے گویا نہ بولا۔

”میں بخیر زندگی میں بگھڑا ہوں۔“ غزل کے سر سے ایک بوجھ اتر گیا۔ ایک ماہ کے لیے وہ پریشانی سے نجات پا چکی تھی۔ اب اسے ایک ہی فکر تھی کہ کسی طرح کوئی معقول قسم کی ملازمت مل جائے۔ اس مقصد کے لیے اس نے اخبارات میں شائع ہونے والے اشتہارات کے جواب دیں



ترمی یادوں کے گلاب

”کھل آپ اس کمپنی میں رپورٹ کریں۔ یہ آپ کا اپوائنٹمنٹ منٹ میٹر ہے۔ فی الحال آپ اس کی اسامی پر رکھا گیا ہے، آٹھ سو روپے ماہوار تنخواہ ملے گی۔ ان جیسوں سے آپ کے دل کے اخراجات باآسانی پورے ہو جائیں گے۔ جب آپ کو معقول ملازمت مل جائے تو چاہتے ہی دے دیں“

خزل کے بدن میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ گزشتہ چند دنوں سے یہ سوچ سوچ کر رخت پہن چکی تھی کہ اگلے ماہ وہ ہوشل کے اخراجات کہاں سے ادا کرے گی۔ اس نے کچکپاتے ہاتھوں مانا انفر مارہ پکڑا اور اپنی بے پناہ مسرت کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے لرزتی آواز کہنے لگی۔

”میں آپ کی ہمیشہ منوں رہوں گی۔“ اس نے لا پرواہی سے اپنے کندھے اچکائے۔

”اس میں مثنویت کی کون سی بات ہے۔ اس کتنی کا مالک میرا دوست ہے۔ وہ میری بات مان گیا اس لیے در خواست اور انٹرویو کی ضرورت نہیں پڑی۔ اچھا میں غزل اب اجازت دیں۔“

”غمریے عابد صاحب! میں آپ لوگوں کے لیے جائے متکواؤں۔“ دو اپنی نشست سے اُٹھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔

”تکلف کی کوئی ضرورت نہیں، جب آپ کو پہلی تحفہ ملے گی تب آپ کی چاہے ہم پر  
 ہر ہوگی۔“

دو از خود کھٹکھا کر ہنس پڑی۔ ایک طویل عرصے کے بعد آج پہلی بار اس کے آجڑے ہوئے پر شادابی نے دھک دے دی..... دیکھتاں میں ایسا کبھی کوئی پھول ظاہر ہوتا آ نکھوں کو بڑا بھلا لگتا ہے۔ اس کی ہنسی بھی اسی نوعیت کی تھی۔ جس نے عابد اور حسین کو چونکا دیا۔ حسین نے جاتے جاتے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا ہوا اور آہستگی سے بولا۔

”وہ ڈولی مرنے سے واپس آ جائے تو میں آپ کی شکایت کروں گا۔“

”میں نے آپ کو جانے کی دعوت دی مگر آپ نے قبول نہیں کی۔“ اس کا لہجہ شکایتی تھا۔  
 ماہر اس کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا بڑبڑایا۔

203

تری یادوں کے گلاب

درخواستوں پر درخواستیں بھیجنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اسے کراچی آئے ہوئے چار دن ہو چکے تھے۔ عابد دوبارہ اس سے ملنے نہیں آیا البتہ تین نے فون پر اس کی خبریت دریافت کی تھی۔ وہ اسے ملازمتوں کے سلسلے میں مشوروں سے نوازنے کے بعد کھمراہ دستوران میں اس کے ساتھ جانے میں شریک ہونے کا خواہش مند تھا لیکن اس نے نہایت نرمی سے انکار کر دیا۔

ریاض نے جس ظالمانہ انداز میں اس کے دل پر ان گنت گھاؤ لگائے تھے اس کے بعد وہ  
 تلے کر چلی تھی کہ آئندہ کسی مرد کے ساتھ بے تکلفانہ انداز میں پیش نہیں آئے گی۔ اسے مردوں کی  
 ذات سے شدید نفرت ہو گئی تھی۔ اس کا جو وقت جیل میں گزرا اور سزا یافتہ عورتوں سے ان کے جو  
 واقعات سنے وہ ایک لحاظ سے اس کی عملی زندگی میں تربیت کے لیے بے حد مفید ثابت ہوئے۔  
 اب وہ زمانے کی اونچ نیچ سے اچھٹے کے قابل ہو چکی تھی۔ یہاں تربیت کا کسی اثر تھا کہ وہ جب کبھی  
 ریاض کے بارے میں سوچتی تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں چھلکتے تھے۔ اسے خالصتاً اوپر آتا کہ  
 آخر اس نے اتنی سادگی اور بھولہ پن کا مظاہرہ کیوں کیا جس کا فائدہ اٹھا کر ریاض نے اس کے  
 راستوں میں کانٹے بچھا دیے۔

ہوٹل کے برکمرے میں دو روز کپاں رہتی تھیں۔ اس کی پانچواں ایک عیسائی لڑکی پچی تھی۔ وہ بہت جلد اس سے بے تکلف ہو گئی۔ وہ ایک کپہنی میں ڈائریکٹری ٹیکر ٹری تھی۔ اس نے غزال سے وعدہ کیا کہ وہ اس کو وہیں ملازمت دلوا دے گی۔ دو ہفتے بیت گئے۔ غزال نے اب تک دو درجن سے زائد درخواستیں ارسال کی تھیں لیکن کسی ایک کا بھی جواب نہیں آیا۔ پچی مسلسل ٹال مٹول کر رہی تھی۔ ایک دن حنین اس سے ملنے آ گیا۔ اطلاع ملی تو اسے بڑی کونٹ ہوئی۔ اس کی تجربہ کار نگاہیں جان چکی تھیں کہ اس کا فون کرنا، پانے پر دعوت دینا اور اب بن جانے منہ اٹھا کر چلے آنا، مطلب سے خالی نہیں۔

ریاض نے اسے اپنا غلام رکھا کر اسے ایسا ڈس تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس سے ملنے کے لیے ملاقاتی کرے میں آگئی۔ اگلے ہی لمحے اسے یہ جان کر خوشگوار سی حیرت ہوئی کہ وہ جب نہیں عاجز بھی اس کے ساتھ بیٹھا آپ کے کش نگار تھا۔ رکی منگٹو کے بعد اس نے کہا۔

”میں نے آپ کی ملازمت کا کیا ہوا؟“ اس نے فحشی سے ٹٹوٹا ہوا ہنس دیا۔

”درخواستیں بھیجی ہیں لیکن انٹرویو کا انہیں آئی۔“

پہلے دن اپنے آفس میں قدم رکھتے ہوئے غزل بڑی نرمی تھی۔ اس کا پاس ادھیڑ عمر کا ایک موٹا شخص تھا۔ اس کے ہاک پر سونے سونے ٹیشوں کی ٹینگی ہوئی تھی۔ اس نے اس سے رسی طور پر تعویذی سی گفتگو کی جس کے دوران اس نے اسے بتایا کہ وہ یہاں صرف عابد کی سفارش پر ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی ہے، لیکن اس ملازمت کے قائم رہنے کی صورت صرف یہ ہوگی کہ وہ خوب محنت سے کام کرے۔

آفس کا ماحول تقریباً ایسا ہی تھا جیسے عام دفاتر کا ہوتا ہے۔ اسے ایک جوان لڑکی سمجھ کر اس کے ساتھی مرد ملازمین نے مختلف جیلوں پر ہانوں سے اس کے قریب ہونا شروع کر دیا البتہ لڑکیوں نے صرف ہاک بھوں چڑھانے پر اکتفا کیا، لیکن اس کی خوبصورتی نے انہیں رقابت اور خوف میں مبتلا کر دیا ہو۔

غزل طبعاً کم گفتنی اور بھرپور صاحب کی چٹکی میں پس جانے کے بعد الفاظ بول بھی اس کے حلق میں پھنس جاتے تھے۔ اس کی کم گوئی نے اس کے دفتر میں کام کرنے والے مردوں کو تکلیف دہ حد تک مایوس کیا، لیکن اسی مایوسی نے ان کی آتش شوق کو اور بھڑکایا۔ بعض افراد آپس میں کا پھوڑے کرتے ہوئے کہتے: ”سہائی بنتی ہے دو چار ماہ گزرنے کے بعد سرورج کی طرح چر رہا ہے کا اشتہار بنے گی، یاد ہے نا وہ ابتداء میں کس طرح بات بات پر دہنہ سنہا لیتی تھی۔ اب اس کا دوپٹہ آٹار قدیم کا حصہ بن گیا ہے۔“ دوسرا بول ”مجھے یہ جان کر لطف آتا ہے کہ سہالی بے سہارا ہے یا پھر گھر سے بھاگی ہوئی ہے۔ میں نے اس کا پیچھا کیا تو پتہ چلا کہ رانی ڈیلیرا سے ہوٹل میں رہتی ہے۔“

غزل روزانہ دفتر جاتی اور واپس آ کر اپنے کمرے میں لیٹ جاتی۔ کئی بار بھی نے اسے کھوئے پھرنے کے لیے آکسایا لیکن اس نے ہمیشہ سختی سے اس کی پیشکش مسترد کر دی۔ وہ مطمئن تھی کہ اب وہ مالی پریشانیوں سے نجات پا چکی ہے۔ اس کے باوجود اس کے دل کی آوازیں بدستور تھیں۔ اسے اپنی زندگی کا کوئی مقصد دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچتی پیت بھرنے اور سر چھپانے کے لیے اس نے ملازمت کی ہے، جانور بھی اپنی جبلت کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ دونوں ضروریات پوری کر لیتے ہیں۔ پھر اس میں اور جانوروں میں کیا فرق ہے؟ یہی سوال اس نے عابد سے اس دن کیا جس دن اسے پہلی تنخواہ ملی اور وہ تھا اس سے ملنے آیا تھا۔ پہلی بار وہ اس

کے ساتھ کینے گرائنگ تھی۔ اپنے ماضی کے تجربات کے پیش نظر وہ مردوں سے محتاط ہی نہیں بلکہ ان سے غرت بھی کرنے لگی تھی۔ پر عابد کی بات کچھ اور ہی تھی اس نے ابتدا میں اس سے بچنے کی کوشش کی پھر اس کی دو نیکیاں اس کی احتیاط اور نفرت کے درمیان خلیج بن گئیں۔ اس نے ہوٹل میں اس کی رہائش کا بندوبست کر کے ایک ماہ کے اخراجات اپنی جیب سے ادا کیے اور اس کو ملازمت دلوائی۔ غزل کے دل میں بہر حال یہ بدگمانی موجود تھی کہ عابد کے حسن سلوک کے پیچھے کوئی نہ کوئی غرض ضرور وابستہ ہوگی۔

اس نے سوچا کہ اس شخص نے انجینی ہوتے ہوئے تاغلت بہ حالات میں میری مدد کی جب تک اس کا اصل روپ سامنے نہیں آتا مجھے اس کا احترام کرنا چاہیے۔ اس فیصلے کے پیش نظر وہ جائے بننے کے دوران اس کے ساتھ مسکرا مسکرا کر گرجوٹی سے گفتگو کرتی رہی۔ اسے خوف تھا کہ وہ اس کے ماضی کے بارے میں جاننے کا خواہشمند ہوگا۔ لیکن اسے بڑی حیرت ہوئی کہ عابد نے ایک بار بھی نہیں پوچھا کہ ”وہ کون ہے؟ اس کے والدین کیا کرتے ہیں لاہور میں اس نے کبھی زندگی گزار دی اور وہ کون سے حالات تھے جن سے مجبور ہو کر اس نے کراچی آنے کا فیصلہ کیا۔“

وہ سارا وقت کہتا ہوں، جھنگو، تھنڈ بیوں اور انسانی ذہن کے ارتقاء کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ اس کا مطالعہ بے حد وسیع تھا اور غزل کو اس کی ذہانت نے بے حد متاثر کیا۔ اس رات کو سوتے وقت وہ کافی دیر تک اس کے حلقوں سوچتی رہی۔ یکا یک اسے یاد آیا کہ عابد نے جس طرح اس سے اس کے خاندان کے پس منظر کے حلقوں کوئی سوال نہیں کیا تھا، اسی طرح اس نے اپنی شخصیت کے تمام گوشے بھی مکمل طور پر چھپائے رکھے۔ اس کے دل نے بے ساختہ فیصلہ کیا کہ ذولی کے مری سے واپس آنے پر وہ اس کے ساتھ عابد کے بارے میں تفصیلی گفتگو کرے گی۔ وہ جب شخص تھا نا چاہے ہوئے بھی اس کے دل میں خود بخود دھانے جا رہا تھا۔

تیسرے دن وہ پھر آیا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ وہ اسے اپنے ہمراہ لے کر کلشن کے ایک ویران گوشے میں جا بیٹھا۔ سمندر کی لہریں، ان کا شور و غلابناک سا تھا۔ غزل کا دل چاہا کہ وہ اسی جگہ چھروں کے ڈیم پر لیٹ کر ہمیشہ کے لیے سو جائے۔ موت میں ابدیت ہے اور اس ابدیت میں لازوال سکون پنہاں ہے۔ اسے اپنے آپ پر مطمئن ثابت ہونے لگا۔ اس شخص کے ساتھ اس کا کون سا رشتہ ہے جو متاثر کر اس کے ساتھ یہاں چلی آئی۔ تاہم اس کا مقدر بن چکی ہیں اس اپنی شخص کے ساتھ اس کا یہ مصنوعی اشتراک محض فرار کی ایک کوشش ہے۔ وہ بلاوجہ ایسی حرکتیں کر

کے کیوں اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے درپے ہے۔

ان سوچوں نے اس کے ذہن ہرے کر دیے اور اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ غم دھیسے کی شدت سے اس کی آنکھوں میں آنسو امانڈ آئے۔ عابد نکلت ہوا۔

”مجھے بہادر لڑکیوں کی بیگم ہوئی آنکھیں دیکھ کر بڑی اذیت ہوتی ہے۔ میں یہ نہیں چاہوں گا کہ تمہیں کون سا غم ہے۔ ہمارے غم ایک جیسے ہوتے ہیں اور دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں جو کسی نہ کسی سبب سے غمگین نہ ہو۔“ اس نے کوئی جواب نہیں دیا آجمل کے پلو سے اپنی آنکھیں صاف کیں اور بے دلی سے مصنوعی انداز میں مسکراتے ہوئے لہروں کو دیکھنے لگی۔

عابد نے قہقہہ لگا دیا اور بولا ”ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے انہی ہیں اور یہ کوئی اچھوتی بات بھی نہیں۔ کرۂ ارض پر تین ارب سے زائد لوگ بستے ہیں اور ان کی اکثریت خود اپنے آپ کے لیے انہی ہے۔ لوگ طبعی عمر پوری کرنے کے دوران اپنی یادوں کی خواہشوں کے تابع کام کرتے ہیں جو ان کے نزدیک سرگرم زندگی کا عقیقہ ہوتا ہے لیکن ان کا البیہ صرف یہ ہے کہ وہ ایک ہل کے لئے بھی اپنی ذات سے ہٹ کر نہیں ہونے پاتے تو غزل بی بی! کچھ پائینا یا گناو دینا اہم ترین واقعہ نہیں۔ لیکن دین کے عمل کو بڑنس کہتے ہیں۔ منافع پر قہقہہ لگا کر اور نقصان پر مرعہ جانا ان لوگوں کی فطرت ہوتی ہے جو ہمیشہ اپنی ذات سے انہی رہتے ہیں۔“ اس کی تلخ باتیں غزل کے دل میں چٹانوں کی طرح چبھ گئیں۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔ عابد بھی خاموشی سے پائپ کے کش لگاتے ہوئے سمندر کی موجوں کو گھورے جا رہا تھا۔ دفعتاً اس نے گردن موڑ کر غزل کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔ ”تم ایک اچھی لڑکی ہو مجھے اپنے سمیت کسی کے ماضی سے کوئی دلچسپی نہیں، کیونکہ ماضی ابھی ہوئی راکھ ہے۔ اگر تم مناسب سمجھو تو مجھ سے شادی کر لو۔ اس طرح ممکن ہے کہ تمہیں جینے کا نیا ذھن آ جائے۔“ غزل پر جیسے بجلی گرنی عابد کے منہ سے ایک بیک شادی کی پیشکش سن کر وہ حواس باختہ ہو گئی۔ واقعی یہ عجیب و غریب شخص ہے۔ اس نے گھبرا کر سوچا کتنے آرام سے اس نے کہہ دیا کہ مجھ سے شادی کر لو۔ اگر اسے علم ہوتا کہ میں طلاق یافتہ ہونے کے علاوہ مزید ایذا بھرم بھی ہوں تو پھر شاید یوں اپنا تلفظ نہ بھارتا۔

عابد اس کی سوچوں سے بے نیاز کھڑ ہوا تھا۔ ”سفر کے دوران جب ہماری ٹرین کسی اسٹیشن پر رکتی ہے تو ہماری ساری دلچسپیاں اس کے ساتھ وابستہ ہو جاتی ہیں۔ ہمیں سابقہ اسٹیشن یا آنے والے اسٹیشن کا خیال نہیں آتا۔ فطرت کے نقطہ نظر سے یہ صحیح عمل ہماری زندگی کی پراسرار روشنی کو

زیادہ چندار بناتا ہے۔ میں اپنی تجویز پر اصرار نہیں کروں گا اور یہ بھی بتا دوں کہ میں بڑنس اور عشق دونوں سے لاعلمی ہوں۔“ غزل نے ہمت کر کے ہنسنے لگا۔

”عابد صاحب! آپ بہت عظیم انسان ہیں آپ کی رفاقت پر یقیناً ہر لڑکی کو فخر ہوگا لیکن.....“ اس نے اس کو بات مکمل نہیں کرنے دی اور مسکرا کر بولا۔

”لیکن میں آپ سے شادی نہیں کر سکتی یہی کہنا چاہتی ہوں۔“ غزل نے اثبات میں سر ہلایا۔ عابد نے اپنا سلسلہ کام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”تمہاری یہ سوچ غلط ہے کہ میں ازراہ ہمدردی تمہارے لیے سہارا بننا چاہتا ہوں۔ یقیناً کروا بھی کوئی بات نہیں۔ اس شہر میں بے شمار لڑکیاں تمہاری طرح لاوارث اور بے سہارا ہیں اور کئی برسوں سے اس مشینی شہر میں رہتی ہیں اگر میں شادی کے ذریعہ کسی کی مدد کرنے کا ارادہ کرتا تو یقیناً پہلا حق ان میں سے کسی ایک کا ہوتا۔“ غزل کو اس کی وضاحت پر بڑی حیرت ہوئی اس نے ہنسنے شروع کر دی۔

”میرا مطلب ہے کہ.....“ وہ باوجود کوشش کے اپنا جملہ مکمل نہ کر سکی۔

عابد نے لا پرواہی سے کہا۔ ”میرا اندازہ ہے کہ تم عام لڑکیوں سے مختلف ہو۔ میرا اشارہ تمہاری شکل و صورت یا عادات کی طرف نہیں، یہ بے معنی چیزیں ہیں۔ دراصل میں نے تمہارے اندر چھپی ہوئی لڑکی دیکھی ہے جس پر اگر میں محنت کروں تو وہ یقیناً زمین کے اعلیٰ مدارج حاصل کر سکتی ہے۔ بس اس دلچسپی کے سبب میں نے تمہیں شادی کی پیشکش کی ہے۔ تم اس پر سوچنا اور اگر تمہیں میری تجویز قبول نہ ہو تو مجھے فون پر اطلاع کر دینا۔ میں از خود اپنی تجویز تمہارے سامنے بھی نہیں دہراؤں گا۔“

وہ ہوشل واپس آئی تو اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ عابد کس قسم کا شخص ہے۔ اور کیا واقعی اس کو اس کی گفتگو پر اعتماد کرنا چاہیے؟ ماضی نے اسے جس طرح بے رحمانہ انداز میں ذہن دھم کیا تھا، اس کے پیش نظر اس کا عابد سمیت ہر شخص سے بدگمان اور مشکوک ہونا ایک قدرتی امر تھا۔

ریاض کی گفتگو میں بھی بڑی نرمی بڑی اپنائیت ہوا کرتی تھی۔ اسے آخری دم تک شبہ نہ ہو سکا کہ وہ اداکاری کر رہا ہے۔ جب اس کے سر پر آسمان ٹوٹا تو اسے اس کی اصلیت کا علم ہوا لیکن اس وقت ریاض کی نگاہی ہوئی آگ اس کو محسوس کر چکی تھی۔ کون جانے عابد ہر ریاض ہی کا ایک عکس



تری یادوں کے گھاب

ہو شاید اس نے محسوس کیا ہو کہ شادی کے بغیر وہ اس کے قریب نہیں آ سکتا اس لیے مہارت سے چکر چلا لیا ہو۔

اسے اپنی بے بسی پر رونا آ گیا۔ یہ کیسا معاشرہ ہے جو تھلاڑی کو جیسے نہیں دیتا۔ بظاہر یہ لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ اگر کوئی غیر مسلم ان کی ہم عقیدہ لڑکی سے یہ سلوک کرے تو ان کی غیرت اور خوداری جیسے نکتے نکلتے ہیں۔ لیکن اپنے ہاتھوں کسی سے بس مسلمان لڑکی کی عزت پامال کرتے ہوئے انہیں ایک لمحے کے لیے بھی خوف نہیں آتا کہ اس کا نکاح کا واحد مالک خدائے بزرگ و برتر ہے جو ان کی ہر کینگی کے بارے میں بہت اچھی طرح جانتا ہے اور ان بد بختوں کو شدید عذاب کا حشر بھی پکھائے گا۔

تین دن گزر گئے، عابد نہیں آیا۔ ہر شام اس کا دل دھڑکتا شاید ابھی اس کو ملازمہ آ کر بتائے کہ اس کا ملاقاتی بیٹھا ہے۔ ایسی حالت میں وہ اکثر اپنے آپ کو برا بھلا کہتی۔ آخر میں نے اس کی آمد کی توقع کیوں لگائی ہے۔ بلاشبہ اس نے میری مدد کی مجھے حوصلہ دیا اور شادی کی پیشکش کی بھی لیکن وہ بے توانی ایسے لوگوں پر بھروسہ کرنے کا انجام میں پہلے ہی بھت چکی ہوں۔

وہ اپنے آپ کو ہر طرح سے قائل کرتی، پھر بھی اس کے دل میں چور چرتا۔ ایک رات وہ عابد کے بارے میں سوچتے سوچتے ڈوگی۔ اس پر یہ بولناک انکشاف ہوا کہ اسے سے محبت ہو گئی ہے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ ایسی شدید محبت کا جذبہ تو اس نے کبھی ریاض کے لیے بھی محسوس نہیں کیا تھا۔ اس کو اس سے انیسیت تھی جو قربت کے سبب بالعموم بیویوں کو اپنے شوہروں کے بارے میں محبت کی بدگمانی میں مبتلا کرتی ہے۔

اس کی آنکھوں سے نیند اڑ گئی اور اس نے اپنے پورے وجود کو ایک چادر میں چھپا لیا جیسے اسے ڈر ہو کہ اس کی پازنر اس کا مجید نہ پالے۔ اس نے اپنے جذبات کی کشتی پہچانی سمندر کے سپرد کر دی۔ دوسرے ہی لمحے اسے یوں لگا کہ جیسے عابد اس پر تھکا اس کے بالوں کو بڑے پیار سے سہارا دے۔

صبح جب آنکھ کھلی تو اس کا جسم روٹی کے گالے کی طرح ہلکا چھلکا تھا۔ سورج کی روشنی اور فضا کی خشکی اسے ایک عجیب لذت دے رہی تھی۔ اس نے جلدی جلدی ناشتا کیا۔ پی کی ساتھ بھی اس نے خوب چپک چپک کر باتیں کیں۔ اس نے ایک دو بار بڑی حیرت سے اس کے بدلے

تری یادوں کے گھاب

ہوئے رویے پر غور کیا اور پھر صبر نہ کر سکی۔ اس نے پوچھا۔  
”بڑی خوش نظر آ رہی ہو کیا بات ہے؟“

جواب دینے کی بجائے وہ قہقہے لگانے لگی۔ جب وہ اٹھ کر چلی گئی تو پی اپنے آپ سے بولی۔

”پہلے تو یہ ایسی نہیں تھی کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے، جو اتنی خوش ہے۔“ دفتر میں بھی لوگوں نے محسوس کیا کہ وہ خلاف معمول بہت زیادہ ہشاش بشاش ہے کسی نے ہلکا چھلکا مذاق کیا تو اس نے پہلے کی طرح اس کا زہانے کی بجائے اس پر جملہ جست کر دیا۔ غزل نے سوچا۔ آج جانے کیا بات ہے سبھی لوگ مجھے احساس کر رہے ہیں کہ میں بہت خوش ہوں۔ میں انہیں کیسے بتاؤں کہ محبت کی شہین ایک آنکھ کی سر سے دل کے گھاب پر آن گری ہے۔ اس سارے عرصے میں اس کا دل پھٹا رہا کہ فون پر عابد سے گفتگو کرے لیکن حجاب مانع تھا۔ سر پیر کو جب وہ دفتر سے نکلی تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی کہ شین گاڑی کی لپاس کے انظار میں کھڑا تھا۔ اس نے قریب جا کر پوچھا۔

”شین بھائی خیریت ہے، آپ یہاں کس طرح؟“ وہ ہراساں بنا کر بولا۔  
”تمہاری سیکلی ڈولی تھوڑی دیر پہلے مری سے آئی ہے جوئی اسے تمہارے متعلق بتایا وہ شور مچانے لگی کہ ابھی جا کر اسے امراؤ لاؤ مجھے ایک بہت ضروری کام تھا، لیکن ڈولی کی بچی ضد کی گئی ہے۔“

غزل کا چہرہ خوشی سے دھنکے لگا۔ اسے ڈول سے ملنے کی شدید آرزو تھی۔ وہ جلدی سے اس کے برابر بیٹھی اور کہنے لگی۔

”شین بھائی آپ نے کیوں زحمت کی مجھے فون کر دیتے میں خود آ جاتی۔“ شین بکھویر تک اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتا رہا پھر قہقہے لگا کر کہنے لگا۔

”میں اتنا جوڑ کر معافی مانگتا ہوں اور اقرار کرتا ہوں کہ میں آپ دونوں خواتین کا بے دام غلام ہوں جو جی میں آئے میرا حشر کریں۔“ غزل بے ساختہ ہنس دی۔

وہ گھر میں داخل ہوئے تو چاروں طرف سناٹا تھا۔ شین نے بتایا کہ مری سے صرف ڈولی ابھی آئی ہے، باقی لوگ وہیں ہیں۔ وہ اس کو ساتھ لے کر دوسری منزل پر پہنچا اور بیڈروم میں آتے ہی اس نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا اور گریٹ سلگانے لگا۔ غزل نے چاروں طرف حیرت نظر انداز کر دیکھا وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ اس نے مڑ کر شین کی طرف دیکھا اور حیرت سے پوچھا۔

”کہاں ہے ڈولی۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور سرگیت سلگا کر ہاپ۔ غزل نے اپنا سوال دہرایا۔ جب وہ قدم اس کی طرف بڑھا اور جیب سے فکاری چاقو نکال کر ہارنے لگا تو وہ دم خوردہ مٹی اس کے قدم جیسے زمین نے جڑے لیے تھے اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کے مطلق سے کوئی آواز نہ نکلی۔ شبنم سٹاک لہجے میں غرایا۔

”عابد میں کوئی سرخاب کے پر نہیں لگے کہ تم اس کے ساتھ رگ دلیاں مٹاؤ تم نے مجھے نظر انداز کر کے میری بے عزتی کی ہے۔ میں نے تمہیں جانے کی دعوت دی تھی تم نے اسے مسترد کر دیا۔ میں نے تین فون کیے، تم نے بات کرنا گوارہ نہ کیا۔ میں ایک ہفتے سے آگ میں جل رہا ہوں اور تمہیں اس کی کوئی پروا نہیں۔ عابد نے مجھے بتایا کہ وہ تم سے شادی کرنے کا خواہشمند ہے میں آج تمہیں اس کا قلعی ہی نہیں رہنے دوں گا کہ وہ تمہیں اپنی بیوی بنانے کا تصور کرے۔“

غزل کا نہ اس حال تھا۔ وہ قہر قہر کانپ رہی تھی۔ یہ درست ہے کہ اسے قبل میں دوسری عزم عورتوں کے ساتھ زندگی گزارنے کا قائل غرت تجربہ ہوا تھا لیکن اس نے کبھی موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں دیکھا تھا۔

شبنم کافی مضبوط اور توانا تھا۔ اس نے ہکلاتے ہوئے کچھ کہنا چاہا لیکن الفاظ اس کا ساتھ دینے سے قاصر رہے۔ شبنم اس کے قریب آ گیا۔ اس نے ایک ہاتھ میں چاقو پکڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں دہشت ناک انداز میں چمک رہی تھیں۔ اس نے اس کا بازو پکڑا اور زور سے اپنی طرف کھینچا۔

غزل کے مردہ جسم میں جیسے جان آ گئی ہو۔ اس نے پوری قوت سے چیخ بلند کی۔ شبنم نے اپنا چاقو گرا دیا اور ایک ہاتھ سے اس کا منہ بند کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ غزل کی قوت مزاحمت بیدار ہو چکی تھی۔ اس نے دانتوں سے اس کا ہاتھ کاٹا۔ اس کے مطلق سے ایک گھٹکی گھٹکی چیخ نکلی اور وہ اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے ہاتھ سے خون رس رہا تھا۔ غزل پر دہشت سوار ہو گئی۔ اس نے جلدی سے جبکہ کر زمین پر گر کر ہوا چاقو اٹھایا اور اس کی طرف لہراتے ہوئے چلائی۔

”سور، کہنے، ذلیل مار ڈالوں گی تجھے۔ میں تیری بوٹی بوٹی انگ کر کے اپنے پاؤں سے روندوں گی۔ تم سب میرے دشمن ہو۔ میں جانتی ہوں تم سب میرے دشمن ہو۔ دیکھو آج میں نے اپنے ہاتھ میں چاقو لے لیا ہے آؤ اب مجھ پر ظلم کرو۔ میری بے بسی کا تماشہ بناؤ۔ تمہارے قدم کیوں

آگے نہیں بڑھ رہے۔ تمہاری بے چینی کہاں مٹی میں تمہارے سامنے ہی ہوں۔“

اس نے ایک دہشت ناک قہقہہ لگایا۔ وہ اپنے ہوش و حواس کھو چکی تھی۔ اس نے جس انداز میں چاقو کو فضا میں گردش دی، اسے دیکھ کر ایسا لگتا جیسے وہ شہر کی مہذب تعلیم یافتہ لڑکی نہیں، کسی تاریک جنگل کی وحشی بنی ہے۔ اس کے خوفناک تیز و کچھ کر تین خوفزدہ ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس کے ساتھ قہقہہ مٹا ہونے کے بعد اس کے ہاتھ سے چاقو گرا دے گا لیکن اس نے اس کی ہسٹریائی کیفیت دیکھی تو اپنی مردانہ برتری بھول کر دروازے کی طرف لپکا۔

غزل بھی اس کے پیچھے دوپاندہ وار بھاگی۔ شبنم کمرے سے نکل کر کئی بیڑھیاں بیک وقت پھلانگتا ہوا پورج کی طرف بھاگا جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ اس کا ملازم اس کے سامنے آیا تو وہ چلا یا۔

”بابا..... بابا..... کہیں چھپ جاؤ وہ پاگل ہو گئی ہے، وہ تجھے مار ڈالے گی۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنی گاڑی اشارت کی اور اسے دوڑاتا ہوا غائب ہو گیا۔ بابا کی سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی تھی وہ ہاتھ پر ہاتھ مارا ہوا پیچھے مڑا تو اس کی جیسے جان نکل گئی اور وہ قہر قہر کھینچنے لگا۔ سامنے ایک لڑکی ہاتھ میں چاقو پکڑے تیز تیز قدم اٹھاتی اس کی طرف آ رہی تھی اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور منہ سے جھماکے نکل رہا تھا۔

بابا چونکا چلا تا ہوا ہاتھ کی طرف بھاگا۔ شبنم اس وقت عابد کی ایک گاڑی پورج میں داخل ہوئی۔ اسے ملازم بابا کی حالت دیکھ کر توجہ ہوا اور اس نے پوچھا۔

”شبنم ہے؟“

بابا کے منہ سے کوئی لفظ نہیں نکل رہا تھا۔ وہ بار بار منہ کے اندر کی طرف دیکھتا۔ عابد گاڑی سے نکلا اور اسے بازو سے پکڑ کر اندر لے جانا چاہتا تو بابا نے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑانے کے لیے باقاعدہ دھچکا شتی شروع کر دی۔ عابد سنانے میں آ گیا۔ اس کی نظر غزل پر پڑی جو ہاتھ میں چاقو لیے زور زور سے چیخیں ہوتی، ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ملازم بابا اس کی گرفت کمزور ہوتے ہی ایک طرف بھاگ گیا۔ عابد نے غزل کو پچھلی پچھلی نظروں سے دیکھا اور چلا یا۔

”غزل..... غزل..... تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ اس کی آواز سن کر غزل کے قدم رک گئے۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کو زمین نے جکڑ لیا ہو اور پھر اس سے پہلے کہ عابد اس کو سنبھالے، وہ

تری یادوں کے گلاب

دھڑام سے زمین پر گر گئی۔ چاتو ابھی تک اس کی منہ کی طرف تھا۔ وہ بیہوش ہو چکی تھی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ ایک پرائیویٹ کھینک میں تھی۔ ایک نرس اس کے سر کے بالوں کو سبلا رہی تھی اور اس کے بھی پاس عابد گھر مند کھڑا تھا۔ غزل کے منہ سے ایک سسکی نکلی۔ اسے وہ خطرناک دیکھا جب شہین چاتو تھا اس کی طرف لپکا تھا۔ اس نے بے بسی اور بے چارگی سے عابد کی طرف دیکھا جو نیچے دونوں کی نظریں چارہ نہیں غزل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

عابد نے اس کے سر ہانے بیٹھ کر اسے تسلی دی اور کہنے لگا۔

”تم بتا نہیں ہو۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ کسی صدمے کے گہرے اثرات تمہارے ذہن پر چھائے ہوئے ہیں۔ آج رات تم یہیں رہو تا کہ تمہاری مناسب دیکھ بھال ہو سکے۔ صبح میں تمہیں لے جاؤں گا۔“

غزل نے فوراً اس کا ہاتھ تھام لیا اور وہاں سے لپکے میں بولی۔

”پلیز عابد۔ مجھے تھامت چھوڑ دو میری ہمت جواب دے گئی ہے۔“ وہ بے دلی سے

مسکرا کر بولا۔

”میری رائے اب بھی یہی ہے کہ تم ایک باہت لڑکی ہو میں تمہاری عظمت کو سلام

پیش کرتا ہوں۔“

اس نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا اور کہنے لگی۔

”تمہیں مجھے یہ کہہ کر گھر لے گیا تھا کہ ڈولی مری سے واپس آ گئی ہے اور مجھے بلادی ہے۔

بعد میں پتہ چلا کہ اس نے دھوکہ کیا۔ اللہ نے میری عزت بچائی۔“ عابد کا چہرہ گھمبیر ہو گیا اور وہ

آہستہ سے بولا۔

”تمہارے ہاتھ میں چاتو دیکھ کر میں نے صورتحال کا اندازہ لگایا تھا۔“

”میرے ہاتھ میں چاتو؟“ اس نے حیرت سے دریافت کیا۔

وہ مسکراتے ہوئے بڑبڑایا۔ ”تم اپنے حواس میں نہیں جس میں اس لیے یہ کہنا بے ضرر ہو گیا۔“

وہ آنکھ کر جانے لگا کہ غزل نے اسے آواز دے کر بلایا۔ وہ پاس آیا تو اس نے اسے اپنے

نزدیک بٹھا کر جھپٹتے ہوئے کہا۔

”عابد صاحب آپ کو یاد ہے کہ آپ نے سمندر کے کنارے ایک تجویز پیش کی تھی۔“

اس کے چہرے پر دوبارہ مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اس نے انتہات میں سر بلایا۔ غزل نے

نظریں جھکا کر ہوئے کہا۔

”آپ سمجھ لیجئے کہ میں نے آپ کو فون کر دیا۔“

عابد نے قہقہہ لگایا۔ ”تم نے نہایت دانشمندانہ فیصلہ کیا ہے۔“

پانچویں دن اس کی عابد سے شادی ہو گئی۔ اس کی پہلی شادی کی طرح یہ تقریب بھی نہایت

سادہ تھی۔ عابد کے چاروں دوستوں نے اس میں شرکت کی۔ بارات اور رخصتی کا جھنجھٹ سرے

سے ٹاپید تھا۔ عابد کے کلیت پر شادی ہوئی۔ وہیں ان دونوں نے نئی سون منایا۔ غزل اپنی نئی زندگی

پر بے حد خوش تھی۔ عابد اس کا شوہر ہی نہیں بلکہ محبوب بھی تھا۔ وہ پیلا سرد تھا جس کے لیے اس کے دل

میں بے پناہ پیار پیدا ہوا۔ شوہر کے کہنے پر اس نے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اب وہ مکمل

طور پر ایک گھریلو عورت بن چکی تھی۔ شادی کے پہلے مہینے اس پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ عابد

اس کو فون کر چاہتا ہے اسے پتہ چلا کہ وہ اس کے درون پر دھچک دینے والی ٹپکلا لڑکی ہے۔ جب

کبھی وہ تنہا ہوتی تو ایک خیال اسے خوفزدہ کر دیتا۔ اس نے عابد کو اپنے ماضی کے بارے میں کچھ

نہیں بتایا تھا کہ کبھی اسے معلوم ہو گیا کہ وہ طلاق یافتہ ہے اور عدالت نے اسے بھرپور تروے کر دو

سال کے لیے جیل بھیج دیا تھا تو پھر کیا ہو گا؟ دشت کے عالم میں اسے پھرتا ہے اور ساتھ ہی اس

کی آنکھیں آنسو برساتے نکلتیں۔ اس نے ایک دو بار ہمت کر کے اپنے شوہر کو وہ داغ دکھانے

چاہے جنہیں تقدیر کی بد بختی نے لازم دل بنا دیا تھا لیکن عابد نے اسے کبھی کسی اعتراض کا موقع نہ

دیا۔ ایسے موقع پر وہ ہمیشہ خشک لپکے میں کہتا۔

غزل میری جان خدا کے لیے مجھ سے کبھی اپنے ماضی کا تذکرہ مت کرنا مجھے کوفت ہوتی

ہے تم بتاؤ کہ میں نے کبھی تمہیں اپنے خاندان یا اپنے پس منظر کے بارے میں کچھ بتایا؟“ غزل

کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ خاموش رہتی۔

اس طرح دو سال بیت گئے۔ شادی کے بارہویں مہینے ان کے گلشن میں ایک سدا بہار

پھول کھلا جس کی کبھی نہ ختم ہونے والی مہک نے ان دونوں کو سرشار کر دیا۔ عابد نے اپنے بیٹے کے

نام احمد عابد رکھا لیکن وہ اسے پیار سے پوچھتا۔

غزل کی ساری محرومیاں دھل گئی تھیں۔ ماضی کے زخم جیسے پاتال میں چلے گئے تھے

اسے ایسا لگا جیسے وہ ہمیشہ سے اسی جنت میں بس رہی ہے عابد کی بھی یہی کیفیت تھی۔ غزل نے

اسے اتنی بھرچ رہی تھی کہ وہ اس کے حصار کا قیدی بن گیا۔ ایک شام جب عابد گھر آیا تو بہت





تری یادوں کے گھا پ

اسے اور کچھ کو کسی جگہ چھوڑ کر تہا واپس جانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ وہ کچھ کہنے سی لگا تھا کہ پورے میں کسی گاڑی کے رکھنے کی آواز آئی۔ وہ خوشی سے بولا۔

"ابا جان آگے ہیں۔"

دوسرے ہی لمحے ایک بھاری بھر کم فضا جس کے سر پر کہیں کہیں سفید بال نظر آ رہے تھے، کمرے میں داخل ہوا۔ غزل اس کو دیکھتے ہی کسی خود کار مشین کی طرح کھڑی ہو گئی۔ اس کا چہرہ مفلج ہو گیا۔ لیکن اس کے برعکس عابد اور جج صاحب خوشی سے بے حال ہو رہے تھے۔ دونوں باپ بن گئی سال بعد ایک دوسرے کے بالفاظ آئے تھے۔ جج صاحب نے لپک کر اسے اپنے سینے سے لگالیا اور پھر غزل کی طرف آئے۔ اس کی پیشانی پر یوسد یا اور اس کے بعد اس کے سر پر ہاتھ پیچا اور اسے اپنے قریب ہی صوفے پر بیٹھالیا اور پھر انہوں نے گونجدار آواز میں کہا۔

"عابد ہمارا پوتا کہاں ہے؟ اسے ہمارے پاس لاؤ۔ ہم اسے دیکھنے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔" یہ آواز سننے ہی غزل کے اعصاب جھنجھٹا اٹھے۔ وہ اس لہجے کو اچھی طرح جان چکی تھی۔ اس آواز نے آج سے کئی سال پہلے عداوتی کمرے میں اس کو مجرم قرار دیا تھا۔ اسی وقت شادو بابا نے اپنی گود میں لئے نمودار ہوا۔ جج صاحب نے بہتر ماری سے چوکا اپنی گود میں تمام لایا اور یوانہ واراں کو چرنے لگے۔

دیران گھر میں دیکھتے ہی دیکھتے رونق آ گئی۔ سب سے زیادہ خوش چوکھا۔ اسے اپنے والد سے ایسے ماموسیت ہوئی کہ وہ ایک ہل کے لیے بھی ان سے انک ہوئے کو تیار نہیں تھا۔ جج صاحب عابد اور غزل کو موقع دیے بغیر مسلسل گفتگو کیے جا رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ایک عمر سے کسی دیران منسان جزیرے میں قید تھے اور اس قید کے دوران انہوں نے کسی انسان کی عقل نہیں دیکھی تھی۔

کھانے کی میز پر وہ غزل اسے کہنے لگے۔

"بچے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں نے تمہیں پہلے بھی کہیں تمہیں دیکھا ہے کب؟ کہاں؟ ذہن پر بہت زور ڈالا مگر کچھ یاد نہیں آ رہا۔" غزل کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا وہ چونکا چاٹتی تھی لیکن اس کی آواز اس کے مطلق میں جیسے انک مٹی۔ اس کے بجائے عابد نے اپنے منہ میں انداز میں قہقہہ لگایا اور جواب دیا۔

"ابا جان آپ یہ بتائیں آگے۔" کہا۔

تری یادوں کے گھا پ

جج صاحب مسکرائے اور کہنے لگے۔ "یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ غزل ماشاء اللہ عادات و اطوار سے نہایت منہب اور ملحقہ سند لڑکی دکھائی دیتی ہے۔ اس کی رنگوں میں یقیناً شریف خاندان کا خون دوڑ رہا ہے۔ میری ایک عمر بھروسوں کو دیکھتے اور پرکھتے میں گزری ہے۔ بیٹا جو کہتے ہیں کہ خون کی تاثیر بے معنی ہے، وہ دوسرا غلط کہتے ہیں۔ خون بہت اہمیت رکھتا ہے جب بچے جوان ہوتے ہیں تو اسی خون کی تاثیر کے تحت ان کے اندر چمپھی ہوئی اچھائیاں یا غلا خٹیں ابھرتی ہیں۔ میں نے آج تک جتنے مجرموں کو سزا کیں سنا کیں ان کے بارے میں میرا یہی عقیدہ ہے کہ وہ سزا بے رنگ تھے۔"

عابد بولا۔ "ابا جان اچھے آپ سے اختلاف ہے۔"

جج صاحب نے صغیریں اچکاتے ہوئے پوچھا۔

"اختلاف۔ کیا اختلاف بیٹا۔ میں نے جو کچھ کہا ہے اس کے پیچھے ایک عمر کا تجربہ موجود ہے۔ تم ابھی نو جوان ہو، خون میں گرمی ہے اور نئی نسل تو سر میا بزرگوں کی روایات کے خلاف بناوٹ پر تکی ہوئی ہے۔" انہوں نے تہقہ لگایا۔ غزل باپ بیٹے کی گفتگو کے بے نیاز سر جھکائے کھانا کھا رہی تھی۔ لیکن اس کے مطلق سے بچے نہیں اتر رہا تھا۔ لیکن وہ ایسا کرنے پر مجبور تھی کیونکہ اسے خوف تھا کہ کہیں جج صاحب اس کی شدید ترین پریشانی کو دیکھ کر بھابھ نہ لیں کہ یہ وہی مجرم لڑکی ہے جسے انہوں نے چند سال پہلے دو سال کی سزا سنائی تھی۔ عابد اپنا کانٹا ایک طرف رکھتے ہوئے بولا۔

"ابا جان میرا ذاتی خیال ہے کہ جرائم مخصوص حالات کی پیداوار ہیں اور معاشرے کی اونچ نیچ اور سماجی نا انصافیاں اس کے لیے کھاد کا کام کرتی ہیں۔ کئی لوگ بے گناہ ہوتے ہیں لیکن پولیس انہیں کسی نہ کسی طرح قصور وار ثابت کر دیتی ہے جبکہ اس کے برعکس اکثر جرائم پیشہ افراد اپنی جالاکائی سے زندگی بھر قانون کی گرفت سے محفوظ رہتے ہیں۔ سنا کئی انہیں اعزازت تصور کرتی ہے۔ ایسے عجیبہ و غریب حالات میں رنگوں میں بننے والے خون کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے۔" جج صاحب کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نمودار ہوئے انہوں نے رکھائی سے کہا۔ "تمہاری سوچ فلسفہ کی تابع ہے۔ زندگی کی پھر جیسی خصوصیات سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔" عابد نے یقیناً موضوع بدل کر سوال کیا۔

"ابا جان ساجد کا کوئی خط آیا ہے؟" اس سے پہلے کہ جج صاحب کچھ بولتے۔ وہ جلدی

تری یادوں کے گلاب

سے اپنی بیوی کی طرف مڑا اور بولا۔

”ایک خوشخبری اور سن لو تمہارا ایک دیور بھی ہے ساجد۔ پانچ سال پہلے وہ پاکستان چھوڑ کر چلا گیا تھا۔“

غزل نے مشکل سے جی کہا تھا کہ بیچ صاحب غصیلہ لہجہ میں بڑبڑائے۔

”اس ملائقی کامیرے سامنے نام مت لو۔ اس نے مجھے بہت ڈکھ پہنچایا ہے۔ میں اسے بھول چکا ہوں۔“ رات مجھے جب عابد اور غزل اپنے گھر پہنچے تو غزل کی حالت اور خراب ہو چکی تھی۔ بیچ صاحب نے اپنے پاس ہی ٹھہرایا تھا۔ ان کا اصرار تھا کہ وہ دونوں اگلے دن ہی سامان سمیٹ کر اس کوٹھی میں منتقل ہو جائیں۔ وہ اب ایک پل کے لیے بھی انہیں اپنے سے دور نہیں دیکھنا چاہتے۔ عابد نے فوراً بان کہہ دی۔ وہ بہت خوش ہوئے تھے۔ اسے آپ سے بہت محبت تھی۔ اس کے علاوہ اسے احساس تھا کہ وہ بالکل تنہا نہیں۔ بیوہ اور پوتے سے ان کی رہائش زندگی میں ایک نئی تازگی اور شکستگی آجائے گی۔ غزل کی کیفیت مختلف تھی۔ اسے صاف نظر آ چکا تھا کہ اس کی بد قسمتی نے اس کی دو سال کی پرسکون ازدواجی زندگی کا بدلہ لینے کے لیے اس کے رستے میں کائنات کو دیئے ہیں جو کبھی نہ ختم ہونے والے ہیں۔ بیچ صاحب ابتدائی ملاقات میں اس کو پچپانے سے قاصر رہے تھے لیکن پڑھیں گئے کی تربیت میں کسی لمحہ میں ان کے ذہن میں خواہیدہ واپس اگھڑائی لے کر پیدا ہو سکتی ہیں اور اگر ایسا ہو گیا تو پھر ان کا وہ عمل کیا ہو گا۔

وہ اس بھیا تک دن کے تصور ہی سے کانپ گئی۔ انہوں نے اسے سزا دیتے ہوئے پولیس کو یہ ہدایت کی تھی کہ وہ اس کے مفرد شوہر کو ہر قیمت پر تلاش کر کے گرفتار کرے۔ وہی لڑکی اب ان کی بیوہ اور پوتے کی ماں تھی۔ اس صحیح حقیقت کا انکشاف ہونے کے بعد کیا وہ اس کو صاف کر دیں گئے۔ غزل کے ذہن میں اس کی گھٹی گھٹی جینیں بلند ہونے لگیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سال تک ان آنکھوں کے سوتے شگ رہے تھے لیکن یکا یک مقدمہ کی بے رحمی نے انہیں دوبارہ بدمعاش کر دیا تھا۔

عابد نے اسے اس کے دیور ساجد کے بارے میں بتایا۔ ”میری اور ابا جان کی اس سے ناراضگی کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس نے ایک بدنام طوائف سے شادی کر لی تھی، جو تین بار شیل کاٹ چکی تھی۔ یہ بھی کوئی خاص بات نہیں۔ عظم یہ ہوا کہ اس کی بیوی نے شادی کے بعد اپنے چلن درست نہیں کیے۔ ایک روز اس کو پولیس نے منشیات کی اسٹنگ کے الزام میں دھر لیا۔ ساجد کی خواہش

تری یادوں کے گلاب

تھی کہ میں ابا جان کی سفارش کے ذریعے اس کا کس قسم کرادوں، میں نے اسے جھڑک دیا جس پر اس نے مجھ سے تعلقات ختم کر لئے۔ بعد ازاں اس نے کسی طرح اپنی بیوی کو منکالت پر رہا کر لیا اور دونوں خفیہ طور پر پاکستان سے عائب ہو گئے۔“

غزل کو اپنے دیور پر ترس آنے لگا۔ جانے اصل بات کیا تھی بات کا جھگڑ بن گیا۔ اس کا اپنا معاملہ بھی تو اسی نوعیت کا تھا، اس نے کچھ بھی نہیں کیا لیکن اس کے پہلے شوہر ریاض کی سازشوں کا نتیجہ اسے جھٹپتا رہا۔ ریاض کا خیال آتے ہی انتہائی طور پر اس کی منھیاں بھٹی گئیں۔ یاد وہ اپنے آپ میں بڑبڑاتی۔

”کاش مجھے اس کی اصلیت کا علم ہوتا میری زندگی کبھی نہ جھٹکتی۔“ دوسرے دن وہ بیچ صاحب کی کوٹھی میں منتقل ہو گئے۔ غزل نے کئی بار عابد سے کہنا چاہا کہ وہ ایسا نہ کرے لیکن اسے ہمت نہ ہوئی۔ اس نے سوچا آخر میں کیا جزا دے گا کہ اس پر زور دوں کہ اپنا حقیقت نہیں چھوڑنا چاہیے۔ بیچ صاحب نے دارا کا اکیڈم گرویدہ ہو گیا ہے اس نے رات ہی اپنی حرکات سے اس بات کا اظہار کر دیا تھا۔ غزل نے فیصلہ کر لیا کہ وہ بیچ صاحب کے سامنے اپنے آپ کو سنبھالے گی اور ثابت قدم رہنے کی پوری پوری کوشش کرے گی۔ اگر انہوں نے اسے کبھی پچھاننے کی سعی کی تو صاف کر جائے گی اور انہیں قائل کرے گی کہ وہ مشابہت کی بنا پر اسے دوسری لڑکی سمجھ رہے ہیں۔ ایسا فیصلہ کرتے ہوئے اسے جھجک اور کوفت ہوئی کیونکہ اس نے اپنی مرحومہ ماں کی تربیت کے زیر اثر کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔

لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ جھوٹ بولے ایسا کرنے سے نہ صرف اس کی زندگی مفلوج رہتی بلکہ عابد کے آئینہ دل کو بھی ٹھیس نہ پہنچتی۔ اسے ایک دو پار خیال آیا کہ وہ کیوں نہ تنہائی میں اسے سارے واقعات صاف صاف بتا دے لیکن اس کا ضمیر اسے کہتا کہ اگر وہ ایسا کرے گی تو بیٹی غاس کا شوہر اس کے بارے میں مشکوک ہو جائے گا۔ بات معمولی تو نہیں تھی کہ وہ نظر انداز کر دے تاہم اس کو دیوانہ وار چاہتا تھا۔ اسے یہ یقین تھا کہ غزل کی زندگی میں اس سے پہلے کوئی مرد نہیں آیا۔ اب اس پر کس طرح مشکوک کر سکتی تھی کہ ایک شخص نے اسے بیوی بنایا، طلاق دی اور پھر قانون کے بے رحم ہاتھوں نے اسے مجرم قرار دیتے ہوئے دو سال کے لیے سلاخوں کے پیچھے قید کر دیا۔ ان بھیا تک یادوں کو تازہ کرتے ہوئے خوف سے اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اس کے لیے ایک بڑا مسئلہ تھا۔ عابد کتنا ہی وسیع القلب کیوں نہ ہو، یہ گوارہ نہیں کرے گا کہ ایک تاریک ماضی



تری یادوں کے گلاب

نہیں نہیں کرتے جرم کا داغ ایسا داغی ہوتا ہے کہ اسے کوئی نہیں مٹا سکتا۔ مجرموں کو اس بات کا اچھی  
 احساس ہوتا ہے۔ اسی لیے جیل سے رہائی کے بعد اگر انہیں اتفاق سے معاشرہ میں کسی طرح  
 واپس مقام مل جائے تو وہ زندگی بھر اپنے داغ کو چھپانے کے لیے ہزاروں جھوٹ بولتے  
 ہیں۔ جیسے نے پوچھا۔

”ابا جان کیا معلوم جس لڑکی کو آپ فرزل کی ہمشکل بنا رہے ہیں وہ یہ خود ہی ہو۔“ اس نے  
 ابا جان کا فرزل کو جواب دیا۔

”میرا خیال ہے کہ ابا جان کے شک کی بنا پر پولیس کے ذریعے تمہاری انکوائری  
 دلی چاہیے۔“

فرزل کا رنگ فنی ہو گیا۔ چائے کا مکھن اس کے حلق سے نیچے نہیں اتر رہا تھا۔ اسے شک کا  
 لہجہ لہانے لگا تھا۔ وہ دوہری ہو گئی۔ بیج صاحب پریشان ہو کر اٹھے لیکن اس سے پہلے ہی عابد اسے  
 منہال چکا تھا۔ اس نے اس کی کمر سہلائی اور پھر پانی پلا کر اسے ہدایت کی کہ وہ کرسی کے ساتھ  
 لگا کر بیٹھ جائے۔ کھانسی کے سبب فرزل کی آنکھوں میں آنسو چمک آئے تھے۔ بیج پریشان  
 نہ کروئے لگا۔ بیج صاحب نے اسے چوکارتے ہوئے چپ کرانے کی کوشش کی مگر وہ روئے چارہ  
 تھا۔ انہوں نے اسے اس کی ماں کو سوچتے ہوئے عابد کو سر دیکھ کر دیا۔

”تم نے ابھی ابھی میری بہو کے بارے میں جو مذاق کیا وہ مجھے قطعی پسند نہیں آیا۔ میں  
 نے تو محض ایک بات کی تھی لیکن یہ تمہاری زیادتی ہے کہ تم نے فرزل کو اس مجرم لڑکی کی جگہ کھڑا کر دیا  
 اُندہ بیٹے میں تمہارے منہ سے ایسی بات نہ سنوں سمجھے؟“

عابد نے اطاعت شعاری سے جواب دیا۔

”بہتر ابا جان۔ میں اپنے مذاق پر شرمندہ ہوں۔“ اس واقعہ کے بعد فرزل کی ذہنی حالت  
 اور بگڑنے لگی۔ وہ شوہر، بیٹے اور سرسری موجودگی کے باوجود اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگی۔  
 اسے صاف لگتا تھا کہ بے جرم زندگی اس پر ایک اور زخم لگانے کی فکر میں ہے اور یہ کبھی نہ مند  
 نے والا زخم ہوگا۔ وہ اپنے دل کی باتیں کسی سے کہہ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی تھی، لیکن  
 اس سے کہے۔ اس گھر میں سب اس کے اپنے تھے۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ اس کا بوجھ کوئی اپنی  
 نردن پر لادنے کے لیے تیار نہیں۔ چھ سات ہفتے بیت گئے۔ اس دوران کوئی خاص واقعہ پیش  
 نہیں آیا لیکن فرزل کی ذہنی کیفیت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ بیج صاحب کوئی خاص بات کرتے

تری یادوں کے گلاب

کی حامل عورت اس کے پیارے بیٹے کی تربیت کرے۔ اس کا دل بے چین ہو گیا اور آنکھوں  
 بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ ماضی کا ایک ایک پل اس نے ہولناک اذیتوں میں گزارا تھا اور اب  
 حال نے بھی اسے جرم کے لگانے شروع کر دیے تھے۔

بیج صاحب کی کوٹھی میں آنے کے بعد اس نے پہلے دو سخت بڑی بے چینی سے گزار دی۔  
 دانستہ طور سے دور دور رہنے کی کوشش کرتی اور بیج صاحب اکثر اسے ڈانٹتے ہوئے اس بات کا  
 کرتے وہ سر نہٹھکائے ان کی ڈانٹ سنتی اور پھر اپنے کمرے میں بند ہو کر رونے لگتی۔ بیج اس  
 دل کا واحد سہارا تھا، جسے ہانپوں میں لے کر اس کے بے قرار دل کو گھڑی دو گھڑی کے لیے بیٹھا  
 جاتا تھا لیکن بیج کی ہمشکل تھی کہ وہ اس کے پاس آتے ہی ضد کرتا کہ چلو اس کو لے کر بیج صاحب  
 کے کمرے کی طرف ہے۔

ایک شام عابد بیج صاحب اور فرزل لان میں بیٹھے چائے پیا رہے تھے۔ بیج صاحب ل  
 گود میں تھا۔ اچانک انہوں نے کہا۔

”میری رات ایک عجیب واقعہ ہوا۔“ اس کے کان کھڑے ہو گئے وہ کہہ رہے تھے۔

”میں نے سوچتے سوچتے میری نظروں میں ایک لڑکی کی تصویر ابھر آئی۔ اسے اس جرم میں  
 مری عدالت میں پیش کیا گیا تھا کہ اس نے اپنے جہلاز شوہر سے مل کر کئی افراد کے ساتھ ہم  
 بازی سے لاکھوں روپے ہتھیالے تھے۔“ وہ نازک گھڑی آگئی جس کے خوف کی گواہ ایک مری  
 سے اس کے سر پر رنگ رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ چائے کا مکھن جیسے اس کے حلق میں ا  
 گیا ہو۔ بیج صاحب کہہ رہے تھے۔

”عجیب بات ہے کہ اس لڑکی کی شکل تم سے ملتی جلتی تھی۔“ عابد نے ایک قہقہہ لگایا۔

اور بولا۔

”ابا جان کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ فرزل کی ہمشکل ہونے کے بجائے خود فرزل ہوتی۔ تو  
 اس کو سزا سناتے اور میں وہاں موجود ہوتا تو جانتے ہیں کیا کرتا؟“ بیج صاحب نے زندہ دلی  
 کہا۔ ”تم یقیناً مجھ سے بحث کرتے کہ اس لڑکی نے کوئی جرم نہیں کیا تصور معاشرے کا ہے۔“  
 بدستور بیٹھا ہوا بولا۔

”ابا جان میں اس سے کہتا کہ مجھ سے شادی کر لو میں تمہاری جگہ سزا بھگت لوں گا۔“

بیج صاحب سنجیدہ ہو گئے۔ انہوں نے بیج کو اپنے ساتھ چماتے ہوئے کہا۔ ”نہ“

ہٹنے والے تھوڑی دیر کے بعد اس نے ڈرائنگ روم سے باتوں کی آواز سنی۔ وہ بے چینی میں ادھر بھاگی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ وہ جب کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ جج صاحب سے اپنا ہوا تھا۔ اس نے اپنے سر کی آبدیدہ آنکھیں دیکھیں تو اس کے جذبات بے قابو ہو گئے۔ یک ایک اس نے محو کفر غزل کی طرف دیکھا اور اس کی رنگوں میں تیزی سے گردش کرنے والا خون ایک دم رک گیا۔ یہ چہرہ اس کا جانا پہچانا تھا۔ یہ وہی شخص تھا۔ جس نے اسے جینے کی جہنم کا اندھن بنا دیا تھا اور آج اسے برسوں بعد زندگی دوبارہ اس کو دیور کے روپ میں اس کے سامنے لے آئی تھی۔ وہ بیوش ہو کر دھڑام سے فرش پر گر پڑی۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ اپنے بندہ دم میں بستر پر دراز تھی۔ عابد اس پر جھکا ہوا پوچھ رہا تھا۔

”جان اب کیسی طبیعت ہے؟“

اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر دیا اور اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔ عابد کی چشمانی پر چٹکیں آ گئیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آج اسے دنوں بعد اس پر یہ دورہ کیوں پڑا۔ جب اس نے اس کو تسلیاں دیں تو غزل بولی۔

”عابد اب میں زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہوں گی۔ تم وعدہ کرو میری قبر پر روزانہ پھول چڑھاؤ گے۔“ عابد نے پیار سے اس کے رخسار پر چپٹ لگائی اور ڈانٹتے ہوئے کہنے لگا۔

”ایسی خوفناک باتیں کرتے وقت میرا نہیں تو کم از کم بچہ ہی کا خیال کر لیا کرو۔ جیسے اگر مرنے کا بہت شوق ہے اور میں جیسے اچھا نہیں لگتا تو بچہ کو بڑا ہو لینے دو پھر میں تمہارے شوق کی راہ میں مزارم نہیں ہوں گا۔“

غزل کے دل پر ایک چمک سا لگا واقعی وہ اپنے ذاتی دکھوں کی تعمیر تائیں جلا ہو کر عابد اور بچہ کو بالکل فراموش کر چکی تھی۔ ان دونوں کی خوشیاں اس کی ذات سے وابستہ تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کے لیے ہر حال میں زندہ رہنا ہے۔ وہ زار و قطار رونے لگی اس کا نونا ہوا دل جی جی جی کر فریاد کر رہا تھا۔

”کو کو! میں نے کسی کے ساتھ ایسی کوئی زیادتی نہیں کی جس کی اتنی کڑی سزا کا مجھے مستحق قرار دیا گیا ہے۔“

پانچ دن گزر گئے۔ اس دوران ساجد سے اس کا آسانا سنا نہیں ہوا۔ اس نے زیادہ وقت اپنی مسمری پر گزارا کیونکہ وہ جی جی شدید بیمار تھی۔ جج صاحب پہلے تین دن اس کو کئی کی بار دیکھنے

ہوئے اس کی طرف دیکھتے تو وہ لرز جاتی۔ اسے لگتا کہ ان کی نظریں اس کے چہرے پر اس لیے گڑی ہوئی ہیں تاکہ وہ اس کی اصلیت پہچان لیں۔ عابد باتیں کرتا تو اسے شبہ ہوتا کہ اس نے جیلے ڈھسنی ہیں اور وہ اشارہ اس پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش میں ہے کہ وہ اس کے گھناؤنے باطن سے واقف ہو چکا ہے۔ کبھی کبھار اتفاق سے اس کا سوز جگڑتا تو اسے اس کے غصے میں انتہائی اچھے پسندی نظر آتی۔ وہ تنہائی میں بیٹھ کر تجزیہ کرتی تو اسے خوف آتا کہ کہیں عابد اور جج صاحب نے اس کو کھنڈ اس لیے نظر انداز کر دیا ہو کہ بچہ ابھی چھوٹا ہے، اس کی پرورش کے لیے ماں کا دونا ضروری ہے۔ وہ اس دور سے نکل جائے تو پھر اسے اس کی مکاری دور یا مکاری کی اصلیت بتا کر کہ سے نکالنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہوگا۔ ایسی ان محنت سوچوں نے اس کے دماغ کو اپنا مستقل ٹھکانہ بنالیا تھا۔ وہ ان خیالات سے نجات پانے کے لیے کمرہ بند کر کے زار و قطار روتی رہتی۔

ایک شام عابد نے اپنے باپ سے کہا۔

”میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“ لیکن دور تک گیا جج صاحب نے سر کے اشارے سے اسے اپنی بات مکمل کرنے کے لیے کہا۔ تو وہ آہستگی سے بولا

”ساجد آیا ہے۔“ جج صاحب مداخلت کرتے ہوئے چلائے۔

”تم نے اسے دھکے دے کر باہر کیوں نہیں نکلایا۔“ عابد مسکراتا ہوا کہنے لگا۔

”میری پوری بات سن لیجئے۔ اب وہ مکمل طور پر تبدیل ہو گیا ہے۔ اب جانو وہ مجھ سے بہت کر رہا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ آپ سے معاف کر دیں۔“ جج صاحب نے ایک گہرا سانس لیا اور بولے۔

”اچھا اچھا تو یہ بات ہے، لیکن پہلے تم تسلی کر لو کہ کہیں کوئی نیا ناکہ تو نہیں رچا رہا۔ جج کے قول و فعل پر کوئی اعتبار نہیں۔“ عابد نے آدھے گھنٹے سے بھی کم عرصے میں اپنے باپ کو کبھی بچھا کر رام کر لیا اور اسے اجازت مل گئی کہ وہ اسے ہوٹل سے گھر لے آئے۔

غزل کے لیے یہ خبر دھماکہ خیز تھی۔ وہ یکفخت اپنے غم بھول گئی اس کے گھر میں ایک نیا شخص آنے والا تھا۔ کوئی انجینیئرس بلکہ خود اس کا اپنا دیور۔ دیور بھائیوں سے بڑھ کر ہوتے ہیں۔ اس کا کوئی بھائی نہیں تھا اور اب زندگی کی ابھی ہوئی راہوں میں اس کا بھائی نمودار ہونے کو تھا۔ اس نے سوچا وہ اس سے خوب خوب باتیں باتیں کرے گی۔ اس کی دیکھ بھال کرے گی۔ اس کو اذیت دینے کرے گی اور اس کے لیے پیاری پیاری دلہن لائے گی۔ اس نے پہلے ہی ذہن میں ہزاروں

کے لیے آتے رہے لیکن پھر وہ خود دلیر یا کا شکار ہو گئے اور بستر سے لگ گئے۔  
اسی دوران ایک رات ان پر دل کا دورہ پڑا۔ عابدہ اکثر کو بلا لایا۔ اس نے بتایا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں۔ سچ صاحب کو پانچ دن تک بستر سے نہ اٹھنے دیا جائے۔

عابدہ نے یونیورسٹی سے چھٹی لے لی۔ وہ مخت پریشان تھا۔ بیوی کی اور باپ کی علامات نے اسے چرمزد کر دیا تھا۔ بچہ بھی مرجھا گیا تھا۔ ایک دن یونیورسٹی سے عابدہ کو فون آیا کہ وہ دو گھنٹوں کے لیے وہاں آ جائے کیونکہ ایک اہم شخصیت معائنے کے لیے آ رہی ہے۔ عابدہ نے انکار کرنا چاہا لیکن یہ سوچ کر اس نے ارادہ بدلتی کر دیا کہ وہ اپنے شعبہ کا سربراہ ہے اور وائس چانسلر نے گزشتہ ہفتے اس کو جہالت کی تھی کہ وہ اس اہم شخصیت کو خود اپنے ان منصوبے کے بارے میں آگاہ کرے۔ جنہیں وہ مستقبل کے تعلیمی ڈھانچے کے لیے مانگ رہا تھا۔ وہ اپنے بھائی صاحب کو سچ صاحب اور غزل کی گھبراہٹ سونپ کر یونیورسٹی چلا گیا۔ اس سے لطفی یہ ہوئی کہ اس نے اپنی بیوی کو اپنے اس پروگرام کی اطلاع نہیں دی، اس کا خیال تھا کہ وہ سو رہی ہے۔ غزل آنکھیں بند کئے لیٹی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ عابدہ گھر پر ہے۔ تھوڑی دیر بعد کسی نے دروازہ کھولا تو اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ آج کا ساجد اور ماضی کا ریاض تھا، اس کے چہرے پر شدید نفرت کے آثار تھے۔

”ہوں..... تو اب تم یہاں ہو؟ مجھے علم نہیں تھا کہ تم نے میرے ہی گھر میں پناہ لے کر میرے ہی بھائی کو اپنا شوہر بنا لیا ہے۔ واقعی تم ایک حرافہ اور چال باز عورت ہو۔ مجھے تمہاری صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا تو میں تمہیں جیل بھجوانے کے بجائے اپنے ساتھ رکھتا اور ہم دونوں دوسروں کو شکار بناتے۔“ اس نے سختی سے غزل کا ہاتھ پکڑ لیا تو غزل نے دانت کچکا کر اس کے ہاتھ پر کات لیا۔

ساجد نے رو کی شدت سے اپنا ہاتھ پیچھے کیا تو وہ پوری قوت سے جھکی۔  
”بچاؤ۔ بچاؤ۔“ ساجد نے ایک زوردار پھپھرائی کے منہ پر سید کیا اور فرمایا۔  
”کتبتا اگر تمہارے طلق سے آواز نکلے تو میں بڑے میاں کو جا کر تمہاری اصلیت بتا دوں گا کہ تم دو سال پہلے میری بیوی تھیں اور میں نے تمہیں طلاق دے دی اور پھر عدالت نے تمہیں دو سال کی سزا دے کر جیل بھیج دیا۔“ غزل پر بڑبائی کیفیت طاری ہو گئی وہ پوری قوت سے چلائی۔  
”جاؤ۔ جاؤ۔“ تین دو سب کو کہہ کر تم نے میری ماں کو دھوکہ دے کر اپنی شرافت کا سکہ جمایا۔ مجھ سے شادی کی، میرا بچہ فروخت کر کے آٹھ لاکھ روپے بھجوا لیا اور پھر تم نے مجھ پر اپنا

بھوت موٹ کا پیار جنما کر میرے ام سے ایک ریکرنگ انجینیئر کھولی، سینکڑوں افراد کو دھوکہ دے کر ان سے لاکھوں روپے وصول کیے اور میری لاطمی میں جعلی پاسپورٹ اور جعلی مہر میں میرے گھر میں رکھ کر غائب ہو گئے۔“

”مانتا ہوں لیکن جانتی ہو میں سچ کا بیٹا ہوں۔ برجیہ کا ایک ثبوت ہوتا ہے تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے؟“ ساجد نے ڈھٹائی سے کہا۔

”بیٹے زمین کی عدالتوں سے ماوراء ایک اور عدالت ہے جہاں عدل کا اصل کام ہوتا ہے، اہیں سے مسائل مہیا ہوئے اور انصاف ہو گیا۔ میں نے اپنے کانوں سے تمہارا اعتراف سنا ہے۔ اب تمہارے خلاف کسی اور ثبوت کی ضرورت باقی نہیں رہی۔“ دروازے سے سچ صاحب کی آواز سنائی دی اور ساجد کا چہرہ اُٹھنے کی طرح سفید پڑ گیا۔

”میں تمہیں دو ہرے جرم کے الزام میں گرفتار کرنے کی سلاش کرتا ہوں۔“  
ساجد جیسے بے جاں ہو گیا تھا۔ ہمد کی کاروائیاں سچ صاحب کی نگرانی میں ہوئیں۔ عابدہ بڑے دل کا مالک تھا۔ ساری رودادیں کر اس نے غزل کی قدر و منزلت میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ غزل اب ہر قسم سے آزاد ہو چکی تھی اور اس کا چہرہ اپنے شوہر بننے اور سر کے لیے سد بہار لگا پ کی مانند شگفتہ و شاداب ہوئی۔



”دلہن لائیں کیوں بچھا دی۔ ہمیشہ وی کام کرنا جس سے مجھے تکلیف ہو۔ اندھی دھندلی تو ایسے ہی میں ہوں۔ رات میں اٹھتی ہوں تو دس شوکرین کھاتی ہوں۔ کتنی بار کہا ہے کہ لائین جلی پھوڑ دیا کرو۔“

”تعل کی قیمت معلوم ہے اماں بی؟ پوری رات بھر میں جل کر خاک ہو جاتی ہے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں سب کیلئے بس میں ہی ایک بوجھ ہوں سوچتی ہوگی کہ کر گر پڑاؤں، تاہم نوٹ جانے ہسپتال جاؤں اور مر کب جاؤں۔ کچھ تو بوجھ کم ہوگا۔ ماری ایسی ہی بوجھ بنی ہوئی ہوں تو ایک دفعہ خود اسافر چہ کر دو۔ نہ ہر شکوہ اور مجھے کھلا دو۔ ہائے اللہ اتنی طویل عمر کیوں دی کہ لوگ اکتا جائیں۔“ اماں بی شروع ہو گئیں۔

دل تو چاہا۔ ٹھیکہ بیگم کا جواب میں خوب سنائیں۔ لیکن شوہر کی چار پائی کی طرف دیکھ کر خاموش ہو گئیں۔ دن بھر وہ چپ میں محنت کرنے کے بعد رات کو تھوڑا سا سکون ملتا ہے۔ یہ سکون تو نہ چھینے اور انہوں نے ایک بھی جواب دے دیا تو اماں بی ساری رات نہیں سوئے دیں گی۔ اور فریاد علی کی شکایتی لہجہ میں ٹھیکہ بیگم کے بدن میں چھیتی رہیں گیں۔ بے چارے جسم کے اماں تو بونا بول ہی گئے تھے۔ کچھ بھی ہو جائے ان کی زبان بند رہتی ہے۔ ماں کی زیادتی ہوتی ہے تو ان کی اٹل کٹے رہ جاتے ہیں۔ بیوی بچھلائے تو ان لگا ہوں میں شکایت ابھرتی ہے۔ کہتے کسی سے کچھ نہیں ہیں پہلے تو ایسے تھے۔ ہر وقت ہنسنے بولنے رہنے والے نہ جانے کیوں اس طرح خاموش ہو گئے ہیں۔

شوہر کی محبت دل میں پھولی تو ٹھیکہ بیگم آہستہ سے بولیں۔

”اچھا اماں ناراض نہ ہوں۔ ابھی جلانے دیتی ہوں۔ غلطی ہوگئی۔“ اور پھر وہ ٹاٹ کے پردوں سے بنے ہوئے باورچی خانے میں گئیں۔ تختے پر سے ہاتھ اٹھائی اور لائین روشن کر دی۔

”فریاد علی بے سندھ سوز ہے تھے۔ ان کا ایک ہاتھ چار پائی سے نیچے لٹک رہا تھا۔ ٹھیکہ بیگم آگے بڑھیں اور شوہر کا ہاتھ آہستہ سے درست کر دیا۔ بے چارے کو صبح چار بجے اٹھنا تھا۔ باہر لپ پر کمزروں کی لائن لگی ہوئی تھی۔ ٹل میں پانی چار بجے سے آتا تھا اور گھڑے کستہ بجا شروع ہو جاتے تھے رات کو بارہ ایک بجے گھڑے لائن میں لگانے پڑتے تھے۔ اگر ذرا بھی دیر ہو جائے تو پھر دس

## ”ٹوٹے دلوں کا سہارا“

”حیرا ستیا ناس“ ٹھیکہ بیگم سوتے سوتے بے اختیار بڑبڑائیں اور پھر جلدی سے اٹھ کر گردن جھاڑنے لگیں۔ گردن پر ایک موٹا سا دروازہ پڑ گیا تھا۔ لیکن کھٹک ہاتھ نہیں آیا۔ کھینچی کاٹ کر چار پائی کی چول میں گھس گیا ہوگا اور اس کا ایک ہی علاج تھا۔ لیکن صرف دل کی تسلی کے لئے انہوں نے جھک کر پیچھے کے نیچے پڑی ہوئی جوتی اٹھائی اور پائے کے قریب ہان پر مارنے لگیں پھر انہوں نے زمین پر جوتی کا جھانسنے دیا۔ پلاسٹک کی کھٹک مارے گئے۔ لیکن معلوم نہیں کہ ان میں اصل بھرم کوئی تھا بھی یا نہیں۔

اصل نقل کی تیز کون کرے۔ ان موزوں کا تو مرنا ہی بہتر ہے۔ حالانکہ دن بھر چار پائیاں دھوپ میں پڑی رہتی ہیں۔ لیکن غریب کے گھر کے کھٹک بھی موسم کی شدت کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اپنا ٹھکانہ کون چھوڑے۔ جس طرح گھر میں کہیں زد بھی نہ کی کھا کر گزارہ کرتے تھے۔ وہ بے چارے بھی دن بھر دھوپ کھاتے اور رات کو پتلا پانی جیسا خون چوس کر گزارہ کر لیتے۔

نیند اچٹ گئی تھی۔ ٹھیکہ بیگم نے گہری سانس لی۔ لیکن دیوار پر لٹکا ہوا سا چالاک کچھ کر دھچک پڑیں۔

”تخت ہے جان کم بختوں پر۔ پھر لائین بھٹاتا بھول گئیں۔ کس قدر لا پرواہ ہیں۔ باپ کی پریشانیوں کا کوئی احساس نہیں۔“ دل تو چاہا کہ دونوں کی چونچیاں کھینچ کر اٹھا دیں۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر رک گئیں۔ ایک کراہ کے ساتھ چار پائی سے نیچے اتریں۔ چار پائی ان سے زیادہ قوی تھی۔ وہ ٹھیکہ بیگم سے زیادہ زور سے کراہی تھی۔ ٹھیکہ بیگم نے دالان میں تخت کے برابر رکھی ہوئی لائین اٹھائی اور اس کی حق نیچی کر کے پھونک ماری۔ تاریکی کچھ اور گہری ہوگئی پھر وہ لائین رکھنے کے بعد انداز ہے بے قدم اٹھاتی ہوئی چار پائی کی جانب بڑھیں اور اسی وقت اماں بی کی آواز سنائی دی۔

انڈیہ بیگم نے جس وقت اسے ہنسنے دیکھا ہوگا۔ وہ جانے کون سا وقت تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے حالات کو بہتر بنانے میں لگا رہتا تھا۔ لیکن آج کل حالات بہتر نہیں ہوتے۔ خراب سے خراب ہوتے جاتے ہیں۔ سو ایسا ہی ہو رہا تھا۔ یہ کوشش ناکام تھی۔ مہنگائی اور دوسرے مسائل ہمسروں کی طرح افزائش پا رہے تھے۔ پہلے وہ چھ گھنٹے محنت کرتا تھا۔ اب چودہ گھنٹے مصروف رہتا تھا۔ لیکن مہونہ پڑی کی دیواریں پتھر کی نہ ہو سکی تھیں۔ کمروں کی چیمیں بدستور نشین کی تھیں۔ ہاں اگر ترقی پائی تھی تو صدف اور تبسم کی جوانی نے ان کے حسن نے۔ حسرت زدہ مہونہ پڑی میں ان دونوں لڑکیوں کا حسن چوری کی چیز معلوم ہوتا تھا۔ پڑوس کی اکثر عورتیں کبھی تھیں کہ دونوں لڑکیاں تو کبھیں سے مہمان آئی ہوں معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن یہ مہمان ہی فریادگی کے لئے سو باندھ رہی تھیں۔

وہ ایک پڑھا لکھا آدمی تھا۔ معمولی تنخواہ تھی۔ جس میں دونو جوان بیٹیاں، ایک ماں اور بیوی اور وہ خود جسے وہ کسی گھنٹی میں ہی تصور نہیں کرتا تھا۔ سب کے سب زندگی کے لوازمات میں عمل بر ضرورت کے طلب گار۔ کہاں سے پوری ہو تھیں یہ ضرورتیں؟ اس سے زیادہ کیا کیا جاسکتا تھا۔ بے شمار بوجھ تھے زندگی پر اور ان کا بانٹنے والا کوئی نہ تھا۔ بیٹیاں بیس سال کی عمر تھیں۔ لیکن بچپن سے کم کا نہیں لگتا تھا۔ لہذا دے کر یہ ایک مہونہ پڑی تھی جو سکون کا باعث تھی۔ بیٹے کی طرح اگر یہ سر چھپانے کا لکھنا نہ بھی نہ ہوتا تو؟

فریادگی اپنی تمام آرزوؤں کو گہنا چکا تھا۔ لیکن زندگی کی جھلک میں اگر کوئی حسرت سر اٹھاتی تھی تو صرف بیٹے کی۔ کاش اس کا ایک بیٹا ہوتا۔ صرف ایک بیٹا، ایک کڑیل جوان جو اس کے جھکے ہوئے بدن کے لئے ستون ثابت ہوتا۔ ماضی بھول جانے کی چیز ہوتا ہے۔ حال جدوجہد کے لئے۔ لیکن مستقبل، مستقبل تنویر کی لکیر ہے۔ فریادگی کا مستقبل دھوپ سے چھپے ہوئے ایک طویل و عریض میدان کے سوا کچھ نہیں تھا۔

جہاں کوئی سائے دار درخت موجود نہ ہو۔ جب وہ مستقبل کے میدان پر نگاہ ڈالتا تو اس کی زبان پیاس کی شدت سے سوکھ جاتی یہ طویل صحرائے قائل عبور محسوس ہوتا اور اس وقت اس کا بدن ہولے ہولے کانپنے لگتا۔ وہ بے چینی سے ادھر ادھر گردن وٹھنے لگتا تھا۔ کاش اس کا کوئی بیٹا ہوتا صرف ایک۔

دونوں بیٹیوں کی طرف تو اس نے دیکھا چھوڑ دیا تھا۔ چند روز قبل کی سوکھی ٹکڑیاں اچانک مرہز چوں سے ڈھک گئی تھیں جو ان کا قصور نہیں تھا۔ لیکن یہ فریادگی کا قصور بن گیا۔ تحلیل آمدنی

بچے سے پہلے نمبر آئے۔ اس لئے فریادگی کو یہ کارروائی کرنی پڑی تھی اور بیڑے واری بھی فرما۔ علیٰ کسی خوشی اٹھائے ہوئے تھا۔

حالانکہ اس طرح گھڑوں کا خطرہ مول لینا پڑتا تھا کیونکہ اکثر گیل پر سے گھڑے چوری ہو جایا کرتے تھے۔ آج کل مٹی کا گھڑا بھی پچاس سا تھ روپے سے کم نہیں آتا۔ لیکن کیا بھی لیا جائے۔ چوری کا خیال کیا جائے تو پانی بھی نہ ملے۔

گھیلے بیگم نے چار پانی پر کروٹ بدلی اور آنکھیں بند کر کے خیالات کو ذہن سے جھٹکنے لگیں رات کی غنڈک میں تھوڑی سی نیند آجائے تو سکون مل جاتا ہے۔ ورنہ دن بھر کی تپش اور پھر گھر کے کام کاج، آرام کا ایک لمحہ بھی نہیں ملتا تھا۔

”ہائی“ تبسم نے صدف کے کلام بدن میں اپنی چھوٹی اور صدف اچھل پڑی۔  
”کتنی بار کہا ہے کہ گدگدی مت کیا کر۔ کسی دن ہاتھ جڑوں کی۔“ صدف نے فحشیتے میں سر گھٹی کی۔

”تمہارا بدن ہے یا روٹی کا ڈھیر۔ ذرا سی انگلی چھوڑ تو گدگدی ہونے لگتی ہے۔“ تبسم نے کہا۔

”تیری طرح پتھر کا بدن نہیں ہے۔“  
”ہوتے ہوگا۔ ہمیں تو بس ایک سی خوشی ہے۔ یہ کھل ہمارے بدن میں نہیں کاٹ سکتے۔“  
”پاگل ہے نری۔۔۔۔۔ سوئی کیوں نہیں؟“ صدف نے جھنجھلائے ہوئے انداز میں کہا۔  
”خدا بھلا کرے واری اماں کا۔ لائیں بھر مل گئی۔ بچ ہائی اندھیرا ہوتے ہی میرے بڑے بدن میں ریہہ کی موجیں ابھرتی ہیں۔ کینٹ کا چہرہ سوکھا سزا ہے۔ مکر موٹھیں لگتا ہے۔ دو گھبریاں ہر جوتے بٹھی ہیں۔“

”سوئے گی نہیں۔“ صدف فرمائی۔  
”ایمان سے ہائی ڈر لگ رہا ہے۔ ہائی تم سے لپٹ نہاؤں؟“  
”گرمی کے مارے بدن جل رہا ہے۔ دور بٹ کر لیٹ۔“  
”ارے ہائی ڈر جو لگ رہا ہے۔“ تبسم نے کہا اور صدف کی ڈانٹ کے باوجود اس نے لپٹ مٹی۔

فریادگی کی کہانی بھی بے شمار کہانیوں سے مختلف نہیں تھی جو چاروں طرف بکھری پڑی ہیں۔

"صبح کو دودھ کس نے لیا تھا؟"

"کیوں؟"

"بتاؤ"

"میرا خیال ہے تمہارے۔"

"ٹھیکہ بیگم خود لے لیا کرو۔ بچوں کا ہر ایک کے سامنے جانا ٹھیک نہیں ہوتا۔"

"اچھی بات ہے۔" ٹھیکہ بیگم نے جواب دیا اور یہ ان کی خولی جی شوہر کی بات کو ہمیشہ اہمیت دیتی تھیں اور زیادہ سوالات نہیں کرتی تھیں۔ فریاد ملی کو اگر کچھ خوشیاں حاصل تھیں تو اسی لمحہ میں کہ وہ زمانہ شناس تھا۔ اور کئی بار اس بات کو نوٹ کر چکا تھا کہ جب صدف یا تبسم دودھ لیتی تھیں تو چائے مزیدار ہوتی ہے۔ اس کی نگاہ تو ایک ایک شے پر تھی اور زمانے کی ہولناکیوں نے اس کی زبان بند کر دی تھی۔ ہر وقت ایک ہی خیال کھائے جاتا تھا کہ اس کا بوجھ بٹھنے والا ہونی نہیں ہے۔ خود تو جیسی گزرے گی گزر جائے گی۔ لیکن دونوں بیچیاں عزت سے اپنے گھر پر ملی ہائیں تو زندگی کے سب سے بڑے بوجھ سے نجات مل جائے۔ یہی گھر اس کی آنکھوں کی چٹائی کو ہٹا کر تھی وہ اپنے طور پر ہی مختار رہتا جاتا تھا۔ کسی سے اچھے سے کیا فائدہ اخبارات میں روزانہ سرخیاں ہوتی ہیں۔

پڑوسی نے نو جوان لڑکی کو اغوا کر لیا۔ لڑکی کو چھپڑنے سے باز رکھنے پر قتل کر دیا اور ایسی ہی لڑکی تیار نہیں۔ اس کے علاوہ گھر سے باہر زندگی بھی ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں تھی۔ چنانچہ دل ہی دل میں وہ ان حالات سے بہت خوفزدہ رہتا تھا۔

اس شام جب وہ ڈیوٹی سے واپس آیا تو گھر سے کچھ فاصلے پر بہت سے لوگ جمع دیکھے۔ اس کا دل دھک سے ہو گیا اور ہولے ہولے قدموں میں تیزی آگئی۔ لوگ فضل دین کے سامنے جمع تھے اور شیرو۔ ان کے درمیان دھماکا رہا تھا۔

"ابے گئی ہے۔ تمہارے باوا کی جاگیر نہیں ہے۔ سالے پانی پھیلا دیتے ہیں۔ کان کھول کر ان کو۔ آئندہ گلی میں کچھڑ ہوئی تو جھونڈے میں آگ لگا دوں گا۔"

"چھوڑو..... شیرو۔ آنکھ دو خیال۔ جس گھرے فضل دین۔ اور بات بھی ٹھیک ہے فضل دین سب گزرنے والوں کو تکلیف ہوتی ہے۔" ایک بزرگ نے درمیان میں مداخلت کی۔

"تو میں۔" شیرو بھیا تو باوجود گالیاں دینے لگے۔ "فضل دین نے کہا۔"

تری یادوں کے گلاب

میں جس طرح سانس قائم تھیں، وہی کمال تھا۔ ان بچیوں کا مستقبل کہاں سے جاتا۔ انہیں نے اسے خاموش کر دیا تھا۔ اس نے اپنی زندگی شین بنادی تھی۔ لیکن اس شین کے سارے پرزے۔۔۔ تمس رہے تھے۔ زندگی کی کشش میں خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں پتھر نہ تھے۔ ہاتھ اس کا ایک بیٹا ہوتا۔ کاش اس کے ہاتھ میں ایک پتھر ہوتا تو سائل کا تصور کیا جاسکتا تھا۔

ٹھیک چار بجے گھر پر لگے برتن گھر کے شروع ہو گئے اور فریاد ملی جاگ گیا۔ اس ہستی میں وہ تنہا ہی نہیں تھا۔ یہ ہستی سانس کی ہستی تھی۔ اس جیسے دوسرے بہت سے لوگوں کی ہستی جن کی کہانیاں ایک دوسرے سے قویٰ ہی مختلف ضرورت تھیں۔ لیکن ان کا ایک ہی محور تھا۔

پانچ بجے دودھ والے نے سائیکل کی بھٹی بجائے۔ بے سکونی کے باوجود گھر کے سب لوگ علی الصبح جاگ جاتے تھے۔ دادی اس سب معمول مسئلے پر جا بٹھی تھیں اور اذان کا اٹھار کر رہی تھیں اور ٹھیکہ بیگم والا ان میں جھاز دے رہی تھیں۔ صدف گیلی گلیز میں آگ جلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ گری کے سخت موسم میں بھی گلیز میں گیلی ہی ملتی تھی اور یہ ٹال والے کی مہربانی تھی۔ کیونکہ گیلی گلیز میں وزن میں کم چڑھتی تھیں۔ بہر حال ہر شخص نے ایک دوسرے کے لئے مشغلے مہیا کر دیے تھے تاکہ زندگی کو سکون کا رنگ نہ لگے جائے۔

تبسم برتن لے کر دودھ لینے چلی گئی۔ اس نے دروازے کا پردہ ہٹایا اور برتن آگے بڑھا دیا۔ نور محمد نے تبسم کو دیکھا اور اس کے مونہ پر مسکراہٹ چھیل گئی۔ اس نے دودھ کا برتن اس طرح تبسم کے ہاتھوں سے لیا کہ اس کی انگلیوں سے انگلیاں مس ہو گئیں۔ پھر اس نے سائیکل میں لٹکے چھوٹے ڈبے سے دودھ نکال کر دیا اور یہ دودھ بھی روزانہ سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ تبسم یا صدف جب بھی دودھ لیتی تھیں وہ گاڑھا اور مقدار سے کسی قدر زیادہ ہوتا تھا۔ اس کے برعکس جب گھر کا کوئی دوسرا فرد دودھ لیتا تو پانی جیسا پتلا دودھ ہوتا اور نور محمد بڑے ڈبے سے ہی دودھ پیا کرتا تھا۔

"آج چائے مزیدار ہے۔" دادی اماں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا اور فریاد ملی چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔

"یہ نور محمد کی خوب ہے۔ کبھی کبھی غلطی سے اچھا دودھ بھی لے آتا ہے۔" ٹھیکہ بیگم بولیں اور فریاد ملی نے انہیں بھی غور سے دیکھا پھر دفتر کے لئے تیار ہوتے ہوئے اس نے موقع پا کر بیگم سے پوچھا۔



تری یادوں کے گلاب

”نہیں تو کیا تاشے دوں گا تیرے کو۔ بس آئندہ خیال دیکھو۔“ شیر و نے کہا اور پھر اس کی نگاہ فریادہ پر پڑی۔

”سلام چاہا۔ اماں تم تو دیکھائی نہیں دیتے۔“ شیر و کا طعنه ختم ہو گیا۔ لوگ منتشر ہونے لگے تھے۔

”ہاں۔۔۔ شیر و۔ نوکری پیشہ لوگ ہیں۔ دوسروں کی مرضی پر چلتا پڑتا ہے۔ جب بھی چمنی ملے تم سناؤ کب آئے؟“ فریادہ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ شیر و ایک بغض قتل نسل سے جھوٹ کر آ گیا ہے۔ جس پر پہنچے ہوئے بکڑا گیا تھا۔ خمن ہا کی سزا ہوئی تھی۔

”بغض بھر ہو گیا۔ پر تم نظری نہیں آتے۔ فریادہ چاہا۔ سناؤ کیسی گزوری ہے؟“ شیر و اس کے ساتھ ساتھ ہی آگے بڑھ رہا تھا۔

”بس شیر و۔ خدا کا شکر ہے۔ ہم جیسے لوگوں کی زندگی کیسی گزرتی ہے۔ سب ٹھیک ہے۔“ فریادہ نے جواب دیا۔ اسے شیر و کا ساتھ چلنا گوارا گز رہا تھا۔

”نہیں چاہا، میرے لئے دعا کرتے رہا کرو۔ قسم ایمان کی مٹلے کے سب سے شریف آدمی ہو۔ میں تمہیں بڑا ماننا ہوں۔ چاہا۔ تمہاری دعا سے سارے نمے دھندے چھوڑ دیئے ہیں۔

سوچ رہا ہوں نماز شروع کروں اور گزارہ کرنے کیلئے کوئی ریڑھی لگا لوں۔ چار پیسے کمانا اچھا ہے۔ ویسے تو اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔“ شیر و نے کہا۔

”بہت اچھی بات ہے شیر و، مہنت کی کمائی میں بڑا مزہ ہے۔“

”بس چاہا ایک بزرگ سے ملاقات ہوگئی نسل میں۔ بڑے بچنے ہوئے تھے۔ ان کی دعا ہوگئی۔ اب میں ہاگل ٹھیک ہو گیا ہوں۔ سوچ رہا ہوں گھر بسا لوں۔ کوئی ٹیکہ بخت آئے گی تو ذمے داری بھی پڑے گی کندھوں پر اور پھر کسی نمے دھندے کے بارے میں سوچوں گا بھی نہیں۔“

”بڑا اچھا خیال ہے۔ کسی اچھے گھر میں رہتے کرو۔“ فریادہ کا مکان قریب آ گیا تھا اور وہ رک گیا۔

”ہاں چاہا۔ بس تم ہی نمے ہو۔“ شیر و خواہ مخواہ ہنسنے ہوئے گردن کھمانے لگا۔

”اچھا شیر و۔۔۔ بڑی خوشی ہوئی تمہارے خیالات سن کر۔ خدا تمہیں ہدایت دے اب اجازت دو۔“

تری یادوں کے گلاب

”اب یہاں تک آیا ہوں تو چاہی کو سلام کر لوں۔“ شیر و پھر ہنسنے لگا۔ فریادہ نے اسے روک دیا۔ وہ اس کی نگاہوں سے دیکھا اور پھر اس کی نظروں میں بے بسی ابھر آئی۔ وہ خاموشی سے گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ گھر کے معمولات میں کوئی تبدیلی نہیں تھی۔ جب اس نے ٹھیکہ پر تیکم کو اشارہ کیا اور وہ طرانی ہوئی قریب آ گئیں۔

”وہ شیر و آیا ہے۔ تمہیں سلام کرنے۔“

”شیر و؟“

”ہاں۔۔۔ مٹی میں مل گیا تھا۔ پیچھے لگ گیا۔ جاؤ پردے کے پیچھے اسے سلام دعا کرو۔

بس ہلدی سے ٹال دینا۔“

”میں نے کبھی بات نہیں کی اس شخص سے اب کیا کروں تم کیوں لگائے اسے ساتھ۔“

شہیدہ بیگم پریشان لہجے میں بولیں۔

”وہ خود ہی لگ گیا، بد بخت جاؤ بس ایسے ہی منگھو کر کے ٹال دو۔“ فریادہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ٹھیکہ پر تیکم بھی پریشان ہی آگے بڑھ گئیں۔

”کیسے ہو شیر و؟“ انہوں نے کاچی آواز میں کہا۔

”اوہ چاہی۔۔۔ سلام! بس سلام کرنے چلا آیا تھا۔ پڑوس کی بات ہے۔ قسم ایمان کی ہاگل اپنا بھتا ہوں۔ آپ لوگوں کو۔۔۔ کوئی تکلیف ہو چاہی تو کہہ دیا کرو۔“ شیر و نے بہت عاجزیت سے کہا۔

”تمہاری مہربانی ہے۔ بس۔“

”ارے میں تو تمہارا اپنا ہی بچہ ہوں چاہی۔ اجازت دو تو کبھی بھی آیا کروں۔ بڑی محبت ہے۔ مجھے تمہارے گھر سے۔“ شیر و نے کہا۔

اس دور ان ٹھیکہ پر تیکم کی بارگاہی جس کی شیر و بار بار اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا ہے۔

”اچھا بس یاد رہا نظری چو لیے پر رکھی ہے اللہ تمہیں خوش رکھے۔“ ہلا خر ٹھیکہ پر تیکم نے کہا۔

اور پردے کے پاس سے ہٹ گئیں۔ فریادہ نے ان سے زیادہ دور نہیں تھا اور ٹھیکہ پر تیکم اور شیر و کی باتیں سن رہا تھا۔

”ٹھیک ہے چلا جانے کا خود۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”مگر یہ مردار یہاں آیا کیوں تھا؟“



”کیا کہہ رہی تھیں؟“ فریاد علی نے پوچھا۔

فریادنی خاموشی ہو گیا۔ یہ خاموشی تمام دن اس پر غاری رہی۔ ساری رات ایک لمحے کے لئے بھی وہ سو نہ سکا۔ ٹکلیل بچہ صاف محسوس کر رہی تھیں۔ لیکن ان کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ شوہر سے کیا نہیں اور پھر اس دن فریادنی نے شیر و کے کسی قچے کو گھڑ سے نہ اٹھانے دیئے۔ دوسروں سے بھی اس نے بات نہیں کی تھی اور پھر صبح کو وہ گھر سے نکل گیا۔ لیکن آج وہ خلاف توقع جلدی واپس آ گیا۔ شیر و اس کے گھر کے بالکل سامنے اینسٹرنگ پول سے لٹکا ہوا تھا آرمین بجا رہا تھا۔ فریادنی کو دیکھ کر اس نے جلدی سے ہاتھ آرمین چلون کی جیب میں ڈال لیا۔

”چلو بے پھوٹ لو۔ چلو۔“ شیرونے کہا اور دوسرے لوگ چپٹ ہو گئے۔  
”مگر چلو جا چاہیہاں! دھوپ میں۔“

”شیر و یہ کیا حقیقت ہے کہ تم میرے گھر کو سرال کہتے ہو؟“ ایک لمحے کیلئے شیر دھنسا گیا پھر منجبل گیا اور پھر منکراتے ہوئے بولا۔

فریادِ بلی کے دماغ میں آگ روشن ہو گئی تھی۔ شعلے نکل رہے تھے۔ اس کی آنکھوں سے اس کی انگلیاں سبز کھار ہو رہی تھیں۔ دل چاہ رہا تھا کہ شیر کی گردن دبا دے۔ حتیٰ کہ اس کی زبان نکل بڑے۔ آنکھیں اٹل پڑیں۔ لیکن اس کے بعد..... سب سے سہارا ہو جائیں گے۔

ہاں بی شو کریں کھا کر گریں گیں اور مر جائیں گی۔ تھکلیہ بیگم اندھی ہو جائیں گیں۔ اور ان کی عزت، ان کی عزت و درددل شو کریں کھائے گی۔ صدف اور جسم گھر مزدوری کریں گیں۔ یہ سارے مناظر فریادہاں کی نظر میں محسوس ہوئے۔ اور اس کی انگلیوں کا بیچ کچھ ہومیا۔ اس نے غصہ ہی لگا ہوں سے شیر کو دیکھا۔

فریادِ دہلی اب وہاں نہ ٹوک سکا۔ کچھ کہنا ہے عزتی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ چنانچہ وہ خاموشی سے گھر کی طرف چل پڑا۔ شیروہیں کھڑا رہ گیا تھا۔ لیکن فریادِ دہلی کے دل کی حالت خراب تھی کاش اس گھر کو سنبھالنے والا آج کوئی ہوتا تو..... شیروہیں..... ان کے ہاتھوں زندہ نہ بچتا۔ گھر میں اس نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ البتہ دوسرے دن صبح وہ دس بجے گھر سے نکلا۔ یہ رات بھی اس نے آنکھوں میں کافی تھی۔

تیسرے دن شام کو دو عورتیں اور ایک مردان کے گھر آئے۔ وہ فریادیں اٹھا کر مکان دیکھ رہے تھے اور پھر فریادیں بھی ان کے ساتھ ہی چلا گیا۔

لیکن اسی شام غریب دلی بول چڑا۔  
 ”سامان! اندھ لوٹ گئے! ہم یہ مکان چھوڑ رہے ہیں۔ بس ضروری سامان لے لو۔ باقی اللہ

”ارے مگر چاؤ گے کہاں؟“ اماں بی نے زبان کھولی۔  
 ”جہاں عزت محفوظ ہو۔“ اماں بی بس یہاں سے نکلی۔ ”قریبا دلی نے کہا۔“



تری یادوں کے گلاب

”سر چھپانے کا ٹھکانہ نہیں چھوڑتے فریادہلی۔ ماری ماری پھروں گی۔ میری بڑھی بڑیوں میں دم نہیں۔“

”لفاس۔“ فریادہلی کی آواز میں بے پناہ کرب تھا۔

”آپ کی بڑھی بڑیوں پر میں اپنی عزت قربان نہیں کر سکتا۔ ٹھیکہ دو گھنٹے کے اندر اندر تمام تیاریاں مکمل ہو جانی چاہئیں۔“ اس نے کہا اور گھر سے باہر نکل گیا۔ دیوانگی طاری تھی فریادہلی پر۔ اس نے کسی منزل کا یقین نہیں کیا تھا۔ بس چل پڑا تھا۔ سر چھپانے کا ٹھکانہ اس نے محکڑیوں کے بھاؤ بچا دیا تھا۔ دفتر میں استعفیٰ بھی نہیں دیا تھا۔ بس خواہ لے لی تھی۔ نکت خریدے تھے اور چل پڑا تھا۔

صدف اور تبسم البتہ فرین کے سفر سے بہت خوش تھیں۔ کہیں آتے جاتے انہوں نے فرینیں دیکھی تھیں۔ لیکن ان میں بیٹنے کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ دونوں اس طویل سفر سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ چند روز گھنٹے کے سفر کے بعد فرین ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر بڑی اور فریادہلی نے یہیں اترنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ پورا کتبہ ساتھ تھا لیکن کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ کوئی تصور نہیں تھا اس وقت صبح کے چھ بجے تھے۔ اس ہستی کا نام نکلن پر تھا۔ وہ ڈھالی سوکانوں پر مشتمل۔ سرسبز زمینوں والی ہستی۔ فریادہلی نے یہاں قدم جانے کیلئے کیا کیا پاپڑ نہیں بیٹے۔ لیکن ایک سکون ضرور تھا اس تھوڑی سی ہستی میں لوگ درمے نہیں تھے۔ وہ ایک دوسرے کی تھوڑی بہت مدد کر دیتے تھے۔

فریادہلی کو قوتی ٹھکانہ مل گیا۔ یہ ایک کسان کی جھونپڑی تھی۔ نوازہلی نے انہوں سے براہ کرا اپنا نیت کا ثبوت دیا۔ وہ چوہدری شجاعت کی زمینوں پر کام کیا کرتا تھا۔ چوہدری صاحب سے کہہ کر نوازہلی نے صرف بیچیس ہزار روپے میں تھوڑی سی زمین دلا دی اس زمین پر جھونپڑی ڈھانے میں بھی نوازہلی نے پوری پوری مدد کی تھی۔ ابھی فریادہلی کے پاس اپنی جمع پونجی کی تھوڑی رقم اور موجود تھی اور بدحواس فریادہلی کو اس مختصری رقم میں اپنے اس گھرانے کا مستقبل تعمیر کرنا تھا۔

عزت کی حفاظت کیلئے یہ اندھ قادم اٹھا تا ضروری تھا۔ دوی بائیس تھیں یا تو اخبارات میں ایک سنسنی خیز خبر چھپ جاتی یا پھر ایک بزدل باپ بیٹیوں کو لیکر کنارہ کش ہو کر زندگی گزارتا فریادہلی اس ماحول سے اتنی دور نکل آیا تھا جتنی اس میں ہمت تھی۔ لیکن وہ اپنے ذہن سے خوف نہ مٹا سکا۔ کوئی شیر..... یہاں بھی پیدا ہو سکتا تھا۔ اس کی جھونپڑی ہی دکان اب چل نکلی تھی اور فریادہلی کسی قدر

تری یادوں کے گلاب

پر سکون ہو گیا تھا۔ لیکن اس خوف کو دور کرنے کیلئے کیا کیا جائے پھر جب نذیر خان نے اس کے بارے میں پوچھا تو اس نے دکھ سے بتایا۔

”کیا کہوں نذیر بھائی۔ زمانے کا ستیا ہوا ہوں۔ خدا اولاد دے تو نیک دے۔ دو بیٹیاں ہیں اور ایک بیٹا۔ مگر بیٹا بچپن سے ہی نذری صحبت میں پڑ کر خراب ہو گیا۔ شہر کا کون سا مسافر ہے جو اسے نہ جانتا ہو۔ نام تو اس کا ششدر اعلیٰ ہے۔ مگر خسو کے نام سے مشہور ہے۔ خسو قاتل ہے۔ ڈاکو ہے۔ چلنے لوگوں کی گردنیں کاٹ لیتا ہے۔ پرہیزگار اس نے اس وقت کیا تھا جب کالج کے ایک لڑکے نے میری بیٹی کو چھیڑا تھا۔ ایک ہوتو بتاؤں۔ گیارہ قتل کر چکا ہے۔ چھ لٹنوں کی ٹانگیں توڑ چکا ہے۔ پولیس اس کے فرار ہونے کے بعد مجھے ہی پریشان کرتی ہے۔ ننگ آ کر شہر چھوڑ دیا اور یہاں آ کر آباد ہو گیا۔“

”اوہ..... تو تمہارے بیٹے کو معلوم ہے کہ تم یہاں آئے ہو؟“ نذیر خان نے پوچھا۔

”اس کے مشورے پر ہی تو یہاں آیا ہوں۔ خط لکھا تھا اسے آج ہی جواب آیا ہے۔“

یہ سن کر نذیر نے تشویش ناک انداز میں گردن ہلائی۔ پھر نذیر نے خیر و کسان کو اور خیر و کسان نے فطلو کو یہ سنسنی خیز خبر سنائی کہ فریادہلی جیسے نیک دل آدمی کا بیٹا شیطان ہے۔ قاتل اور نازی گرامی ڈاکو ہے۔ وہ دروہ چلنے لوگوں کو قتل کر دیتا ہے۔

”یہ تو بڑی پریشانی کی بات ہے۔“

”اگر وہ یہاں فریادہلی سے ملے آ گیا تو؟“

چوہدری شجاعت نے فریادہلی سے ملاقات کی۔

”فریادہلی تمہارے بیٹے کے بارے میں جو کچھ سنا ہے۔ وہ ٹھیک ہے؟“

”ہاں چوہدری صاحب۔ میری ہی اولاد خدا کی دشمن کو بھی نہ دے۔“ فریادہلی نے بڑے درد بھرے لہجے میں کہا۔

”لیکن فریادہلی یہ ہستی پر سکون اور مل کر رہنے والے لوگوں کی ہے ایک پر سکون اور خوشحال ہستی اگر تمہارا بیٹا تم سے ملے آ گیا تو؟“

”وہ ضرور ہے چوہدری صاحب لیکن اس نے کسی بے گناہ کو آج تک نہیں ستایا اس ہستی نے اس کے باپ کو پناہ دی ہے۔ یہاں اس کی بہنوں کی عزت محفوظ ہے۔ اگر وہ یہاں آئے گا بھی تو شریوں کی طرح آئے گا۔“

”خیال رکھنا فریاد علی ہم نے تمہارے ساتھ نہ اسکو نہیں کیا۔“

”چوہدری صاحب میں تو یہاں رہنے بسنے آیا ہوں۔ میری دو جوان بیٹیاں ہیں انہیں میں اسی ہستی میں بیاہوں گا۔ اس ہستی کی مصمصیت کی حفاظت تو میرا بھی فرض ہے، لیکن خوفزدہ نہ رہنا، علی اپنے سامنے سے بھی ڈرتا تھا۔ وہ ہر شے پر دھواڑے ایک خط لکھتا لٹاٹے میں رکھتا اور اس ہاتھ لکھ کر لیٹرکس میں ڈال آتا۔ پھر یہ خط اسے لٹا اور واسے دوسروں کو ضرور سناتا۔

”بیارے بابا جان“

میں خیریت سے ہوں پولیس سے آگہ بچو لی چل رہی ہے۔ ابھی بچیلے دنوں ڈاکٹر ارشد کی گردن آتا رہی ہے۔ سالانہ بڑا ہوتا تھا۔ آپ اپنی قسم کب توڑیں گے؟ میرے پاس کافی دولت جمع ہوگئی ہے اگر یہ آپ کے کام نہ آئی تو پھر اس کا کیا مصروف ہے۔ میری دونوں گزریوں کو بیار۔ اماں کو سلام۔

آپ کا فرما نبردوار

شہناز علی

”حرام کی دولت میں کبھی قبول نہیں کروں گا۔ نذیر بھیا۔ میرے پاس جو کچھ ہے اسی میں اپنی بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کروں گا۔ شربت کے پیالے پر نکاح کروں گا۔ پر اس کی ایک پالی بھی حرام ہے۔ میرے اوپر بھلا میرا اس دولت سے کیا واسطہ۔“

”مگر پولیس تو اس کے پیچھے رہتی ہوگی؟“ نذیر خان نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔

”عجب ہے تم میرے نیک انسان کا بیٹا ایسا ہے۔“ نذیر خان کہتے اور پھر بات چاروں طرف پھیل جاتی۔

فریاد علی کو کافی حد تک سکون مل گیا تھا۔ ٹھیکہ بیگم اور اماں ابی کو بھی اس نے صورت حال سمجھا دی تھی۔ اور ان سے یہ درخواست کی تھی کہ کبھی ہستی کی کسی عورت کے سامنے ذکر لکھتے تو اس سے مختلف بات نہ کہیں۔

”یہ جھوٹ ہمیں اس وقت تک بولنا پڑے گا جب تک خدا ہمیں ان دونوں بیٹیوں کے بوجھ سے آزاد نہ کر دے۔“

”لیکن اس کا دوسرا رد عمل بھی ہو سکتا ہے۔“ ایک دن ٹھیکہ بیگم نے دلی زبان سے کہا۔

”کیا؟“

”ایسے بھائیوں کی بہنوں کیلئے لوگ رشتے نہیں لاتے۔ سب کو اپنی عزت اور جان کا خوف ہوتا ہے۔“

”ہاں یہ پہلو بھی ہے۔ لیکن اللہ ناک ہے۔ اس کی بھی کوئی سبیل نکل آئے گی۔“ فریاد علی نے پُر خیال انداز میں جواب دیا۔

کافی عرصہ سکون سے گزر گیا۔ لیکن گردشِ وقت سکون کی قائل نہیں ہوتی۔ تہذیبیاں اور گامے وقت کے ساتھ ہی ہیں۔ چوہدری شجاعت علی کا اچانک انتقال ہو گیا اور ان کا بیٹا کرامت علی شہر سے واپس آ گیا۔ اس نے ہستی کی چوہدری ہتھکڑیاں لی۔ لیکن وہ باپ کی طرح نیک طبیعت نہیں تھا۔ نوجوان تھا اور بیسی کے لوگوں کو اپنی رحمت تصور کرتا تھا۔

چنانچہ اس نے چند فنڈز لوگوں کو اپنے ارد گرد اکٹھا کر لیا۔ بہت سی شکایتیں جمع ہو گئیں جو صرف ایک دوسرے سے کی جاسکتی تھیں۔ ذہنوں میں خوف اور انتشار پیدا ہو گیا اور ایک ٹھکان کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔

اور پھر ایک دن کرامت علی نے تبسم کو دیکھ لیا۔ ہستی کی کھلی فضاء اور تازہ فضا نے دونوں لڑکیوں کو بھرپور جوانی سے نوازا تھا اور ان کے رخساروں پر شفقِ ابھرتی تھی۔ کرامت علی حیران رہ گیا اور اسی شام اس نے رخصتو لوہار کو طلب کر لیا۔

”سرکار۔“ رخصتو نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

”برگموند والی پکیا کے قریب ایک چھوٹی سی دکان ہے۔ جس کے پیچھے مکان بھی بنا ہوا ہے اس مکان میں کون رہتا ہے؟“ کرامت علی نے پوچھا۔

”کسی نے بتایا نہیں سرکار آپ کو۔ اگر نہیں بتایا تو میری طرف سے سن لیں اور پھر کبھی ادھر نہ دیکھیں۔ باقی پوری ہستی آپ کی ہے۔“

”کیوں؟“ کرامت علی نے پوچھا۔

”اس کا نام فریاد علی ہے سرکار۔ وہ بیٹیاں ہیں اس کی، لیکن ایک بیٹا بھی ہے، جو شہر میں رہتا ہے۔ بڑا ہی خطرناک ہے۔ بے شمار قتل کر چکا ہے۔ اشتہاری مجرم ہے۔ صرف اپنی بہنوں کے لئے دو قتل کئے ہیں اس نے۔ میرا خیال ہے سرکار بس اس گھر کو چھوڑ دیں۔“

تری یادوں کے گلاب

فریاد اُٹھ اُٹھ اپنے بدن کی کپکپاہٹ کو کہہ چھپا سکا۔ اس نے جھکی جھکی خوفزدہ نگاہوں سے رہمنوں کو دیکھا اور پھر تھوک نچلتے ہوئے بولا۔

”لیکن تجھے کیسے معلوم ہوا رہیوں؟“

”خود کرامت علی نے مجھ سے کہا تھا۔“

”اب کیا کرنا چاہئے۔ درجنویاب۔۔۔“ فریاد اعلیٰ کے اعصاب ساتھ چھوڑتے چارہ تھے۔

”میری ہستی پریشانی کا شکار ہے، سب یہ ہی بات سوچ رہے ہیں، بھیا۔ خدا تم پر بھی رحم کرے گا۔“

کے۔۔۔ کیا میرے بچے ہیں۔۔۔ جلد سے بچے ہیں، بچے ہیں، بچے ہیں۔۔۔

”بھئی بتاؤں اگر رضو..... لیکن..... لیکن کچھ ہو جائے گا۔ کچھ ضرور ہو جائے گا۔ اگر قسموں کو

”چل مارتو..... تو“

”میں نے فرزندِ نازِ جی سے کہا تھا کہ مات..... مگر جوانِ خون سے۔ زیادہ ہی گرم ہوتا ہے

.....اور نور دین آ رہا ہے۔ رز میںندارجی کا خاص مگر کا ہے۔ میں جلتا ہوں۔“ رحیم نے کہا اور

نائب ہو گیا لیکن فریادوں کا آنکھوں میں تاریکیاں ابھر آئیں۔

”آدم سرگزر و جعفر نادر بھلا“ نور دکن کی آواز سنائی دی اور فرما دلی جو تک ہوا۔

”گھر..... ماں بیٹھو..... نوروز منا بھی دیتا ہوں۔“

”کلمات سے بھلا کچھ برٹان نظر آ رہے ہو؟“ نور دس ساٹھ منے نڈی شیخ برجنہ گیا۔

”اوس..... ماں..... مرثان ہوں نورودین، مات۔۔۔۔۔“ غمر اعلیٰ نے کھنکار کر گواہی دے کر۔

”بات نہ ہے کہ فہمو آ رہا ہے۔ میرا بیٹا مجھ سے ملنے آ رہا ہے۔ اس کا خط آ رہا ہے۔“ فریاد

ملیاد مارگلا صاف کر رہا تھا۔

”اس نے لکھا تھا کہ اس نے ہمیں خواب میں دیکھا تھا اور اب اس کا دل تڑپ رہا ہے۔“

مہم سے ملنے کیلئے۔ وہ میرا بیٹا ہے۔ لورڈین۔ نہ جانے ہستی میں کس کا خون ہو جائے۔ میرے سب

سے تعلقات ہیں۔ اگر میرے من نے کوئی ایسی دیکھ کر حرکت کر دی تو پھر نہ میں اسے روک سکتا

ہوں اور نہ ہستی والوں کے دل صاف کر سکتا ہوں کہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔“

”وہ کب آ رہا ہے۔ فرما دے۔“ نور دین بچے سے کھڑا ہو گیا۔

”اللہ جانے کسی وقت بھی آ سکتا ہے۔“



تری یادوں کے گاہ

”خدا کے خیر کرے۔“ نور دین نے کہا اور گزرتے کر جلدی سے وہاں سے چلا گیا۔ اہل سرکیز کر بیٹھ گیا تھا۔ اب کیا کروں۔ کدھر جاؤں۔ بے کسی سے اس کی آنکھوں سے آنسو اہل پڑے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ زندگی بقا و حق صحرا۔ کاش..... کاش اس صحرا میں ایک سی درخت ہوتا۔ ایک سایہ دار درخت۔ وہ اپنی عزت سنبھالنے سنبھالنے ٹھک گیا تھا۔ کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ چاروں طرف بے بسی کی دھوپ تھی۔ میرے معبود..... میرے معبود میں اپنے جدو جہد سے ٹھک گیا ہوں۔ اب میں مدافعت نہیں کر سکتا۔ میرے مالک مجھے تیری رحمت و سایہ دار کر رہے۔ میرے آقا۔ اس کے آنسو بچے جا رہے تھے اور بچے بچی زمین پر گر رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

جیل کی دیواروں کے پیچھے اس نے سات سال گزارے تھے۔ پورے سات برس۔ ان سات برسوں میں ہر برس اس نے جیل توڑی تھی لیکن پکڑا گیا تھا۔ سختیاں ہوئی تھیں لیکن ہر بار اس کا عزم پہلے سے زیادہ مضبوط ہوتا۔ ہر بار وہ اپنی خامیوں پر غور کرتا اور سوچتا کہ آئندہ ان کا خیال رکھے گا۔

اور اس بار شاید قسمت نے اسے موقع دے ہی دیا۔ اس کا پروگرام بھی بہت شاندار تھا۔ اس بار وہ جیلر کی جیب لٹکے فرار ہوا تھا۔ ہمیشہ پیدل ہونے کی وجہ سے پکڑا جاتا تھا۔ لیکن اس بار پولیس اسے پکڑ نہیں سکی تھی۔ ساری زندگی سلاخوں کے پیچھے گزارنے سے تو بھر ہے کہ آزادی کی خاطر جان قربان کر دے۔

فرار ہونے سے تھوڑی دیر قبل اس نے عشاء کی نماز پڑھی تھی اور گزرتا کر دعا کی تھی۔ ”میرے آقا..... دنیا مجھے جو بھی سمجھے لیکن تو حقیقت جانتا ہے۔ میں نے جن لوگوں کو قتل کیا وہ اسی قاتل تھے۔ جنگ میں نے زندگی میں کوئی نیکی نہیں کی لیکن تو مجھے ایک موقع ضرور دے۔ میں ایک نیکی کرنا چاہتا ہوں۔ صرف ایک نیکی تاکہ جب صحرا کی تپتی دھوپ میں بے حال ہو جاؤں تو میری ٹیک ایک سایہ دار درخت بن جائے۔ میرے لئے یہ میرا حق ہے میرے معبود یہ میرا حق ہے۔“

اور یہ حق اسے عطا کر دیا گیا۔ پولیس اس کے پیچھے تھی۔ لیکن اب وہ اتنی زور نکل آیا تھا کہ پولیس آسانی سے اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی تھی۔ تقریباً سو بیڑھ سوئیل کا فاصلہ اس نے جیب کے

تری یادوں کے گاہ

ار لیے طے کیا تھا۔ پولیس کی گاڑیاں اس سے زیادہ دور نہیں تھیں۔ لیکن پھر بھی اس نے جیب ایک پھرتے پر ڈال دی اور وقتی طور پر پولیس کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن تھوڑی سی دور چلا تھا کہ جیب ایک جھٹکے سے رک گئی۔ پٹیرول ختم ہو گیا تھا۔ اس نے زپ چھوڑ دی۔ لیکن اس کے نزدیک ڈسکنا مناسب نہیں تھا۔ پھر ابھی وہ زیادہ دور نہیں چلا تھا کہ اسے دم سے چراغ نظر آئے۔ کوئی پسماندہ ہستی تھی۔ وہ ہستی کی جانب چل پڑا۔

ایک بڑے سے برگد کے ساتھ اسے ایک جھونپڑا نظر آیا اور رات کا بقیہ حصہ اس نے اسی جھونپڑے میں گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ جھونپڑا تاریک تھا۔ ان معمولی دیواروں کو پار کرنا اس کے لئے مشکل کام نہیں تھا۔ وہ اندر داخل ہو گیا۔ اس کے بدن پر قیدیوں کا لباس تھا اور نہ وہ کھلے علاقے میں بھی قیام کر سکتا تھا اور پھر جھونپڑی کی دیوار کے نزدیک اس نے ذمہ ڈال دیا۔ بدن جھکن سے بھر ہوا تھا۔ جھکن ضرور تھی لیکن اس بات کا احساس اس کے پورے بدن میں مسرت بن کر دوڑ رہا تھا کہ وہ آزاد ہو گیا ہے۔ جیل کی تنگی دیواروں سے اس کا بیچھا پھوٹ گیا ہے اور اب..... اب وہ ایک نئی زندگی کا آغاز کر سکے گا۔

رفٹا ایک آواز اس کے کانوں میں ابھری۔

”تجسم کے ابا“

”تم قسم چاک رہی ہو۔ سوئی کیوں نہیں۔ رات کا آخری پہر ہے۔“ مردانہ آواز بھرائی ہوئی تھی۔

”آپ دور ہے ہیں تجسم کے ابا؟“ عورت کی آواز میں ڈکھ تھا۔

”سو جاؤ گلیلہ خدا کیلئے سو جاؤ۔“

”کیا بات ہے تجسم کے ابا تم مجھ سے کہہ دو۔ میں تمہارے ڈکھ درد کی شریک ہوں میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتی۔ لیکن تمہارے ساتھ رو تو سکتی ہوں۔“ عورت کی سسکیاں ابھریں اور ان میں مرد کی ہچکیاں بھی شامل ہو گئیں۔

”نہ پوچھو گلیلہ کچھ نہ پوچھو۔ خدا کیلئے کچھ نہ پوچھو۔ زخموں کی کہانی سناؤں گا تو تمہاری آنکھوں سے غون اہل پڑے گا۔ مجھے تباہ کئے دو۔ تم میرا دکھ نہیں بانٹ سکتیں تجسم کی ماں کوئی میرا دکھ نہیں بانٹ سکتا۔“

”ایسا نہ کہو تجسم کے ابا۔ جہیں میری قسم ایسا نہ کہو۔ میں ان پڑھ جاہل ہوں لیکن میں تمہاری



فریاد علی نے ہی کھولا تھا۔ کرامت علی کو دیکھ کر اس کا چہرہ اتر گیا۔

”سلام فریاد علی چاچا۔“ کرامت علی نے کہا۔

”سلام سرکار۔ صبح ہی صبح کیسے تکلیف کی مجھے بلا لیا ہوتا۔“

”چاچا تمہارے دل میں میرے لئے کوئی رُخا ہے؟“ کرامت علی نے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔ نہیں تو سرکار کسی نے کچھ کیا ہے۔“ فریاد علی لجاجت سے بولا۔

”میں بھی تمہارا بیٹا ہوں چاچا۔ مجھے سرکار مت کہو۔ تمہاری دونوں بیٹیاں میری بہنیں

ہیں۔ میں ایک بیٹے کے اندر اندر اچھا اچھے لڑکے دیکھ کر ان کی شادی کرادوں گا تمہیں فکر کرنے کی

ضرورت نہیں ہے۔“ کرامت علی نے کہا اور فریاد علی کا منہ کھلا رہ گیا۔ اچانک اسے محسوس ہوا جیسے

دھوپ سے تپتے صحرائیں پانی برس گیا ہو اور بے شمار کوٹلیں سر اٹھار رہی ہوں۔

☆.....☆.....☆

شش..... ہمسو۔ فریاد علی کا بیٹا؟“ کرامت علی نے ہلکے سے پوچھا۔

”ہاں۔ ٹھیک سمجھا تو نے۔ کیا کریں اب تیرا۔ بول گردن اتار دیں یا صرف ہاتھ پاؤں

کاٹ دیں بول سرے۔“ اس نے آگے بڑھ کر کرامت علی کے سینے پر گھٹنا رکھ دیا اور کرامت علی

کی آنکھوں میں موت ناچنے لگی۔

”فلطی ہوگئی ہمسو..... معاف کر دو۔ تمہیں خدا کا واسطہ معاف کر دو بس ایک بار معاف

کر دو۔ شیطان نے بہکا دیا تھا۔ وہ..... وہ دونوں میری بہنیں ہیں۔ خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا

ہوں کہ آج سے میں انہیں بہنیں سمجھوں گا۔ ہمسو بھیا خدا کیلئے مجھے معاف کر دو۔“

”مکاری کر رہا ہے۔ سرے ہم سے مکاری کر رہا ہے اور خدا کا نام بھی لے رہا ہے۔ مگر ہم

مکی گولیاں نہیں کھیتے۔ ارے ہم جڑی کیوں نہ ختم کر دیں برائیوں کی۔ نہ جڑ ہوگی نہ برائیاں

بھونٹیں گیں۔“

”ایک بار معاف کر دو..... ہمسو صرف ایک بار دوسری بار فلطی ہوتو پھر میں تم سے معافی

مانگوں گا۔“ کرامت علی نے مذہب لہجے میں کہا۔ اس کی نگاہیں چند اور گنڈ اسے پر جمی ہوئی تھیں۔

وہ خوفناک نگاہوں سے کرامت علی کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”ایک شرط پر کرامت علی۔ ایک شرط پر ہم تیری جان بخش سکتے ہیں۔“

”ہولو..... ہمسو بھیا ہولو۔“

”تو نے کہا ہے کہ اب وہ دونوں تیری بھی بہنیں ہیں۔ تجھے ایک بیٹے کے اندر اندر اچھے

لڑکوں سے ان کی شادی کرانی ہوگی۔ ساری ذمے داری تیری ہوگی۔ میرے باپ کو کوئی پریشانی

نہیں ہونی چاہئے۔ سمجھا؟“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ ایسا ہی ہو گا ہمسو۔ ایسا ہی ہو گا۔“

”یہ مت سمجھنا کرامت علی کہ میں دوبارہ پولیس کے ہاتھ آ جاؤں گا۔ تجھ سے دور بھی نہیں

رہوں گا اگر وعدہ خلافی کی تو میں تجھے زندہ نہیں چھوڑ دوں گا۔ کرامت علی۔ زندگی میں پہلی بار کسی کی

جان بخش رہا ہوں۔ ہمسو اس کے سینے پر سے اتر گیا۔

”میں وعدہ خلافی نہیں کروں گا۔ ہمسو۔ میرا منہ علی خوف کی گہری گہری سانس لے کر

بولا اور ہمسو اب اس مڑ گیا۔

دوسرے دن صبح ہی صبح کرامت علی فریاد علی کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ دروازہ



آتا تھا۔ ہم نے یہ گھر بچلے ماہی ابوی رہائش گاہ کے بعد خریدا تھا۔ چلی منزل کرائے پر چڑھا کر خود اوپر شفٹ ہو گئے تھے لیکن پہلے ہی دن جب اس لڑکی کو کام کاج کرتے ہوئے دیکھا تو مجھے اس سے عشق ہو گیا۔

میرے پاس ایک دور چین تھی جو میں اپنے کمرے کی کھڑکی کی اندرونی جالی سے لگا کر اس لڑکی کو کام کرتے ہوئے دیکھتا رہتا۔

میں ان دنوں ایل ایل بی کے پیپر دے کر فارغ ہوا تھا۔ راوی فرصت ہی فرصت نکلتا تھا۔ لہذا میں اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے کھڑکی کی جالی کے ساتھ دور چین لگا کر ہر وقت اس گھر میں جاؤنگا رہتا۔ چینیوں کی وجہ سے چونکہ میں مسلسل دور چین سے ان کے گھر کا فضا مشاہدہ کرتا رہتا لہذا چند ہی دنوں میں مجھے اس گھر کے تمام افراد کی انکیتوینی کا علم ہونے لگا۔ علی السبیل مالکن خاتون اٹھ جاتی۔ گھر کے مختصر باغچے میں ننگے پاؤں سیر کرتی۔ ہلکی پھلکی ورزش۔ اس کے بعد ملک فیک بنا کر چلی اور پھر دواش روم میں ٹھس جاتی۔ اس دوران مالکن کی ماں بچن میں جاتی اور ناشتہ کی تیاری کرتی۔ جب تک وہ ناشتہ تیار کر کے ٹرالی پر رکھتی اس کی بیٹی اپنے کمرے سے ایسی تیار حالت میں باہر نکلتی کہ نہاؤ کر نیا سوٹ پہن کر خوب نئی سنوری ہوتی۔ ہلکا ہلکا میک اپ، کلائیوں میں تازہ پھول، بال کٹے، گہرے چاک واپی چست کرتا یا قمیص۔ فراغ سیز اور لاٹا نشانے پر ڈھلکا دوپٹہ۔ آگے خوب خوب کالی ہو رہی ہوتیں۔ اتنی دیر میں آٹھ ساڑھے آٹھ بج چکے ہوتے اس کا خاوند جو ایک وجہ مرد تھا کسی بینک میں ملازم تھا۔ تیار ہو کر ناشتہ کرنے پہنچ جاتا۔ اوجیز عمر خاتون ناشتہ ان کے کمرے میں چھوڑ کر خود چلی جاتی۔ تو دونوں جوان اور خوبصورت میاں بیوی ناشتہ کرتے اور ساتھ میں ہلکی پھلکی شرارتیں بھی جاری رہتیں۔ اور یہ سارا منظر میں اپنی دور چین کی آنکھ سے کمرے کی کھڑکی کی اندرونی جالی کے پیچھے سے خاموشی سے دیکھتا رہتا۔ گو میرے پاس گیلری کی سہولت بھی موجود تھی لیکن ہر وقت گیلری میں کھڑا ہونا معیوب تھا۔

لیکن بات یہاں تو ختم نہیں ہوتی۔ بلکہ ناشتہ کر کے لڑکی کا خاوند گاڑی نکالتا اور بینک اپنی ایوبلی پر چلا جاتا۔ گاڑی کے گیٹ سے نکلے تک اس کی بیوی اس کے ساتھ مسکراتے مسکراتے ہاتھیں کرتی رہتی۔ مجال ہے جو بھی ایک دن بھی ان کی جھڑپ ہوتی ہو۔ میاں بیوی کا ایک دوسرے کو ہانے کہنے کا آخری منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

خاوند کے جانے کے بعد ایک دفعہ پھر ٹرالی پر ناشتہ سجایا جاتا اور اب کہ وہ مالکن لڑکی خود اس

## وہ آرزوؤں کے خواب بنتا

لڑکی تھی..... جس کا چہرہ بھرتا بھرتا

عمر بی کوئی اٹھارہ بیس..... یہ سوئی سوئی قصب کی آنکھیں..... لائی لائی پلکیں..... والٹیس جیسے سادہ کی کالی گھٹائیں..... بھرا بھرا گول منہ لہلہ چہرہ..... دس بھرے ہونٹ..... معصویت جیسے آنہ پڑی ہون۔ نہ دلی نہ موٹی۔ قد قدرے لٹکا ہوا۔ رنگت سرخ و سپید۔ کپڑے بھی چست و نشت۔ بے ہمتی لیکن وہ آترن ہوتے..... کیونکہ وہ ہمارے سامنے والے گھر کی ملازمہ تھی۔ نکل وقتی ملازمہ۔ رات ہی بھی وہیں تھی اور مالکن اس کی ہم عمر لڑکی تھی جو پھر ہی قصب کی فیشن ایبل، ہر وقت نئی نئی سنوری..... خوب صورت مالکن بھی تھی لیکن بہر حال وہ چیز نہ تھی۔ ہمارے اور اس گھر کے درمیان بیس فٹ کی گلی تھی۔ ان کا مکان اس گلی کا سب سے بڑا اور خوبصورت تھا۔ مکان کیا تھا چھوٹا سا نا بلکہ ہی تھا۔ چپاس فٹ کا فرٹ۔ کالا لوہے کا گیٹ۔ گیٹ کے دائیں بائیں سرو کے دو چوڑے۔ چھوٹی سی روش، برآمدے تک جاتی دائیں طرف چھوٹا سا خوبصورت لان جس میں گھاس، تھلے اور ایک دو درخت تھے۔ پائدر کے سامنے تھلے دو کرسیاں اور ٹونے کی میز ہر وقت رہتی۔ گھر کشادہ اور ڈی کی شکل میں دو منزلہ تھا۔ نیچے برآمدہ اوپر گیلری..... اتفاق سے میرے کمرے سے تقریباً سبھی کمروں پر نظر پڑ سکتی تھی۔ چھوٹی سی مہران گاڑی بھی تھی ان لوگوں کے پاس۔ گھر کے گل باغی افراد تھے۔ مالکن اور اس کی ماں۔ چالیس بیس سالہ سوئی سٹائوٹی عورت چہرے پر کنگھی بھری لپٹا چوٹی..... مالکن کا خاوند جو کسی بینک میں ملازم تھا اور ایک مالکن کا دوپہر خوبصورت ساتھیس چوبیس سالہ جوان شیور چوڑا..... رات بھر لی وی دیکھتا علی الصبح سو جاتا۔ دن چڑھے اٹھتا اور اب دوپہر کسی کالج کی دوسری شفٹ میں پڑھنے چلا جاتا۔

میرا کمرہ دوسری منزل پر گیلری والا تھا لہذا اس کمرے سے اس گھر کا سارا منظر صاف نظر

تری یادوں کے گلاب

فرانی کو جھٹکتی ہوئی اپنے دیور کے کمرے کے دروازے کے پاس لے جاتی اور پلکے پلکے دروازہ کھٹکتی۔ دوسری یا تیسری بار دستک کے بعد دروازہ کھٹکا اور فرانی کمرے میں لے جاتی۔ جتنی دیر میں اس کا دیور دواں دواں دم سے منہ ہاتھ دھو کر نکلتا اتنی دیر میں ادھر ادھر کا ٹھہرا ہوا سامان اٹھا اٹھا کر سلیقہ سے اپنی اپنی جگہ پر رکھتی رہتی۔ پھر دیور ناشتہ کرتا اور وہ اس کے پاس بیٹھی ہنس ہنس کر باتیں کرتی۔ ادھر جب وہ لڑکی اپنے دیور کو ناشتہ کر رہی ہوتی اس کی ادھیڑ عمر والدہ اس کو خوبصورت نوکرانی کے کمرے کی باہر سے جتنی لگا دیتی۔

ثابت یہ ہوا کہ اس نوکرانی کے گیارہ بچے سے پہلے جاگ کر کمرے سے باہر آنے پر پابندی تھی۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ نوکرانی کا نام ارم اور ماگن کا بیٹا تھا۔ بارہ بچے کے بعد نادیہ کا دیور بھی کاٹ چلا جاتا تو دونوں ماں بیٹی کمرے میں بیٹھ کر باتیں کرتیں یا بازار چلی جاتیں لیکن جانے سے پہلے نوکرانی ارم کو ڈھیر سارا کام بتاتا نہ بھولتیں۔

☆.....☆.....☆

اس کے بعد ان کی واپسی تین بچے کے قریب ہوتی۔ جب تک نوکرانی سارا گھر صاف کرتی رہتی۔ کپڑے اور دیگر اکثر کام کر چکی ہوتی اور ہاٹری پکا چکی ہوتی۔ یوں جھکی ہوئی ماں بیٹی کھانا کھا کر سو جاتیں اور پری چروہ نوکرانی دوبارہ کام میں جت جاتی۔

شام پانچ بجے کے بعد نادیہ کا خاندان میران گاڑی میں واپس آتا اس وقت نادیہ قیلولہ کی غرض سے سو کر اٹھنے کے بعد سوٹ بدل کر نیا میک اپ کر چکی ہوتی۔ یوں جھکے ہارے گھر آنے والے خاندان کو فریش اور کھلی کھلی مسکراتے ہوئے ملتی اور خاندان کے گاڑی سے نکلنے والی اس کی بانہوں میں بھول جاتی جس سے اس کی ساری تھکن دور ہو جاتی۔

☆.....☆.....☆

میں ایک نہایت شریف لڑکا ہوں لیکن باوجود کوشش کے وہ نوکرانی میرے دماغ سے نہ نکل سکی تھی۔ میں ہر روز چھپ چھپ کر اس کا نظارہ کرتا اس کے چہرے پر ہلاکی مصعوبیت تھی۔ وہ دن بدن میرے دل و دماغ پر چھائی چلی گئی لیکن مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کروں کس کو کم راز بناؤں۔ کس سے پوچھوں کہ مجھے بتاؤ تو کسی یہ اگر نوکرانی ہے تو رات دن اسی گھر میں کیوں رہتی ہے۔ کبھی کبھار اس کے کمرے کو باہر سے لاک کیوں کر دیا جاتا ہے۔ پھر اس کا لباس نوکرانیوں والا نہ تھا۔ اکثر اس نے ہلکا ہلکا میک اپ بھی کیا ہوتا۔ کئی بار میں نے اسے سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا

تری یادوں کے گلاب

کھاتے یا کھل کر کھپ لگاتے بھی دیکھا لیکن کام سارا وہی کرتی۔ دوسری لڑکی تو جو مجھے گھر کی ماگن ہی نظر آتی کبھی میں نے اس کو کام کرتے نہیں دیکھا۔ جب بھی دیکھا بڑے ہی غرے میں ہوتی۔ چلتی بھی ایک خاص انداز اور شوخی سے تھی۔

☆.....☆.....☆

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں فرسٹ ایئر میں پڑھتی تھی۔

میری ایک نئی نئی سیکل تھی جس کا نام نادیہ تھا۔ بھائی جان جو بینک میں ملازم تھے مجھے روزانہ گاڑی پر کالج چھوڑنے جاتے۔ نادیہ کا تعلق بہت ہی غریب گھریلو سے تھا۔ وہ لوگ کرائے کے چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے۔ اس کے والد کسی پرائیویٹ دفتر میں ملازم تھے۔ وہ اپنے والدین کی انکوٹی اولاد تھی۔ اس کے شوق کی خاطر وہ اسے بڑی مشکل سے کالج میں پڑھا رہے تھے۔ نادیہ کو مجھ جیسی سرخ و سپید تو نہ تھی لیکن اچھی خاصی خوب صورت تھی۔ اس کے چہرے پر سب سے زیادہ توجہ مبذول کر لینے والی اس کی بڑی بڑی آنکھیں اور ان پر لانی لانی چٹکیاں تھیں۔ جنہیں وہ دوران گفتگو بار بار جھپکاتی اور پتلیاں دائیں بائیں گھماتی۔ کسی بات پر حیران ہوتی تو چشم فرشتاں کو حریفہ پھیلا لیتی جس سے اس کی دلکشی میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ اس کے چہرے میں مزید کشش کا باعث اس کی بات ہے بات اسی تھی۔ ذرا فراموشی بات پر کھٹکھٹا کر ہنسا شروع کر دیتی اور پھر ہنسنے ہی چلی جاتی۔ جس سے اس کے مورتیوں ایسے دانت دیکھنے والوں کا دل موہ لیتے۔ لیکن بہر حال وہ بہت زیادہ گوری نہ تھی بلکہ آپ اسے گندی رنگت کہہ سکتے ہیں۔ ہاں البتہ میں بہت زیادہ خوبصورت تھی۔

میرے ابو رینارڈ سرکاری افسر تھے۔ اچھی خاصی پٹن اور اتارا گھر محلے میں سب سے خوبصورت تھا۔ نادیہ روزانہ میرے ساتھ کالج جاتی اور واپسی پر بھی ہم اسے اس کے گھر تک ڈراپ کر دیتے ہم دونوں میں گہری دوستی ہو گئی تھی وہ اکثر ہمارے گھر آتی لیکن میں بہت کم اس کے گھر جاتی کیونکہ وہ جس محلے میں رہتی تھی وہاں کا ماحول کچھ زیادہ اچھا نہ تھا۔

پھر یوں ہوا کہ نادیہ کے والد فوت ہو گئے۔ نادیہ کی تو دنیا ہی اندھیر ہو گئی۔ والد کی وفات کے بعد ان کے مالی حالات اتنے خراب ہو گئے کہ وہ گھر کا کرایہ ہی نہ دے سکتے۔ دو تین مہینے تو مالک مکان اس کے والد کی وفات کی وجہ سے مروت میں رہا مگر پھر قضا کرنے لگا لیکن جب ان کا کرایہ پانچ ماہ کا ہو گیا تو اس نے انہیں نکال دیا وہ اور اس کی والدہ ہمارے گھر آ گئے۔ اس کی والدہ

ترکی یادوں کے گلاب

میری امی سے کہنے لگیں کہ ہمیں یہاں ایک چھوٹا سا کمرہ دے دو ہم دونوں ماں بیٹی تھارے گھر کا کام کاج کر دیا کریں گے۔ میری امی نے ابو سے مشورہ کیا مجھ سے پوچھا تو میں نے بھی یہی کہا کہ یہ بے سہارا ہیں۔ ناویہ میری گہری دوست ہے۔ اسی بہانے وہ یہاں تو رہیں گے فنانس دونوں ماں بیٹی کو محبت پر ایک خالی کمرہ دے دیا گیا۔ آتے ہی انہوں نے چند ہی دنوں میں گھر کی صفائی ستھرائی کا ایسا نظام سنہالیا کہ سب خوش ہو گئے۔ کپڑے دھونا استری کرنا، مچھن کمرے چھکنے لگے۔ مچھن، دواش رو دھو لاش کرنے لگے حتیٰ کہ سنور بھی صاف ستھرا ہو گیا۔ ناشتہ، منج اور رات کا کھانا ہر وقت بروقت اور انتہائی سلیقے سے تیار کرتیں۔ گھر کے بھی افراد ان سے خوش تھے جس تو بہت زیادہ خوش تھی۔ ناویہ اور میں فارغ وقت میں جی بھر کر کہیں لگتا تھا۔ کالج کچھ دن تو وہ میرے ساتھ جاتی رہی پھر اس کی امی نے کہا۔ بیٹی تم امیر لوگ ہو۔ اس کمزور بھٹے نے آنکھ زخمی میں گھروں کے کام بنی کرنے ہیں کالج پڑھا کر اس کی عادتیں خراب نہ کرو۔ وہاں تو امیر لڑکیاں جاتی ہیں۔ اس کو گھر رہنے دو۔ یہ میرے ساتھ ہی کام کرے گی۔ یوں ناویہ کالج جانا بند ہو گیا جس سے میں بہت اداس ہو گئی۔ مجھے اس سے اس قدر محبت تھی کہ کالج سے آتے ہی میں ناویہ پکار پکار کر بلا لیتی اور اس سے کپ شپ شروع کر دیتی۔ باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے ہاتھ بھی چلنے رہتے۔ میرا ایک اٹھا کر الماری میں سلیپے سے رکھتی میرے شوز اور سوزے راپنی جگہ پر صاف کر کے رکھ دیتی۔ میرے تھیل کرنے کے لیے کپڑے لے آتی۔ پوچھا م سنہالیا تھا۔ میرے آنے سے قبل ہی میرے لیے ملک فیک بنا کر فرنیچ میں رکھ چھوڑتی جو گھر آتے ہی مجھے چلاتی۔ کھانا لگاتی۔ برتن اٹھاتی۔ میرے کپڑے پر نہیں کرتی۔ غرضیکہ وہ نہ صرف میری دوست تھی بلکہ میرے کام بھی دوڑ دوڑ کر کرتی۔ ناویہ کی وجہ سے مجھے بہت زیادہ سہولت ہو گئی تھی اس کی اماں سیکڑ تو گھر بھر کے کام کرتی۔ جس میں ناویہ بھی ان کا ہاتھ بٹاتی لیکن جس وقت میں گھر ہوتی تو ناویہ صرف میرے ہی کمرے میں منڈلاتی رہتی۔ اس کی موجودگی سے مجھے خاص فرحت اور سرور حاصل ہوتا۔ حالانکہ میں نے اسے کبھی ملازم نہیں سمجھا لیکن خود کو وہ ملازم ہی سمجھتی بلکہ میرے سمجھانے پر بھی باز نہ آتی میں نے کسی پارٹی یا شادی کی تقریب میں جانا ہوتا تو بے ہی چاؤ اور چاؤ سے مجھے تیاری میں مدد دیتی الغرض مجھے آہستہ آہستہ اس نے ست اور کامل بنا دیا۔ میں اپنے چھوٹے سے چھوٹے کام کے لیے بھی ناویہ کی طرف دیکھتی یا اس کا انتظار کرتی۔ بلکہ یوں سمجھتے کہ مجھے ناویہ کا نشہ ہو گیا۔ میں اس کی بچی ہو گئی۔

ترکی یادوں کے گلاب

شروع شروع میں امی نے شک کا اظہار بھی کیا کہ کہیں یہ ماں بیٹی چور نہ ہوں اس کی تصدیق کے لیے کئی بار امی نے اور وایک بار میں نے بھی جان بوجھ کر کچھ نوٹ بسز پر یا فرش پر بیٹک دیئے یا کھلی دراز میں رہنے دیئے۔ دو تین بار کاغذی، چھلا پابندہ مگر اوپر لیکن دونوں ماں بیٹی اتنی شریف اور نیک فطرت تھیں کہ پوری ایمان داری سے اٹھا کر سنہال دینے اور واپس کر دیئے بلکہ آنکھ وہ استیاء کی تھیں بھی کرتیں۔ ناویہ کی امی نے تو ایک بار ہاتھ بھی جوڑ دیئے کہنے لگیں بنی ہم غریب لوگ ہیں اور بے سہارا بھی۔ غریب پر چوری کا الزام لگنے میں دیر کتنی لگتی ہے احتیاء کیا کریں۔ اس دن کچ بچھیں تو مجھے بے ایثار آیا یاں بیٹی پر۔ ناویہ تو مجھے جان سے پیاری تھی لیکن اس کی حد سے زیادہ خدمت کی وجہ سے مجھے کام کرنے کی عادت نہ رہی۔ اب تو میں اتنی سنت ہو گئی کہ کالج سے واپس آتے ہی وہ چپ سے بیڈ پر اوندھی لیٹ جاتی اور ناویہ بے چاری ہی میرے شوز اتارتی۔ شروع شروع میں مجھے اس کی اس عادت سے جھجک سی محسوس ہوتی۔ لیکن بعد میں عادی ہو گئی۔ یوں میں ناویہ کی وجہ سے خاصی بہل پسند بن کر رہ گئی۔

گھر میں یوں تو ہر طرح کا سکون تھا لیکن ایوار بھائیوں میں کبھی کبھی تلخ کھای ہو جاتی۔ اس کی وجہ ریاضت منٹ کے بعد ابو کا کوئی کام نہ کرنا تھا۔ ابو کا موقف تھا کہ بچپن سال سروس کے بعد اب میں تھک گیا ہوں پھر جوان اولاد کو س لیے ہے۔ جبکہ بھائیوں کا کہنا تھا کہ لوگ تمہیں بیس سال تک سروس کرتے ہیں آپ کو اتنی جلدی پشن لینے کی کیا ضرورت تھی ابھی ایک بھائی اور بہن پڑھ رہے ہیں۔ خیر کوئی انتخاب نہ تھا تاہم ابو بیٹیوں کے منہ کو آ جانے سے چپ چپ رہنے لگے۔

ہماری ایک پیمپو کینیڈا میں رہتی تھیں۔ اچانک خبر ملی کہ ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ امی ابو اور چوہا بھائی ارسلان کینیڈا چلے گئے۔ ارسلان پہلے ہی ایک بار چکا تھا۔

چند دنوں کے بعد ارسلان کا آدمی رات کو فون آیا۔ وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ ابو اور امی شدید قسم کے ایکسڈنٹ میں جاں بحق ہو گئے ہیں۔ یہ روع فرسا خبر بجلی بن کر گری۔ میں اور بھائی جان نا صر بڑی دیر تک لپٹ کر روتے بکھتے رہے۔ ہم کتنے پر قسمت ثابت ہوئے کہ ماں باپ کا آخری دیدار بھی نہ کر سکے۔ ہمارا تو گھر ہی ویران ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

امی ابو کے انتقال کے تقریباً دو ماہ بعد تک ہمارے گھر میں افسردگی اور اداسیوں کے



تری یادوں کے گلاب

دیر سے رہے۔ والدین کے بغیر پورا گھر بھائی بھائی کرتا محسوس ہوتا۔ وقت بھر مہلا دیتا ہے ہماری بھی زندگی آہستہ آہستہ ڈگر پر آتی چلی گئی ارسلان بھائی سے روزانہ سی فون پر بات ہوتی۔ ایک دن فون پر انہوں نے بتایا کہ وہ چند دنوں بعد واپس آ رہے ہیں۔ اس مقام پر سے میں نادیا، اس کی اسی میری دلجوئی کرتی رہیں۔ ان کی خدمت میں کوئی کمی نہ آئی بلکہ گھر کا سارا انتظام انہوں نے ہی سنبھالا ہوا تھا۔

لیکن ایک دن ایک ایسا واقعہ وقوع پذیر ہوا جس سے میں لرزہ برامقام ہو گئی اور میری زندگی کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ ہوا میں کہ ایک دن ہمارے کالج نے شمالی علاقہ جات کے نو راکہ تین روزہ پروگرام ترتیب دیا۔ میں نے گھر بھر بھائی کو بتایا تو انہوں نے بخوشی جانے کی اجازت دے دی۔ نادیا نے میری ساری تیاریاں مکمل کروائی اور میں کالج کی لڑکیوں اور بچوں کے ساتھ بیر پائے کو چلی گئی۔

لیکن جب تین دن کے بعد گھر واپس آئی تو پہلا منظر جو دیکھا وہ یہ کہ بھائی جان ناصر اور نادیا ڈانٹنگ ٹیبل پر بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں اور خوش گیسوں میں مصروف ہیں۔ خاص بات یہ کہ نادیا انتہائی خوب صورت لباس میں تھی۔ فیل منسک اپ، ڈیزرائٹ سے لدی پھندنی ہاتھوں بیروں پر جھندی میری کھوپڑی ہلکے سے اڑ گئی۔ میں کوئی بچی تو تھی نہیں۔ پہلی نظر میں ہی بھائی بھائی اور معاف کی تہنیک جانتی تھی۔ مجھے چپ سی لگ گئی۔ میری شوخی بل بھر میں اڑ چھو ہو گئی۔ میں خالی خالی نظروں سے کبھی بھائی اور کبھی نادیا کو دیکھنے لگی۔ نادیا مجھے دیکھتے ہی گرم جوشی سے اٹھ کر میرے پاس آئی۔ بھائی ناصر بھی کھڑے ہو گئے۔ لیکن میرے قدم جم چکے تھے اور جسم لرزاں تھا۔

”آؤ ارم“ بھائی اور نادیا نے مجھے پکڑ کر صوفے پر بٹھایا اور ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

”اصل میں ارم۔۔۔ وہ۔۔۔ یہ دراصل سب کچھ غلط میں ہوا۔“ ناصر بھائی بوکھلا گئے تھے پھر وہ کافی دیر مجھے اعتماد میں لینے کی کوشش کرتے رہے۔ وضاحتیں پیش کرتے رہے۔ نادیا بھی باتیں کر رہی تھی۔ مگر مجھے کچھ سنائی نہ دے رہا تھا۔ مجھے ان کی آوازیں دور کسی کونوئیں سے آتی سرگوشیاں محسوس ہو رہی تھیں۔ کچھ سمجھ نہ آئی کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ بس نقطہ اتنا ہی پتہ چلا کہ ان دونوں نے شادی کر لی ہے۔ اور یہ تو مجھے گھر میں داخل ہوتے ہی پتہ چل چکا تھا۔

رات بھر میرا دل باغ باغ رہا۔ بھائی جان کمرے میں آ کر کافی دیر تک بیٹھے رہے۔ مجھے

تری یادوں کے گلاب

تمنی بخشی دیتے رہے۔ لیکن میں بکلیہ میں منہ چپا کر زار و قفا روٹی رہی۔ دکھ اس بات کا تھا مجھے ان لوگوں نے کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ بلکہ مجھے شہر سے کسی خوشی باہر بھیجا۔ اور چہروں کی طرح شادی کر لی اور نادیا کو تو دیکھو ڈانٹنے نے کس طرح خالی گھر دیکھ کر قلب لگائی۔ پتہ نہیں کس وقت بھائی جان چلے گئے رات بھر میں بلک بلک کر روٹی رہی۔ اسی ابو کے جاتے ہی کیسے بھائی نے مجھے فراموش کر دیا تھا۔

جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔ صبح تقریباً گیارہ بجے میری آنکھ کھلی۔ نادیا میرے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ اسے اپنے پاس دیکھ کر میں جھکے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ٹھسے سے بولی۔

”کلک چاہیرے کمرے سے۔۔۔“ اور ہاتھ سے دروازے کی طرف اشارہ کیا تو نادیا نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر دروازے کی طرف جہاں نادیا کی ماں اور ناصر بھائی کھڑے تھے جن کے چہرے سے بددی کے تاثر ابھرے وہ تیزی سے میری طرف بڑھے۔

”کیا بیچو فون جیسی باتیں کر رہی ہو ارم۔“ جہاد بھائی بھائی کتے پیارے تمہیں چگانے آئی ہے۔“

بھائی کی بات سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی اور میرے دل کی بات میری زبان پر آ گئی۔

”میں تو کرانی کو بھائی نہیں کہہ سکتی بھائی جان۔ بہتر یہ ہے کہ مجھے اکیلا چھوڑ دیا جائے۔“

آپ بھی چلے جائیں یہاں سے۔“ آپ کسی کے ٹھہرنے کا کوئی جواز نہ دیا تھا فہذا سب ہی مجھے

عجیب سی نظروں سے سمجھتے ہوئے کشاں کشاں کمرے سے نکل گئے۔

شاید بیکار میری قلمبلی تھی۔

اس کے بعد سارا دن کوئی میرے کمرے میں نہ آیا۔ میں بھی چپ چاپ یعنی رہی اسی عالم میں شام ہوئی اور پھر رات ہو گئی۔ لیٹ لیٹ کر۔۔۔ سو سو کر۔۔۔ اور درود کر جسم نوٹنے لگا۔ یوں لگا جیسے بخار ہو گیا ہو۔ بھوک جو پہلے آڑی ہوئی تھی اب چکنے لگی۔ اٹھ کر ادھر ادھر دیکھا۔ پانی کا بجک نظر آیا۔ جانے کب کا پڑا ہوا تھا۔ گلاس اٹھا کر انچھٹا ہاتھ میں گئی۔ گلاس سنگ میں دھو کر پانی پیا تو بھوک دو چند ہو گئی۔ ادھر ادھر دیکھا کچھ کھانے کو نظر نہ آیا۔ آٹا بھی کیسے میں تو تین دنوں بعد یہاں آئی تھی اور آتے ہی لڑائی شروع ہو گئی تھی۔

تری یادوں کے گھاب

کمرے کی لائٹ اس وقت بند تھی۔ گھڑی دیکھی تو بجے کا وقت تھا۔ اوپر گیلری کی لائٹ جلی رہی تھی۔ جہاں نادیہ، بھائی جان اور نادیہ کی ماں میز کے گرد بیٹھے رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ میرے کمرے میں چونکہ اندھیرا اور وہاں روشنی تھی لہذا سارا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا کھانا غالباً ہوٹل سے لایا گیا تھا۔ بھائی جان سنجیدہ تھے۔ نادیہ کی ماں، سیکڑ بھی چپ تھی۔ جبکہ نادیہ نے انداز سے شوٹی اور خوشی اُٹھ رہی تھی۔ چوڑوں اور زہرات کی کھٹک میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ نادیہ نے شاکنگ پلنگ کلر پرستاروں کے خوب صورت کام والا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ گہرے میک اپ میں یہ تو ”وہ“ نادیہ ہی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں کچھ دیر دیکھتی رہی پھر اپنے پیڑ پر جا کر لیٹ گئی اور ہولے ہولے سسکتی گئی۔ سسکتے روئے پھر میری آنکھ لگ گئی۔ دوبارہ آنکھ کھلی۔ گھڑی دیکھی تو رات کے دو بجے تھے سارا گھر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ سوائے اوپری منزل کے سامنے والے کمرے میں زیر و کا جہاں بلب۔ بھائی جان نے شادی کے بعد بھی قیام اسی کمرے میں رکھا۔ یہی کمرہ پہلے بھی انہی کا تھا۔

بھوک زوروں پر ہو گئی..... پیٹ میں چوہے قوالی کر رہے تھے۔ مرنے کی آواز کرتی کے صدق اٹھی اور کچن کی طرف جانے لگی۔ کچن کے پاس جا کر زکی تو حیرت اور غصے سے تھلا کر وہ گئی۔ کچن کو باہر سے تالا لگا ہوا تھا۔ پاؤں جھٹکتے ہوئے کمرے میں آ گئی۔ فتنے سے بُرا حال ہونے لگا۔ ضرور یہ ان کیسے ماں بیٹی کی کارستانی ہے۔ میرا گھر اور مجھے ہی بھوکوں مارنا چاہتی ہیں۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی تو میں چہل قدمی کرنے دوسرے کمرے میں جا بیٹھے میں جاگتی لیکن خالی پیٹ اور دودھ دن کی بھوک میں کیا خاک چہل قدمی کا حشر لینا تھا۔ اسی وقت صبح کے چھ بجے تھے۔

اچانک ہی بھائی جان کے کمرے کا دروازہ کھلا میری نظر میں اوپر کو اٹھیں مجھے نادیہ نظر آئی۔ ہم ایک دوسرے کو چند لمحے لپکتی رہیں پھر فوراً ہی نادیہ مسکرا کر گیلری سے اتر کر پیچھے آ گئی لیکن میں لاشعلی بن ہی گئی۔ وہ میرے پاس آ گئی اور میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

”ارم بائی اچھی تک مجھ سے ناراض ہیں؟“

میں نے بڑی نفرت سے اس کا ہاتھ جھٹکا لیکن خاموش رہی۔

”چلیں اب فصر تھوک دیں۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا.....؟“ میں تنگ کر بولی۔

”فصر تھوک دوں تو بات ختم ہو جائے گی تم بھائی جان کی بیوی نہیں رہو گی ہوں..... بتاؤ

تری یادوں کے گھاب

مجھے..... یا پھر یہ کہنا چاہتی ہو کہ حالات سے سمجھوتہ کر لوں۔ شکست تسلیم کر لوں۔“ میں پھٹ پڑی۔ میری اونچی آواز سن کر بھائی جان کمرے سے نکل کر پیچھے آ گئے اور میرا ہاتھ پکڑ کر زبردستی میرے کمرے میں لے آئے۔ نادیہ بھی ساتھ آ گئی لیکن نادیہ کو انہوں نے یہ کہہ کر باور پتی خانے کی طرف بھیج دیا کہ فوراً ناشتہ تیار کر کے لاؤ تو وہ عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے چلی گئی۔

”دیکھو ارم میں تمہارا بڑا بھائی ہوں..... اور باپ کی جگہ پر بھی ہوں۔ میں نے انگریزوں کی لی ہے تو تم ہی دو گزر کر دو معاف کر دو مجھے۔“ یہ کہتے ہوئے بھائی جان نے ہاتھ جوڑ دیئے تو پہنچ گئی اور پھر زار و قطار دوڑتے ہوئے بھائی کے شانے پر سر ٹکا دیا۔ بھائی جان میرے بالوں میں اٹھکیاں بھرنے لگے اور پھر مجھے سمجھنے کی کوشش کر اپنے کمرے میں اوپر لے گئے جہاں ہم نے ناشتہ کئے کیا۔

☆.....☆.....☆

ناشتہ کرنے کے بعد بھائی جان آفس چلے گئے۔ نادیہ نے T.V لگایا اور ادھر متوجہ ہو گئی اور اس کی ماں اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں تھوڑی دیر ڈھیت بن کر بیٹھی رہی۔ نادیہ کی طرف دیکھا لیکن وہ جیسے میری موجودگی سے آگاہ ہی نہیں تھی۔ اس وقت میں نے اپنی سخت تھکی محسوس کی اور آہستگی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں پہنچ آ گئی۔ میرا دل بھرا آیا اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ روروں کا رخ کار خود ہی چپ کر گئی۔ کیوں کہ کوئی چپ کروانے والا ہی نہ تھا اور پھر دن پونہ دو گزر گئے تھے۔ صبح میں تیار ہو کر کانا چلی جاتی۔ وہاں ہی پر کچن میں جا کر کھانا کھاتی اور سو جاتی۔ پھر میں رات گئے تک اپنے کمرے میں ہی رہتی کوئی بات کرنے والا نہ تھا۔ رات کے کھانے میں بھائی جان کبھی کبھار آواز دے کر بلالیتے اور کبھی نہیں۔ نادیہ تو وہ نادیہ ہی نہ رہی تھی۔ وہ جو کبھی ہر وقت میری تعریفیں اور خدشیں کرتے نہ تھکتی تھی اب کبھی میری طرف پلٹ کر کبھی نہ دیکھتی۔ ایسا رنگ تو کبھی کر گرتے بھی نہ بدلا ہو گا اتنی جلدی تو سانپ کینٹیلی نہیں بدلتے..... یوں لگتا تھا کہ وہ اور اس کی ماں اس گھر میں یہی ڈراما کرتے کر آئے تھے، جو وہ حاصل کر چکے تھے۔ تاہم ان دونوں نے کبھی مجھے چھیڑنے یا شک کرنے کی کوشش نہ کی تھی۔ بس بھائی جان کے گھر ہوتے ہوئے اکاؤنٹا بات کرنے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھتیں۔ البتہ جب دو گھر نہ ہوتے تب دونوں میری طرف سے بالکل بیچانی ہو جاتیں۔ میں سارا وقت اپنے کمرے میں محسوس رہتی۔ اس صورت حال نے مجھے ذاتی طور پر پریشان کر دیا۔ میں اپنے ہی گھر میں انہی بن کر رہ گئی۔ مگر مجھے سائیں سائیں کرتا دکھائی دینے لگا۔ میری ذاتی کیفیت کا وہی لوگ اندازہ لگا سکتے ہیں جو کبھی ایسی صورت حال سے دوچار

ان حالات نے مجھے حدود چڑھا دیا۔ جو بھی میرے کمرے میں آتا میں چیختی گیتی۔ کئی دفعہ بھائی جان میرے کمرے میں آتے لیکن میں نے اب ان سے بھی بات کرنا چھوڑ دی تھی۔ نادیدہ تو بھائی جان کے ساتھ آ جاتی لیکن جب وہ کام پر گئے ہوتے تو پلٹ کر نہ دیکھتی اور نہ پوچھتی نہ کہی اس نے مجھے کھانے کا پوچھا نہ کسی اور ضرورت کا۔ تاہم وہ خود دن بدن فیشن ایبل ہوتی جاتی گئی۔ اس طرح ایک میڈن گزریا اب تو بھائی جان نے بھی ٹلک آ کر میری خبر لیتا چھوڑ دی تھی۔ صبح میں کالج چلی جاتی اور اس کے بعد اگلی صبح تک اکیلی ہی رہتی۔ لیکن اب تعلیم سے بھی میرا رشتہ آج ٹوٹ گیا تھا۔ میری تو زندگی ہی خزاں رسیدہ پتے کی طرح ہو چکی تھی۔ اب تو کسی بھی کام میں جی نہ لگتا تھا۔ پھر ایک دن ایک ایسی بات ہوئی کہ میری زندگی میں جیسے بھوپال آ گیا۔ جس صبح سویرے کالج جانے کے لیے تیار ہوئی کہ بھائی اور نادیہ (بھالی) میرے کمرے میں آ گئے۔ دونوں کو اچانک اپنے کمرے میں پا کر میں حیران ہوئی۔

تھوڑی سی بوکھلائی پھر سنبھل گئی۔ لیکن میری سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ ان سے کس انداز سے بات کروں۔ ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ نادیہ نے بڑھ کر میری کتابیں میرے ہاتھ سے لے لیں اور بولی۔

”آج چھوڑو کالج واپس آج ہم تم سے باتیں کریں گے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ سامنے صوفے پر بیٹھ گئی اور کتابیں اس نے اپنی گود میں رکھ لیں۔ بھائی نے میرے شانوں پر ہاتھ رکھ کر خفیف دباؤ سے مجھ سے سانسے بٹھالیا۔

”دیکھو ارم.....!“ بھائی میرا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر بولے۔ ”جو ہو چکا ہے اسے بھول جاؤ۔ سمجھو کہ یہ ہی قسمت تھی۔ لیکن اب ہمیں پرانی طرز زندگی کو بحال کرنا ہوگا۔ میں مگر کی دہائی روٹھیں اور تمہاری وہی خوش حرا جیاں دیکھنا چاہتا ہوں۔ ابھی بھیا یہاں تک ہی بولے تھے کہ نادیہ کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتابوں میں سے ایک تصویر گر پڑی۔ تصویر دیکھ کر بھیا بولے بولے رگ گئے۔ نادیہ نے آہستگی سے تصویر اٹھائی۔ میں بھی حیران تھی کہ میری کتابوں میں تو کوئی تصویر نہ تھی یہ کیا ہے؟ بھائی نے ہاتھ بڑھایا تو نادیہ نے عجیب سی شکل بناتے ہوئے تصویر بھیا کے ہاتھ میں دے دی۔

چند لمبے بنور تصویر کو دیکھنے کے بعد بھائی نے میری طرف دیکھا۔ ان کی نظروں کے تیز

مجھے کچھ ناپسندیدہ دکھائی دیئے۔

پھر تمہیں خاموشی سے انہوں نے تصویر میرے ہاتھ میں پکڑادی۔ میں نے دیکھا کہ یہ ایک خوبصورت سائو جوان تھا۔ پینٹ شرٹ میں لمبوں کوئی کالج بوائے لگتا تھا۔

”کون ہے یہ.....؟“ بھائی نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”مجھے نہیں معلوم.....“ میں خود حیران تھی۔

”لیکن تصویر تو تمہاری بگ سے لگی ہے؟“

”مجھے نہیں پتہ کہ یہ..... یہاں کس نے رکھی ہے۔“ میں نے صاف گوئی سے کہا۔

”یہ کیا بات ہوئی.....؟“ بھیا تیز لہجے میں بولے۔

”بھیا قسم لے لیں جو مجھے اس تصویر کے بارے میں کچھ بھی پتہ ہو.....“ یہ کہتے ہوئے

میں نے نادیہ کی طرف دیکھا تو وہ دوسری کتاب کی یوں ورق گردانی کر رہی تھی جیسے شاید کوئی اور چیز بھی مل جائے۔

میرا جواب سن کر بھیا چند لمبے مجھے گھورتے رہے اور پھر چلو نادیہ کہہ کر بغیر جواب لیے کمرے سے باہر نکل گئے۔

ان کے پیچھے پیچھے نادیہ بھی ہالوں کو ایک جھٹکے سے شانوں کے پیچھے پھینک کر چل دی۔ اور میں اپنی جگہ گم سمی۔ کچھ روٹھ گئی۔

ایک بار پھر غور سے تصویر کو دیکھا۔ لیکن ذہن پر زور دینے کے باوجود بھی نہ جان سکی کہ یہ کون ہے یہ تو کوئی اجنبی لڑکا تھا۔ پھر یہ میری بگ میں کس نے رکھی..... کیا نادیہ نے رکھی اور پھر بھائی نے سے بھائی جان کو اس طرح میرے کمرے میں لائی ہو۔ جیسے بھائی کی صلاح کر دانے جاری ہو۔

☆.....☆.....☆

اس واقعہ کے بعد تو بھائی نے جیسے مجھ سے آنکھیں ہی پھیر لیں اب میں پھر مگر بھر میں تھا ہو چکی تھی۔ بیسوں سے بھی ٹک رہنے لگی۔ ایک دو بار بھائی جان سے پیسے مانگے..... پیسے تو وہ دے دیتے۔ لیکن نہ پھیر کر کوئی بات کیے بغیر۔ لہذا اب مجھے پیسے مانگتے ہوئے شرم آنے لگی جبکہ نادیہ سے پیسے مانگنا میں اپنی توہین سمجھتی تھی۔

ایک دن سنا اندھیرے میرے دروازے پر قہرے زور سے دھک ہوئی میں چونک پڑی



”آہ..... مٹی..... میں آ گیا۔“ ارسلان بھائی کو غیر متوقع طور پر سامنے پا کر میں دوزخ ان کے گلے سے لگ گئی۔ لیکن تھوڑی دیر خوش رہنے کے بعد سسکتے اور پھر زور زور سے رونے لگی۔ ارے..... بگلی کیا ہوا تھے.....؟ ارسلان بھائی نے سہارا دے کر مجھے بٹھا دیا اور اپنے رونے سے میری آنکھیں صاف کرنے لگے۔ گڑیا کیوں روتی ہے.....؟ میں آ گیا ہوں ناں..... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے سب پتہ چل چکا ہے۔“

”بھیا.....“ میں پھر سسکی اور دل کا غم پانی بن کر عارض ہونے لگا۔

ارسلان بھائی کی ذمہ داریوں تھیلیوں کے بعد مجھے قرار آیا۔ اس دوران ناصر بھائی اور نادیہ اور اس کی ماں سب ہی میرے کمرے میں آ گئے۔

”ناصر بھائی ارم کی حالت بتا رہی ہے کہ یہ نہ صرف ذہنی طور پر تنیس ہے بلکہ جسمانی طور پر بھی اس کی صحت کوئی طرح گری ہے۔ کیا یہ سب آپ کو نظر نہیں آ رہا؟“

”کیا کیا جن نہیں کر چکا میں اس کو مٹانے کے لیے.....“ ناصر بھائی اپنی جگہ سے انداز میں بولے۔ یوں ناصر اور ارسلان میں بحث شروع ہو گئی اور پھر یہ بحث بڑھتی چلی گئی۔ حیرت انگیز طور پر نادیہ اور اس کی ماں سیکینہ بالکل خاموش رہے۔ میں بھی کوئی خاص نہ بولی لیکن دونوں بھائی زور و شور سے تند و تیز جملوں کا تبادلہ کرتے رہے۔ ارسلان کا موقف تھا کہ شادی کرنا آپ کا حق تھا لیکن ارم کو بسن کی حیثیت سے اعتماد میں لینا ضروری تھا۔ جبکہ ناصر بھائی کا موقف تھا کہ اگر میں اپنا عشق طشت از باہم کرنا تو یہ شادی ہو ہی نہیں سکتی تھی جبکہ نادیہ سے مجھے عشق ہو چکا تھا۔ بہر کیف دو ٹھنوں کے طویل مباحثے کے بعد یہ طے پایا کہ ارم کی حیثیت گھر میں مرکزی ہوگی۔ خرچہ بھی اس کے ہاتھ میں دیا جائے گا۔

اس بحث کے آخر میں نکا ایک ناصر بھائی نے میری کتاب سے لڑکے کی تصویر مگر کرنے والی بات کر دی۔ ماحول یکدم مکدر ہو گیا۔ ارسلان بھائی کے چہرے پر ایک دمگ آ کر گر دیا لیکن میں نے فوراً ہی اپنی بے گناہی میں حلفیہ بیان دے کر کہا کہ یہ یقیناً نادیہ کی شرارت ہے۔ میری اس بات کا کہنا تھا کہ ناصر بھائی تلخ پا ہو گئے کہ تم میری بیوی پر الزام لگا رہی ہو۔ بات ایک بار پھر بگڑ گئی۔

تاہم مزید جھگڑے کے بعد ہم سب میں صلح ہو گئی اور میں ہشنے کے بعد پہلی بار نادیہ سے گلے

لی اس نے بڑی گرم جوشی دکھائی جبکہ سیکینہ خالد کے روپے میں میں نے سرد میری محسوس کی۔ دوپہر کا کھانا میں نے اور نادیہ نے بڑے چاؤ سے مل کر تیار کیا اور سب نے مل کر کھا لیا۔ آج بڑے دنوں کے بعد ہمارے گھر میں مشترکہ قہقہے مچ گئے اور میں خود کو ہلکا چھلکا تصور کرنے لگی۔

☆.....☆.....☆

چند دن خوش و غم گزر گئے۔ ارسلان بھائی نے کالج میں داخلہ لے لیا لیکن صبح کی شفٹ میں نہیں بلکہ شام کی شفٹ میں۔ یوں وہ گیارہ بجے تک سوتے رہتے اور بارہ ایک بجے کالج جاتے۔ میں بھی دوبارہ کالج جانے لگی۔ میں اور ناصر بھائی اکٹھے ہی گھر سے نکلتے۔ دو گازی میں مجھے کالج ڈراپ کر دیتے۔ ہم جب گھر سے نکلتے ارسلان بھائی سوئے ہوئے ای ابو چونک کر بچے رہتے تھے لہذا میرا کمرہ شروع ہی سے نیچے تھا۔ اب بھی میں نے نیچے ہی رہنا پسند کیا کیونکہ خالد بھی نیچے ہی رہتیں۔ اس عورت میں بھی بیٹی کی شادی کے بعد مجھ پر تبدیلی آ گئی تھی۔

میلے کچلے کپڑوں میں ملبوس اور خیالی چادر میں لٹٹی سانولی فنی۔ یہی قدرے چھوٹے قد کی پینتالیس پچاس سالہ سیکینہ..... جو ہر وقت ناک کاٹھن کھاتی رہتی۔ اب بھی کاسوٹ پہنے نظر آتی۔ چہرے پر مسکینی کے بجائے اب ہر وقت طنزیہی مسکراہٹ مجھے دکھائی دیتی۔ روزانہ خوشبودار صابن اور گرم پانی سے غسل کی وجہ سے اس کا روپ بھی قدرے نکلتا آتا تھا۔ ہر وقت چمکتی ٹٹ کے رشتی۔ چادر اوڑھنے کی بجائے دو پند شانے پر ڈالے رکھتی۔ ہفتہ بھر گزرتا تو میں نے وہ باتیں نوٹ کیں۔ پہلی تو یہ کہ جب دونوں بھائی گھر پر نہ ہوتے تو وہ دونوں ماں بیٹی مجھ سے بات ہی نہ کرتیں۔ البتہ بھائیوں کے سامنے اچھی طرح ہنس بول لیتیں۔ دوسری یہ کہ ارسلان بھائی کے ساتھ بھی نادیہ بڑی ہنس بول کرتی اور ارسلان بھائی بھی اس کے ساتھ بڑی خوش مزاجی سے بات کرتے۔ اس بات سے میرا ہاتھ ٹھکا۔ ایک بار میں نے جب تمنا شاد کیا۔ اس دن نادیہ کی ماں کی رات سے ہی طبیعت خراب تھی لہذا وہ صبح نہ اٹھی مجھے بھی کچھ سسکنڈی محسوس ہو رہی تھی جس کی وجہ سے کالج نہ گئی۔ بڑے بھیا ناصر ہو بیٹے چیک چلے گئے تفریبا ساڑھے نو بجے میں اٹھی اور جیسے ہی کمرے سے نکلے تو میری نگاہ اوپر برآمدے میں اٹھی تو نادیہ ناشتے کی ٹرائی لے کر ارسلان بھائی کے کمرے کے دروازے پر کھڑی نظر آئی اس کی پشت میری جانب تھی لہذا وہ دیکھ نہ پائی۔ میں یکدم دروازے کی اوٹ میں کمرے کے اندر رونی جانب سے ہو کر دیکھنے لگی۔ نادیہ اس

تری یادوں کے گھاٹ

وقت ایک ٹکر کے تراور سوٹ میں بیوی تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے تیسری دستک پر دروازہ کھلا اور ارسلان بھائی کا چہرہ دکھائی دیا۔ ناویہ کو دیکھتے ہی ان کے چہرے پر خفگی مسکراہٹ آنی لگی اور انہوں نے پیار سے ناویہ کی ناک ہلکے سے پکڑ کر چھوڑی اور ناویہ بھی دیکھی سے ہنسی۔

میں اس بات پر ہکا بکا رہ گئی۔ میرے خیال میں تو ارسلان بھائی بارہ پہچے سے پہلے نہیں آتے تھے۔

میرے من میں تجسس نے سر اٹھار اور میں قسمت کی ماری لگے پاؤں ہی بیڑیاں چڑھ کر اوپر کے برآمدے میں پہنچ گئی اور دے پاؤں کمرے کی کھڑکی کے پاس جا کر آکھیں لگا دیں۔ تو میری کھوپڑی ہلکے سے اڑ گئی۔ میں نے جو منظر دیکھا تو اس پر یقین کرنے کو ہی نہ چاہا۔ ناویہ ارسلان کے سینے سے لگی تھی اور ارسلان نے اس کی کمر پر ہاتھ رکھے تھے۔ ایک بار تو جی چاہا کہ چیخ کر گھر سر پر اٹھاؤں۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر واپس پلٹی اور بیڑیاں اترنے لگی جیسے ہی میں نے آخری بیڑی پر قدم رکھا تو اچانک مجھے ناویہ کی ماں کیلئے کمرے کی دلیز پر کھڑی نظر آئی اس کی نظریں مجھ پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ لمبے لمبے بھر کو بھاری نظریں چار ہوئیں لیکن اس نے مجھ سے کوئی بات کی اور نہ میں نے بات کرنا مناسب سمجھا۔

☆.....☆.....☆

اپنے کمرے میں آ کر میں بیڈ پر رونمئی لیٹ گئی اور سکتے لگی۔ میں جان چکی تھی کہ ناویہ کی ہر حرکت اس کی ماں کی خواہش کے عین مطابق ہے۔ میں شور مچاؤں بھی تو کوئی فائدہ نہ ہوگا اس لیے کہ اب ناصر بھائی کے بعد ارسلان بھائی بھی ناویہ کی زلف گرہ گیر ہو چکے ہیں اور ناویہ اور اس کی ماں تو پہلے ہی مجھ پر ادھار کھائے بیٹھی ہیں۔ میں اپنے ذاتی بھرے منے گھر میں ایک بار پھر اکیلی ہو چکی تھی۔ بہر حال میں نے تیر کر لیا تھا کہ ناصر بھائی آئیں گے تو ساری بات ان کے گوش گزار کر دوں گی۔

لیکن میری بات کرنے کی نوبت ہی نہ آئی کیونکہ ابھی گھنٹہ بھر ہی گزرا تھا کہ ارسلان بھائی میرے کمرے میں آدھکے ان کے تہہ پر کھاتے نہ تھے۔ میں ڈر گئی۔

”تجہرا فون آیا ہے؟“ انہوں نے تھمیر نہتے میں کہا۔

”کس کا؟“ میں نے اضطرابی طو پر پوچھا۔

”خود ہی سن لو!“ یہ کہہ کر وہ پلٹ گئے۔ میں سمجھی کہ میری کراچی والی کزن محبت ہو

تری یادوں کے گھاٹ

گی۔ وہ ہفتہ میں ایک بار ضرور فون کرتی تھی۔ اور فون ناصر بھائی کے کمرے میں تھا۔ میں اٹھ کر چل پڑی لیکن ارسلان کے موڈ کو کیا ہوا ہے۔ یہی سوچتی میں ناویہ کے کمرے میں پہنچ گئی۔ ریسپورڈر کیڈل سے ہٹ کر پڑا تھا۔ ناویہ ایک طرف کرسی پر سنجیدگی سے بیٹھی تھی۔

”ہیلو۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔

”کیسی ہو میری جان۔“ ”ایک سردانہ آواز نے مجھے چوکا دیا۔ آواز میں بازار کی ہن

چھلکتا تھا۔

”کون کون۔۔۔۔۔؟“ میں اس غیر متوقع صورت حال کے لیے تیار نہ تھی، وہی جس کی تصویریں کتابوں میں دیکھتی ہو۔

یہ سنتے ہی ریسپورڈر میرے ہاتھ سے گر پڑا اور میں ٹھگ ہو کر ارسلان بھائی کی طرف دیکھنے لگی۔

ارسلان نے ریسپورڈر اٹھا کر فون پر لٹا دیا اور مجھے چھوڑتے ہوئے بولا۔

”کون ہے۔۔۔۔۔؟“

”میں مجھے نہیں پتہ۔“

”لیکن اس کی تصویر تمہاری کتاب میں تھی؟“

”جسٹس نہیں مجھ سے جو مجھے ذرا بھی اس کے بارے میں معلوم ہو۔۔۔۔۔ یا میں نے کبھی اسے دیکھا بھی ہو۔“

”دیکھو ارم یہ حرکتیں ٹھیک نہیں ہیں۔ اس معاملے کو سب سے ڈک جانا چاہیے۔“ میری حالت تو یہ تھی کہ کانٹو تو لیون نہیں۔ قدم من من بھرے ہو چکے تھے۔ مارے شرم کے میں زمین میں آؤ بیٹھی تھی۔ پھر کوئی جرم ہوتا بھی تو۔۔۔۔۔ یہاں تو اٹنے پر کوئی ڈال کو ڈالتا رہے تھے۔

پہلے وار کرنے والے اکثر کامیاب رہے ہیں۔ اور ناویہ اور اس کی ماں بے درپے مجھ پر وار کر رہی تھیں۔

میں بڑی مشکل سے اپنے آنسو جی چھوٹے چھوٹے قدموں پلٹی کمرے سے نکلی اور بیڑیاں اترنے لگی۔ آخری بیڑی پر قدم رکھا تو ناویہ کی ماں پہلے کی طرح ایک بار پھر اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی نظر آئی۔ اب کمان کی نظریں کینہ توڑ تھیں۔ میں سمجھی کہ یہ سب کچھ اسی کے کھلائے ہوئے ہیں۔ لیکن میری پوزیشن اب ابھرتی تھی۔ میں کچھ بولنے بلیرا اپنے کمرے میں

”وہ کہہ رہا تھا کہ وہ تم سے کالج سے باہر رہتا ہے؟ اور تم دونوں پرانے دوست ہو اور چونکہ آج کل تمہارا کسی اور لڑکے سے چکر چلتا شروع ہو گیا ہے اس لیے وہ اب تمہیں بدنام کر دے گا۔“

”بھائی جان میں قسم اٹھا کر طعنے بیان دے سکتی ہوں کہ میں نے کبھی اسے دیکھا ہے نہ میں جانتی ہوں کہ یہ کون ہے۔ میں بالکل بے گناہ ہوں۔ یہ سراسر مجھ پر الزام بلکہ بہتان باندھا گیا ہے۔“

”کس نے باندھا ہے یہ بہتان کس سے دشمنی ہے تمہاری؟“

”نادیہ اور اس کی ای نے۔“ میں نے پہلی بار جرأت کر کے کہا۔

”کیوں اپنا الزام کسی کے سر تھو جتی ہو۔“ ناصر بھائی نے نبوی کی دکالت کر دی۔ ”صرف

اس لیے کہ اس نوکرانی کا بھائی بننا تمہیں پہلے دن سے ہی پسند نہ تھا۔“

”نادیہ بھابی ایسی حرکت نہیں کر سکتیں۔“ ارسلان کے منہ سے سن کر میں پھٹ پڑی۔

”ہاں ہاں آپ تو ناصر بھائی کی دکالت کریں گے ہی ناں۔ دو آج کل آپ پر جو ڈور سے

ڈال رہی ہے۔ میں نے وہی آنکھوں سے تم دونوں کو۔“

تڑوٹ۔۔۔ ناصر کا تھپڑ میرا نہ لال کر گیا۔ اب بھابی کے ساتھ بھائی پر بھی الزام لگا رہی

ہو۔ جس نے کینیڈا سے آتے ہی صرف تمہاری طرف داری میں میرے ساتھ تھٹھوٹ جھڑا کیا تھا۔

”آج سے تم کاٹ نہیں جاؤ گی۔“ ارسلان نے فیصلہ نہ دیا۔

اور دونوں دروازہ کھٹاک سے بند کر کے چلے گئے۔

☆ ☆ ☆

میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کوئی مجھے چپ کرانے نہیں آیا۔ کسی نے آ کر

بالوں میں شفقت سے آنکھیاں نہیں پھیریں۔ کسی نے دلا نہ دیا۔ میرا یہاں رہا بھی کون تھا۔

بھائی ہی تو تھے جنہیں میرے چال چلن پر شک ہو چلا تھا اور یہ سب یقیناً نادیہ اور اس کی ماں کا

کیا دھرا تھا۔

انہی صبح مجھے ناشتے کے وقت نہ بلایا گیا نہ میں نے دروازہ کھولا۔

تقریباً گیارہ بجے میں آہستگی سے اٹھی دروازہ کھولا جاتا تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ باہر سے

بند ہے۔ میں نے دو تین بار کھینچا لیکن وہ تو باہر سے بند تھا۔ میں نے کوئی احتجاج کرنے کے بجائے

پہ کر جانا بہتر سمجھا حالانکہ مجھے بھوک بھی لگی تھی۔ تقریباً بارہ بجے دروازے کے باہر کھٹ پٹ

جا کر لٹ گئی اور سر کو پکڑ لیا جو شدید فینشن سے پھٹنے لگا تھا۔

میری توقع کے برخلاف ناصر بھائی کو فون کے حقیقی ارسلان نے کچھ نہ بتایا۔ رات کے

کھانے پر بھی خاموش رہی صرف ناصر بھائی نے ہی مجھ سے ایک آدھ بات کی یا پھر نادیہ نے جو

صرف ناصر بھائی کے ہوتے ہوئے بات کرتی تھی۔ ارسلان نے کوئی بات نہ کی۔

لیکن اگلی صبح جب میں کالج جانے سے پہلے ناصر بھائی کے ساتھ ناشتہ کر رہی تھی۔ فون کی

ٹھنکی پھر بجی۔ ٹھنکی بچنے کے ساتھ ہی میرا دل بھی تھر تھرانے لگا۔ ناصر بھائی نے اطمینان سے

ریسیور اٹھا کر بیٹو کہا۔ لیکن پھر خاموش ہو گئے تاہم ان کا چہرہ خیر ہونے لگا۔

”کون ہو تم۔۔۔؟“ وہ غرائے۔

پھر دوسری جانب کا جواب سن کر آپے سے باہر ہو گئے اور گالیاں بکھنے لگے۔ میں

نے زندگی میں ناصر بھائی کو پہلی مرتبہ گالیاں بکھنے دیکھا تھا۔ ناشتہ داشتہ ہیں رو گیا۔ میں پھرانی

ہوئی نظروں سے ناصر بھائی کا منہ دیکھ رہی تھی۔

”کیا ہوا ناصر۔۔۔؟“ نادیہ نے بھولین لیکن ٹھنکی آواز میں پوچھا تو ناصر بھائی

پھٹ پڑے۔

”کیا ایسے فون پہلے بھی آتے ہیں؟“

ہاں کل آیا تھا۔ دروازے کی جانب سے ارسلان کی آواز آئی تو نادیہ کے ساتھ میں نے

بھی پلٹ کر دیکھا۔ ارسلان سلپنگ سوٹ میں کھڑا تھا۔

لیکن ناصر بھائی کو شدید فتنے میں دیکھ کر ارسلان نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

”تم دونوں نیچے چلی جاؤ۔“ میں جلدی لیکن آہستگی سے اٹھ کر نیچے اپنے کمرے میں آ

گئی۔ نادیہ ہو سکتا ہے بعد میں آئی ہو۔ لیکن پھر درہنگ گھر میں سکوت مرگ چھا رہا۔ میں اپنے بیٹے

پر سر ہنسوڑانے لگی تھی۔ میرا تھکا سارا دل دھڑ دھڑا کر رہا تھا کہ قدموں کی چاپ اٹھری سر اٹھایا تو

دونوں بھائی کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ ان کو ایک ساتھ دیکھ کر۔ میں خوف زدہ بہرانی کی طرح

انہیں دیکھنے لگی۔ اندر تھمتے ہی ناصر بھائی نے دروازہ اندر سے بند کر کے لائٹ آن کر دی۔

ارسلان بھائی نے مجھے اٹھ کر سامنے تیزی پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ میں نے چپ چاپ قہقہہ کر دی۔

دونوں میرے سامنے والی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

اس کا پھر فون آیا تھا۔ ارسلان نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔



تری یادوں کے گلاب

ہوئی اور دروازہ کھل گیا۔ میں کسی کے اندر آنے کا انتظار کرتی رہی مگر نہ دروازے کے پت کھلے نہ کوئی اندر آیا تو میں خود ہی اٹھی۔ کواڑ کھولے تو باہر کوئی نہ تھا۔ خود ہی ڈھیلوں کی طرح اٹھ کر منہ ہاتھ دھو یا اور پگھلا میں جا کر ناشتہ بنا کر کرنے لگی۔

باہر گھر میں کام کرنے والی عورت جیٹس پونچھا گا رہی تھی۔ اس نے میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ ناشتہ کر کے بچن سے ٹکلی تو میری نظر میں اوپر گیلری میں تھیں تو ادب سے اس ریلوں کے کمرے سے ناشتے کی ٹرائی باہر لا رہی تھی۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ آج اسے میں نے پہلی بار سادھی میں دیکھا تھا انتہائی کھلی کھلی اور فریٹنگ رنگ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ہلکا سا مسکرائی اور ہجڑا ایک اداسے ہالوں کو بھٹکا اور لا تعلق ہو گئی۔

اس کے بعد تو اس کا معلوم فون نے زندگی اجیرن کر دی۔ CLT کا زمانہ نہ تھا۔ صبح شام اس غیبت لڑ کے کا فون آ جاتا وہ میرا نام لے لے کر آ جی بھرتا جس سے دونوں بھائیوں کا پارہ پٹلی رہنے لگا۔ میری کسی بات کا یقین کرنے پر وہ تیار نہ تھے۔ کئی بار انہوں نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا۔ ایک دن تو حد ہی ہو گئی۔ اتوار کا دن تھا۔ دونوں بھائی گھر میں تھے کہ کھلے کی ایک عورت تریا جو چند گھر چھوڑ کر رائے کے مکان میں رہتی تھی۔ وہ اونچا اونچا پوتی اول فول کئی ہمارا ریٹ کھٹکتا نہ لگی۔ جیٹس نے دروازہ کھولا تو وہ لان میں کھڑی ہو کر زور زور سے بولنے لگی۔

”اری اس ڈائن کو جاؤ شے کے لیے میرا ہی گھر لگتا تھا۔ چرائی سنبھالی نہیں جاتی تو اس کی شادی کر دو۔ میرے معصوم بچے کی زندگی کیوں خراب کرنے پر تھی ہے۔“ دونوں بھائی تیزی سے نیچے آ گئے۔

استہار پر اس نے میری دو تصویریں نکال کر بھائیوں کے سامنے کر دیں۔ اور ساتھ ہی دو خط بھی۔ خطوط کو دیکھ کر میں بکا بکا رو گئی۔ یہ تینا بیانی خطوط تھے جو آج سے چھ ماہ قبل نادبہ کے کہنے پر اس کی ایک ان پڑھ کھلی کر میں نے لکھ کر دیئے تھے۔ اس دن نادبہ کے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا چھری نکلنے سے زخمی تھا۔ وہ تو وہ اپنی کھلی کو خود ہی خط لکھ کر دیتی تھی۔ اس عورت کا اثر ام تھا کہ یہ خط میں نے اس کے بچے کو لکھے ہیں میری تصویریں نہ جانے اس کے پاس کیسے پہنچی تھیں۔ تو میری اہم میں لگی تھیں۔ بہر حال میں پھنس چکی تھی۔ تصویریں میری تھیں۔ خط میری چند رائٹنگ میں تھے۔ الزام ثابت ہو چکا تھا۔ مجھے کے چند لوگ بھی شور مارتے تھے کہسے ہو گئے۔ بھائیوں نے تریا خانہ کے آگے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی۔ اہل محلہ نے لعن لعن کی تو ان کی منت ساجت بھی کر لی لیکن سب

تری یادوں کے گلاب

کے جانے کے بعد سختی میری آ گئی۔ دونوں بھائیوں نے بار بار کر میرا منہ بچا دیا۔ کالج کے بعد اب گھر سے لکھنا بھی بند ہو چکا تھا۔ میں نے تو کچھ بھی نہ کیا تھا۔ اس دن میں نے دو پیر کا کھانا نہ کھا یا۔ اپنے کمرے میں پڑی سکتی اور چھٹیں سہلاتی رہی۔ شام کو بھی کسی نے نہ پوچھا۔ صبح اٹھی تو اپنے کمرے کا دروازہ باہر سے بند پایا۔ بھوک اور نیاس سے بھگان ہو رہی تھی۔ گیارہ بجے تک دروازہ نہ کھلا۔ میں زور زور سے کھٹکتا نہ لگی تو باہر سے دروازہ کھول دیا گیا۔ دروازہ کھولنے والی چوہی تھی۔ انتہائی فریٹنگ۔ کھلی کھلی۔ تیز میک اپ۔ سفید چوڑی دار پار جاسہ۔ کڑھائی والا اثر۔ کہنے، شادی کے بعد میں نے کبھی اس کو بغیر میک اپ کے نہ دیکھا تھا۔ دن میں کم از کم دو مرتبہ لباس تبدیل کرتی بلکہ وہ تو ناصر بھائی کے جائے سے پہلے ہی تیار ہو جاتی اس کی اسی بات سے ناصر بھائی اس کے جادو میں گرفتار تھے۔

دروازہ کھولتے ہی وہ اندر گھس آئی۔ میری حالت انتہائی ناگفتہ بہ تھی۔ میں نے یوں محسوس کیا وہ انگلیں اور میں ٹوکرائی ہوں۔

”ازم۔۔۔۔۔“ اس نے میرے شانوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

”آؤ اوپر میرے کمرے میں تمہارے لیے ناشتہ تیار کر رکھا ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔“ اس کی آواز میں نرمی تھی۔ میں نہ چاہنے کے باوجود بھی اس کے ساتھ چل پڑی وہ میرے آگے آگے سیر عیاں لے کر رہی تھی۔ اس کی چال میں حکمت آ چکی تھی۔ قدرے صحت مند بھی ہو چکی تھی۔ خوشبوؤں کی پٹیں اس کے وجود سے پھوٹ رہی تھیں۔ اوپر گیلری میں جیٹس خال کام کر رہی تھی۔

نادبہ کے کمرے میں پہنچی تو اس کی ماں بڑے غصے سے صوفے پر بیٹھی ہاتھوں کے ٹانگوں پر پائش لگا رہی تھی۔ نادبہ نے مجھے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں خاموشی سے بیٹھ گئی۔ نیل پر ناشتہ سہا تھا۔

”کھاؤ۔۔۔۔۔“ اس نے مجھے اشارہ کیا تو میری بھوک دو چند ہو گئی۔ میں چپ چاپ ناشتہ کرنے لگی۔

اتنے میں اس نے آواز دی۔ جیٹس خال چائے بنا کر لاؤ۔  
”ابھی لائی جی۔“ جیٹس خال کی آواز ابھری۔  
چائے کا دور شروع ہوا تو اس کی ماں بھی قریب آ کر بیٹھ گئی۔

”دیکھو..... ارم“ نادیہ نے گفتگو شروع کر دی۔

”مجھے پتہ ہے کہ تم ہر معاملے میں بے قصور ہو۔“ اس کی بات سے مجھے بڑی

حیرت ہوئی۔

”نہ تم نے کتنا بھروسہ کسی کی تصویر رکھی نہ تم نے کسی کو اپنی تصویریں دیں۔“

”پھر یہ سب کچھ؟“ میں مسک پڑی۔

”یہ سب میرے دچائے ہوئے ڈرامے ہیں۔“ وہ پوری سنجیدگی سے بات کر رہی تھی۔

”مگر کیوں..... میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ تمہیں کون سا دکھ دیا؟“

”تم نے مجھے کوئی دکھ نہیں دیا۔ بلکہ آج میں اگر اس گھر میں مضبوط حیثیت رکھتی ہوں تو وہ

صرف تمہاری مرہون منت ہے۔“

”تو کیا احسانوں کا بدلہ ایسے چکا چاتا ہے۔“

”اس میں سراسر قصور تمہارا ہے۔“

”وہ کیسے.....؟“

”وہ اس طرح کہ تم میرے وجود کو بھائی کے روپ میں برداشت نہیں کر رہی تھی۔ اب اگر

تمہاری ضد کی وجہ سے ناصر یا ارسلان میرے خلاف ہو جاتے تو میں کہاں جاتی؟ لہذا اپنے قدم

جمائے کرنے کی خاطر مجھے تمہیں نشانہ بنانا پڑا۔“

”تو کیا یہ جو خون آتے ہیں.....؟“

”جی ہاں گل میں ہی کروائی ہوں۔“ وہ ڈھٹائی سے مسکرائی۔

”اور وہ جو شیا آپاگل اپنے بیٹے کے نام خط لے کر آئی تھیں۔“

”اس بات کی اس کو اچھی پہچانتی ہے میں نے۔ میری اماں اس کو پیسے دے کر خرید کر

لائی ہیں۔ اور وہ خط جو تم سے میں نے چھ ماہ قبل گھسوائے تھے وہ میں نے جان بوجھ کر گھسوا کر محفوظ

کر لیے تھے۔ کیوں کہ ان دنوں میں تمہارے بھائی ناصر سے عشق شروع کر چکی تھی۔ سو چا

ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اور وہ پڑ گئی۔“ نادیہ ہنس کر بولی۔ اس کے کہنے سے مجھے چاکلکھٹا آ گیا۔

میں بھر کر آٹھ کھڑی ہوئی۔

”ٹھیک ہے نادیہ..... اگر یہ بات ہے تو میں آج ہی بھائیوں سے مکمل کر بات کرتی

ہوں..... اور تمہاری یہ ساری باتیں انہیں بتا دوں گی۔“

”بے وقوف لڑکی.....“ نادیہ بے نگری سے ہنسی۔

”اگر تم نے ایسی کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی بھی تو تمہارے بھائی تمہاری کسی بات کا

یقین نہیں کریں گے۔ تمہاری مظلومیت سے زیادہ میری لڑاؤں میں جاوے۔ اور یہ تم جان بھی

چکی ہو۔“

”میں ناصر بھائی کو آج ہی تمہارے ارسلان سے عشق کا سارا قصہ بتاتی ہوں۔“

”کچھ نہیں ہوگا.....“ نادیہ ہنس کر بولی۔

”یہ کام تم پہلے بھی کرنے کی کوشش کر چکی ہو اور پھر میں خود بھی ناصر سے کہ چکی ہوں کہ

ارم اپنی کوتاہیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے مجھ پر کوئی بھی الزام لگا سکتی ہے لہذا میرے پہلے بتانے

سے اب تمہاری بات کا کوئی یقین نہیں کرے گا۔“ نادیہ کی بات سن کر میں بے بسی سے ہونٹ

کانٹنے لگی۔

میں تو چاروں جانب سے خطرات میں گھر چکی تھی۔ لے دے کے بھائی ہی تھے۔ جن کی

نظروں سے مجھے گرا اچا چکا تھا۔ محلے میں بھی کل کے واقعہ کے بعد میرے کردار کے بارے میں

چہ میگوئیاں ہو رہی ہوں گی۔

”اب کیا چاہتی ہو.....؟“ میری بے بسی کا جملہ سن کر نادیہ ہلکھلا کر ہنس پڑی۔

”صرف یہ کہ مجھے نہ صرف بھائی تسلیم کر لو۔ بلکہ میری برتری کو بھی تمہیں تسلیم کرنا ہوگا۔“

”برتری سے کیا مراد ہے تمہاری.....؟“ میں حیران تھی۔

”برتری سے مراد یہ ہے کہ مالی معاملات میرے ہاتھ میں ہوں گے۔ اور تم بھی

بھائیوں کو یہ کہو گی کہ بھائی کو ہی پیسے دیا کریں۔“

”اور تم آئندہ مجھے تم نہیں بلکہ بھائی کہ کر خطاب کرو گی اور مونا مونا کام تو باقیں خالہ کر

جایا کرے گی لیکن..... جتنا کام گھر کا تم کیا کرو گی۔ اس وقت جب ناصر اور ارسلان گھر میں نہیں

ہوں گے۔ ان کے سامنے تم بے شک کچھ نہ کیا کرو کھانا بھی ہم سب ایک ہی جگہ بیٹھ کر کھایا کریں

گے..... بظاہر مل کر زندگی گزار رہے ہوں گے۔ بھائی خدشہ میں بڑا بیار ہوگا۔ لیکن درون خانہ

صورت حال ویسی ہی ہو گی جیسے میں نے کہہ دی ہے۔“

نادیہ کے منہ سے مسلح کی شرطیں سن کر میں گنگ ہو گئی..... مجھے زمین گھومتی ہوئی محسوس

ہونے لگی۔ میرا سر چکرانے لگا۔

تری یادوں کے گلاب

عالم پریشانی میں نہیں نے کمری کی پشت سے سر نکالایا۔ تھوڑی دیر بعد میری حالت قدرہ سنبھل تو میں نے آنکھیں کھولیں۔ نادیہ کو سکرانے پایا۔ وہ سیب کاٹ کر کھا رہی تھی۔ اس کی ماں اسی طرح صوفے پر بیٹھی تھی۔ اس نے دھل انداز کی تھی۔

میں نے پھر آنکھیں موند لیں۔ نادیہ کی باتیں میرے ذہن میں تھوڑے کی مانند برس رہی تھیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ مجھے اپنا غلام بنانا چاہتی ہے۔ مجھے بلیک میل کر رہی ہے۔ میرا گھر اور مجھ پر رعب میری بیوی اور مجھے ہی مياؤں۔ آج اگر میں نے اس کی یہ باتیں مان لیں تو کل کو یہ مزید جارحیت کرے گی۔ میری زندگی اجیرن کر دے گی۔ نہیں نہیں میں آج ہی دونوں بھائیوں سے کل کر بات کروں گی۔ اس کا بھانڈا پھوڑ دوں گی۔ یہ میرا گھر ہے۔ میرے والدین کا گھر ہے۔ یہ تو میری نوکرانی تھی۔ آج ایسٹ انڈیا کمپنی والا کھیل بھیل رہا ہے۔

مجھے اس کی بات نہیں مانی چاہیے۔ لیکن کوئی ڈرامہ کرنا ہوگا۔ ابھی اس سے صلح جو لے میں بات کرتی ہوں۔ پہلے ناصر اور سلطان بھائی کو اعتماد میں لے لوں۔

”کہاں تم ہو گی ہوا دم۔۔۔۔۔۔“ نادیہ کی آواز سے میں چونکی۔

”آں۔۔۔۔۔۔“ میں گڑباز گئی۔ نادیہ کی آنکھیں اپنے چہرے پر گڑی دیکھ کر کبھی کہ شاید اس نے میرے دل کا چور پکڑ لیا ہے۔

”بتاؤ نہیں تم نے؟“ نادیہ نے نرم لہجے میں پھر پوچھا۔

”سم میں کل بتاؤں گی۔ مجھ سے کوئی بات نہ بن پڑی۔“ نادیہ میرے حواس پر چھا چکی تھی۔ میں اب اس کے سامنے خوفزدہ ہو جاتی مگر بڑا جاتی۔

”کل نہیں۔۔۔۔۔۔ آج ہی۔۔۔۔۔۔“ اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ اور ناصر اور سلطان کے آنے سے پہلے پہلے۔ دو پانچ بجے کے بعد شام کو آتے ہیں۔

”اب تم جا سکتی ہو۔۔۔۔۔۔“ اس کے حکمانہ لہجے نے میرے تن بدن میں انگارے بھر دیے۔ جی میں آیا کہ اس کا صنوبر لوں لیکن وقت کی نزاکت جان کر خون کے گھونٹ پی کر رو گئی۔ اور بغیر کوئی بات کہے کمرے سے نکل گئی۔

”اس لومڑی کی دم کا پور کر لی تو زندگی بھر میٹھ کر دے گی۔“ یہ نادیہ کی ماں کے الفاظ تھے جس نے میرے کمرے سے نکلنے کے بعد ادا کیے تھے میں نے کھڑکی کے پاس رک کر

تری یادوں کے گلاب

من لیے۔۔۔۔۔۔ اس کا یہ جملہ گرم سپر بن کر میرے کانوں میں گھسا۔ فحش کی ایک لہر میرے دل و دماغ سے پھولی جس نے پورے وجود کو اپنے پیچھے میں لے لیا۔ میں پھری ہوئی شیرینی کی طرح چلی اور کمرے میں جا گئی۔

”کیا بکواس کی ٹوٹنے دو تھکی کی نوکرانی۔۔۔۔۔۔“ میں تیر کی طرح نادیہ کی ماں کی طرف لگی اور اس کی چٹپٹا پکڑ کر اسے صوفے سے فرش پر گرالیا اور اس کے سینکھنے سے پہلے ہی نڈی طرح اس پر چلی پڑی اور اسے لاتوں اور گھونٹوں پر دھک لیا۔ پھر مجھے پیچھے سے نادیہ نے بالوں سے بکڑ لیا۔ میں پیچھے دیکھنے کی کوشش میں نادیہ کے بعد لڑکھائی اور پھر نہ سنبھل پائی بلکہ کسی چیز میں پاؤں ایسا الجھا کے سر کے بل پیچھے گر پڑی تو دونوں ماں بیٹی میرے اوپر بیٹھ کر مجھے مارنے لگیں۔ میں اکیلی اور وہ دو خرام کھا کھا کر پلٹی ہوئیں۔ میں کب تک ان کا مقابلہ کرتی۔ انہوں نے دروازہ بند کر دیا اور میرے منہ میں زبردستی دوپٹہ غنوں دیا میری آواز بند ہو گئی تھی۔ تو نادیہ کی ماں پیچھے سے دونوں ہاتھ میرے پیٹ پر باندھ کر مجھے اپنی گود میں لے کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ اور نادیہ نے پانچ سات تھپتھپ میرے گالوں پر اتارتے زور سے مارے کہ میری آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔

”حرام زادی کو اور مار۔۔۔۔۔۔“ اس کی ماں کہہ رہی تھی۔

”نہیں اماں۔ اب چھوڑ دے اس کو۔ یہ پرکھی چڑیا کہاں جائے گی۔؟“ نادیہ کے کہنے پر سیکڑنے لگی مجھے صوفے پر پٹخ دیا۔ میں نے پہلے اپنے منہ سے دوپٹہ کھینچ کر نکالا اور پھر رونے لگی۔ چند منٹ رونے کے بعد میں چپ ہوئی تو دیکھا تو نادیہ کمرے میں اکیلی تھی۔ اس کی ماں جا چکی تھی۔ میں سمجھ گئی یہ یقیناً باہر دروازے پر بیٹھی ہوگی۔ کیونکہ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ یعنی اب میں پرغال تھی۔ نادیہ گہری خاموشی سے میرے چہرے پر نگاہیں گاڑے تھی۔ اس نے ہٹکارہ بھر کر مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ نگاہیں ملنے ہی وہ مسکرائی۔

”ارم آؤ صبح کر لیں۔۔۔۔۔۔ صرف اس شرط پر کہ تم مجھے بھائی مان لو۔۔۔۔۔۔ اور کوئی شرط نہیں۔۔۔۔۔۔“ اس کی نئی کروت دیکھ کر میں دل ہی دل میں چونکی لیکن کوئی تاثرات چہرے پر نہ

آبھر نہ دیے۔

میں دل ہی دل میں سوچنے لگی کہ چلو کیا حرج ہے۔ کچھ تو فیشن کم ہوگی۔ مگر میں تباؤ کا تناسب کچھ تو کرے گا۔ شاید اسی طرح ہی میں بھائیوں کا اعتماد دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب

ہو جاؤں۔



”اب ہمیں یہ گھر کچ کر گئیں اور شفٹ ہوتا پڑے گا۔“ ارسلان غصے میں تھا۔  
”کیوں؟ کیا ہوا؟“ یہ ناصربھائی تھے۔

ابھی جب میں کالج سے واپس آیا تو گلی کے چند لوگوں نے مجھے روک لیا اور اس کے کھسے ہوئے ٹوپیٹر دکھا کر مجھے کہنے لگے۔ کہ یہ شریلوں کا قلعہ ہے۔ ایسے لچکن کرنے ہیں تو اس محلے کو چھوڑ دو۔ گئیں اور چاہو۔“ ارسلان نے نفرت سے مجھے دیکھا۔

میں نے متوجہ نظر نہ کر کے ناصربھائی کی طرف دیکھا۔  
وہ بھی مجھے ہی دیکھ رہے تھے۔ لیکن اب ان کا پہلے والا سوڈ نہ تھا۔ ان کی نگاہوں میں مسکنا پن پیدا ہو چکا تھا۔

میرے وجود میں لڑش شروع ہو گئی۔ اس سے قبل کہ میں کچھ بولتی نادیا کی ماں سیکھ نہ کرے میں داخل ہوئی اس کے بازو پر سفید پٹی بندھی تھی جو سرخ ہو رہی تھی۔

”کیا ہوا خالہ؟“ ناصربھائی اپنی سانس کی طرف بڑھے۔  
”کچھ نہیں ہوا۔“ نادیا بھی آگئی۔ وہ اپنے کمرے سے لش پش ہو کر نکلی تھی۔ اسی یکن میں ہزری کاٹ دی تھیں کہ چھری لگ گئی۔

”ہزری کاٹ رہی تھیں تو چھری بازو پر کیسے لگ گئی؟“ ارسلان اپنی بات بھول کر بولا۔  
ارسلان کی بات سن کر سیکھ خالہ نے میری طرف گہری نظروں سے دیکھا لیکن نادیا پھر بول پڑی۔ ”میں کسی طرح لگ گئی۔ اس میں کیا ہے اور تو کچھ نہیں۔“ اس نے لہجہ کچھ اس طرح اختیار کیا۔ جیسے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔

اسنے میں سیکھ خالہ سسکیاں بھر کر رونے لگیں اور بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگیں۔ ”چلو تم کہتی ہو تو کچھ بھی نہیں ہوا ہوگا۔“

”جج جج تاؤ نادیا کیا ہوا؟“ ناصربھائی نے نادیا کو شانوں سے پکڑ کر اتنی زور سے ہلایا کہ اس کی ہجری کلائیوں کی چوڑیاں جگ جھنچھنا اٹھیں۔

”تم تاؤ خالہ اصل قصہ کیا ہے؟“ ارسلان پوچھنے لگا۔  
خالہ نے پہلے مجھے غور سے دیکھا اور پھر کہنے لگی۔ ”میں دو پہر کو ہزری کاٹ رہی تھی کہ ارام

بچن میں آگئی اور چھری میرے ہاتھ سے چھین کر کہنے لگی۔ کہ مای مصیبت اس گھر میں سارا فساد تیری وجہ سے ہے۔ آج میں تیرا قصہ ہی تمام کر دوں گی۔ یہ کہہ کر اس نے چھری میری طرف لہرائی

”کیا سوچ رہی ہو ارام۔۔۔ کیا ہم ایک گھر میں اچھے دوستوں کی طرح نہیں رہ سکتے؟“  
نادیا نے کچے کچے میں صدمہ درجہ حلاوت تھی۔ میں کچھ گئی کہ وہ بھی کسی نہ کسی طور اس معاملے کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ اور میری خبریت بھی فی الحال اسی بات میں ہے کہ یہ معاملہ نرم پڑ جائے۔ تاکہ بھائیوں کے رویے میں نرمی آجائے اور پھر میں ان کے سامنے سارا معاملہ کھول کر دکھا سکوں۔ اس خیال کے انجمنے ہی میں نہ سون ہوئی چٹی گئی۔ میرے چہرے پر اطمینان کی لہریں پھیلنے لگیں کہ نادیا بھی شاید سمجھ گئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور میرے پاس آ بیٹھی اور پیار سے میرے گلے میں بائیں حائل کر دیں میں بھی نادیا کے گلے لگ گئی۔

نادیا تھوڑی دیر بعد سے ہاتھیں کرتی رہی پھر کہنے لگی۔  
”اٹھو کیا حالت بنا رہی ہے تم نے اپنی چلو تہا دھو کر لباس تبدیل کر لو۔“

☆ ☆ ☆  
پانچ بجے کے قریب ارسلان آیا۔۔۔ میں اس وقت سو کر اٹھی تھی اور بائیسے میں بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ غصے میں تھا۔ میرا خیال تھا مجھ سے بات کرے گا لیکن وہ تیز تیز قدم ملے کر اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ نادیا اور اس کی ماں اس وقت اوپر ناصربھائی کے کمرے میں تھیں۔

میں چائے پی کر ارسلان کے کمرے میں گئی تو دروازہ اندر سے بند تھا۔ دھک دی ایک دو آوازیں بھی دیں لیکن اس نے دروازہ نہ کھولا۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ ناراض لگا تھا۔ میں نے نادیا کے کمرے کو دیکھا اس کا دروازہ بھی بند تھا۔ شاید سو رہی تھی۔ میں نیچے آگئی۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد باہر گلی میں گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ یقیناً ناصربھائی آئے تھے۔ میں نے اٹھ کر گیٹ کھولا۔ انہوں نے گاڑی اندر کر کے پورچ میں کھڑی کی اور باہر نکل کر میری طرف بڑھے ان کا سوڈ خوشگوار معلوم ہوتا تھا۔

لیکن اس سے قبل کہ وہ میرے قریب پہنچے ارسلان کی آواز آئی۔  
”ناصربھائی اوپر آئیں اور ارام کو بھی لیتے آئیں۔“  
”خبریت۔۔۔؟“ انہوں نے مڑ کر اوپر دیکھتے ہوئے کہا۔  
”آپ آئیں تو کسی۔“ ارسلان کے انداز میں تکی تھی۔  
”آؤ ارام۔“ ناصربھائی کہہ کر چل پڑے میں ان کے پیچھے لگی۔

تری یادوں کے گلاب

جو میرے بازو میں کھب گئی۔ وہ تو نادیہ میری چچ سن کر آگئی اور اس نے اس کے ہاتھ مروڑ کر بھونکا دیا۔ چھری گری اور اس کو کھینچ کر اوپر لے آئی۔

”کیوں نادیہ؟“ ناصر نے پوچھا تو نادیہ نے بھی آنکلی سے انتہائی انداز میں سر ہلا دیا۔ میں دونوں ماں بیٹی کے سفید جھوٹ سے نہ صرف ہکا بکا ہو گئی بلکہ اس غیر متوقع شدید صدمے سے حواس باختہ ہو گئی۔ ارسلان نے آگے بڑھ کر کھینچ کر چائنا میز سے منہ پر مارا۔ ”تیری وجہ سے نہ مگر میں جھین ہے اور نہ باہر۔ سارے فساد کی جڑ تو ہی ہے۔“ ارسلان نے تاہم تو دو تھپڑوں سے میری تواضع شروع کر دی۔ ناصر بھائی سمیت کسی نے چھراٹے کی کوشش نہ کی۔ مار سے بچنے کے لیے میں ناصر بھائی کی طرف لپکی تو آگے سے انہوں نے اسے زور سے چھین مارا کہ میں بیڑ پر اوندھی جا گری۔

☆.....☆.....☆

دونوں بھائیوں نے اچھی طرح میری دھنائی کرنے کے بعد مجھے اوپر ہی بچکان کے ساتھ سنور میں بند کر دیا۔ میں کافی دیر تک پھوٹ پھوٹ کر رو رہی۔ پھر دروازہ کھٹکتا پایا۔ جالی سے بھائیوں کو آواز میں دیں مگر کسی نے میری نہ سنی۔ تھک ہار کر سنور میں پڑی ایک ٹوٹی ہوئی لوہے کی چار پائی پر پڑ کر سو گئی۔ صبح سنور کا دروازہ کھلا۔ ارسلان نے مجھے باہر نکالا اور ناصر بھائی کے کمرے میں لے گئے۔ جہاں نادیہ اور اس کی ماں بھی موجود تھیں۔ سب بیٹھے ہوئے تھے۔ میں بھرموں کی طرح کھڑی تھی۔

”سنوارم!“ ناصر بھائی خنجریدگی سے بولے۔

”تہنہاری وجہ سے ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے اور خالہ کو چھری سے ڈھکی کر کے تو تم نے حد ہی کر دی ہے۔ اب تمہارا علاج یہی ہے کہ تم اپنے کمرے میں بند ہوگی۔ ایک ماہ کے بعد اگر تم سدھو حری تو دیکھیں گے کہ کیا کرتا ہے۔ اس سے پہلے تمہارا جو قدم مگر سے باہر نکلا وہ تمہارے دھڑ سے الگ کر دیا جائے گا۔“

☆.....☆.....☆

اس کے بعد میری زندگی کے ہر ایک دور کا آغاز ہوا۔ رات سادگی میرے کمرے کے دروازے پر تالا پڑا رہتا۔ صبح آٹھ بجے کھانا۔ ناشتہ دینے کے بعد پھر کمرے کو باہر سے بند کر دیا جاتا۔ پھر شام کو بھائیوں کی واپسی پر کھانا۔ سارا دن کمرے کی

تری یادوں کے گلاب

اکھوٹی کھڑکی سے میں باہر کا نظارہ کرتی رہتی۔ البتہ شام پانچ بجے مجھے ”کھول“ دیا جاتا۔ پھر رات نو بجے تک میں آزاد ہوتی۔ دوسرے ہی دن جب شام کو مجھے آزاد کیا گیا تو میں بھائیوں کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ لیکن انہیں مجھ پر ترس نہ آیا۔ نادیہ اور اس کی ماں نے میرے خلاف کچھ ایسے جال بچھائے تھے۔ کہ میں پڑ پڑا کر رہ گئی تھی۔ بھائیوں کو اہل عقد سے بے عزت کر دیا گیا۔ میرے لکھے ہوئے عشقیہ خطوط دکھائے گئے۔ لڑکے کی تصویر میری کتاب سے نکلی تھی۔ دس لاکھ فون پر میرے متعلق نازیبا افواہ کو استہلال کرتا تھا اور بھائیوں کو ہمیشہ سے بہن سے زیادہ اپنی عزت پیاری لگتی آئی ہے۔ میری تو کسی بات کا وہ یقین کرنے پر تیار نہیں تھے لہذا میرا دونا بیکار کیا!! اگلے دن صبح پھر مجھے ناشتہ کے بعد بند کیا گیا تو میرا دل نئی طرح بیٹھنے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں ازل سے اس کمرے میں بند ہوں۔ لیکن نے مجھے کمرے میں دھکیل کر تالا لگا دیا۔

ان تین دنوں میں غیر محسوس طریقے سے میرے کمرے سے اکثر ٹینٹ کی ہر چیز ہٹائی گئی۔ سونی کا ڈیک پڑا تھا۔ آج وہ بھی نہیں تھا۔ یقیناً میرے ناشتے کے دوران نکالا گیا تھا۔ ٹی وی کل صبح نکالا گیا تھا۔ میرے پاس اب سوائے رونے دھونے کے اور کوئی شغل نہ رہ گیا تھا۔ لیکن اب تو آنکھوں کے سوتے بھی خشک ہو چکے تھے نیند بھی آڑ بچکی تھی۔ بیڑ پر سیدھا حالت کمر میں عمار ناچیت کی کڑیاں گن رہی تھی کہ بھیا کی گاڑی شارٹ ہونے کی آواز آئی وہ یقیناً بنک جا رہے تھے۔ میں اٹھ کر کھڑکی میں آنکھڑی ہوئی گاڑی گیٹ سے نکل رہی تھی۔ نادیہ نے گیٹ بند کیا چلی مجھے دیکھا۔ مسکرائی۔ میری طرف آئی کھڑکی کے پاس رک گئی۔ کہنے لگی۔

”بیوقوف لڑکی اس دن تو نے میری امی کو مارا۔ جس کی وجہ سے یہ صورت حال بنی۔ کیوں اپنی جان کی دشمن بن رہی ہو۔ میری شرطیں مان لو۔ میں وعدہ کرتی ہوں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ ورنہ ابھی نادیہ کے ترکھیاں میں حریہ تیر بھی ہیں اور سب سے بڑھ کر تو میرے حسن و نشین کا کھنجر ہے جس سے نہ نامرکل سکتا ہے اور نہ ارسلان۔ اور پھر ابھی نادیہ نے تیرے تپ کا پتہ پھینکا ہی کب ہے۔“ میں اس کی باتیں سن کر ہونٹ کانٹنے لگی۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں سسکتے لگی۔ میں اب نہ حال ہو چکی تھی۔ بھائی میری بات سننے کے بھی روادار نہ تھے۔

”اچھا میں چلتی ہوں۔ آج ناشتہ آپ کو نہیں مل سکتا۔ ذرا ارسلان کو ناشتہ دینا ہے۔ وہ کالج چلا جائے پھر آؤں گی۔“ یہ کہتے ہوئے وہ میرا جواب سے بغیر خوشی سے اچھلنے کے انداز میں زینے تلے کرتی اوپر چلی گئی۔

تری یادوں کے گلاب

میں اب مایوسی کی اقدہ گہرائیوں میں ڈوبنے لگی تھی۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔ اس کی یہ بات کہ ابھی میں نے تپ کا پتہ نہ کر سکا ہے۔ اس بات کا اشارہ تھا کہ ابھی وہ کوئی بہت بڑا الزام میرے پر تھوپ کر مجھے حریف بنے عزت کرنا چاہتی ہے۔ اگر وہ ایسے ہی پد پدے وار کرتی رہی تو میں منہ میں بدنام ہو جاؤں گی۔ یہ نہ ہو کہ دشمن بھی کوئی نہ کرے۔ کون جھوٹے الزام کو چٹائی کی کہانی پر پرکھتا ہے۔ الزام ہی کو جرم مان لیا جاتا ہے۔ میں گھنٹوں میں مردے کروڑوں لگی۔ تھوڑی بہ بعد خود ہی چپ ہو کر آنکھیں صاف کرنے لگی۔ تسلی دینے والا تو کوئی تھا ہی نہیں میں بھرے پڑے گھر میں تنہا تھی۔

☆.....☆.....☆

اور پھر ارسلان نے بھی "ناشیہ" کر لیا اور کالج چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ ارسلان کے جانے ہی ناویہ میرے پاس آ جائے گی مگر ایسا نہ ہوا۔ کام والی خالہ بھیس کو میں کمزری سے صفائی ستھرائی کرتے دیکھتی رہی پھر دو مہینے میں وہ پیر کا کھانا پانے لگی اور کھانا تیار کر کے اوپر ناویہ کے کمرے میں لے گئی۔ مجھے کسی نے نہ پوچھا۔ ناشیہ بھی نہ کیا تھا۔ میں بھوکے پیاسے تھی۔ کوئی مصروفیت بھی تو تھی۔ کیسا اندھیر تھا۔ کیسا ظلم کا راج تھا کہ میرا گھر اور میرے گھر میں نقب لگانے والیاں جو کبھی گھر کی نوکریاں تھیں کس غارت اور آزادی سے فحش خوشی کھانا کھا رہی تھیں اور ادھر میرے کمرے میں پانی تک موجود نہ تھا اور میں ان کے رحم و کرم پر تھی۔ مجھے کھانا دینا یا نہ دینا۔ کرتے کرتے وہ پیر کے چار بج گئے۔ ناویہ اور اس کی ماں کھانا کھا کر شاہ قیلولہ فرما رہی تھیں کیونکہ گھر میں سنا تھا۔ بھیس کام کر کے جا چکی تھی۔ ادھر میں دل ہی دل میں ناویہ سے مکمل طور پر شکست قبول کر چکی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی میری حریف بدنامی ہو جو میرے مستقبل پر نہ سے اثرات مرتب کرے بہتر یہی تھا کہ فی الحال جیسے تیسے صلح کر لوں اور وقت گزار دوں۔ موقع ملے ہی سارے حساب چکا دوں گی۔ میں انہی سوچوں میں تھی کہ ناویہ کی انجمن بھری چٹکتی آواز ابھری۔

"کن سوچوں میں کم ہوندی تھی؟" میں نے آہستگی سے پلٹ کر دیکھا۔ ناویہ صبح والا سوٹ بدل چکی تھی۔ ہازہ میک اپ، گھولنا کھانا چہرہ زندگی سے بھرپور مسکراہٹ اور مسکراہٹ کے پیچھے چمپا ہوا طنز۔ ایک لمبے کو میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ لیکن پھر میں سنبھل گئی۔ یہ لڑکھانے کا موقع نہ تھا۔

میں تھوڑی دیر اسے دیکھتی رہی پھر بسک پڑی۔ مجھے روتا دیکھ کر ناویہ ٹھٹھکا کر ہنس پڑی

تری یادوں کے گلاب

اور تالا کھول کر اندر آ گئی۔ اس کے اندر آنے سے ہوں محسوس ہوا جیسے خوشبوؤں کا سیلاب آ گیا ہو۔ چوڑیوں کی کھٹک اور نئے سوٹ کی سرسراہٹ الگ تھی۔

"پھر کیا سوچا تم نے ارم.....؟" ناویہ نے فٹے سے بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

"م..... مجھے منظور ہے۔" میرے ہونٹوں نے بیشکل جملہ نکل کیا اور پھر میری آواز بھر گئی۔

☆.....☆.....☆

شام کو بھائیوں کے آنے پر ناویہ نے میری بھرپور سفارش کی اور میرے من میں زور و شور سے وکالت کی۔ محلے والوں کو بھرا بھلا کہا۔ ناصر اور ارسلان کو کہنے لگی کہ ہمیں دوسروں کے کہنے پر کوئی فیصلہ کرنے کے بجائے اپنی بہن کو دیکھنا ہے۔ اور پھر یہ میری تندی نہیں سنبھلی بھی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آج میں اگر اس گھر کی بہن ہوں تو وہ اپنی دوست..... اپنی مالکین ارم کی وجہ سے ہوں۔ اس نے ایسی پختی چڑی باتیں اور جڈ باتی تقریریں کہ بھائیوں کے دل بچ گئے اور مجھے آزادی مل گئی۔ تاہم فی الحال کالج نہ بھیجے کی تلقین کرنا ناویہ نہ بھولی۔ رات کا کھانا میں نے سب کے ساتھ کھایا۔ صبح ناشتے کے وقت بھی ناویہ آ کر مجھے ساتھ لے گئی۔ بھائیوں کے سامنے دونوں ماں بیٹی نے مجھے کوئی کام نہ کرنے دیا۔ ناویہ کی ماں خود ہی کچن میں گھس کر برتن وغیرہ دھوئے لگی۔ ناصر بھائی چٹک چلے گئے تو ناویہ مجھے ارسلان کے کمرے میں لے گئی۔ جہاں ہم دو گھنٹے تک گپ شپ کرتے رہے۔ بھیس خالہ بچے کام کرتی رہیں۔ بارہ بجے کے بعد ارسلان بھائی بھی کالج چلے گئے۔ تو میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں ناویہ نے ایک لحاف میرے سامنے لا کر رکھ دیا۔

میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"کھول کر دیکھو تصویریں ہیں کچھ۔" ناویہ نے بے پروائی سے بالوں کو کان کے پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

میں نے لحاف کھولا تو دو تصویریں تھیں۔ پہلی ہی تصویر دیکھ کر میرا جسم لرزنے لگا۔ اس میں وہی لڑکا تھا جس کی تصویر میری کتاب سے گری تھی۔ میری کمر ہاتھ رکھے میرے پیچھے کھڑا تھا اور میں ہنس رہی تھی۔

دوسری تصویر میں اس لڑکے نے ہاتھ میرے شانوں پر رکھے تھے۔ تصویریں دیکھ کر میں



گنگ ہوئی تو فوراً ہی نادیا نے تصویریں میرے ہاتھ سے چھین لیں اور کہنے لگی۔  
 ”تمہاری تصویریں..... تمہارے الم سے نکال کر ایک ماہر فوٹو گرافر کو دے کر اس  
 فوٹو کے کی تصویریں بڑی محنت سے ہم آجنگ پوز میں بنوائی گئی ہیں۔ اور فوٹو گرافی کی ہدیہ  
 کیپٹن رائے جیٹک سے جوڑی گئی ہیں۔ ہے تو یہ سب جھوٹ..... شاید تمہارے بھائی بھی اسے دیکھ  
 کر سمجھ جائیں کہ یہ کیسے بنائی گئی ہیں مگر جب یہ تصویریں زیادہ تعداد میں ملنے کے لڑکوں سے  
 ہاتھوں میں تیار ہو کر پینچیں تو پھر کیا ہوگا۔ یہ تو تم سمجھ ہی سکتی ہو۔ ان تصاویر کی درجنوں کاپیاں  
 محفوظ ہیں میرے پاس۔“

”اب تم کچھ کتنی ہو کہ نادیا کے ساتھ دوسرا بازی کرنے کی کوشش میں تم کتنی بدنام ہو جاؤ  
 گی۔ ہو سکتا ہے بھائی تمہارا خون ہی کر دیں۔ ایسی صورت میں بھی..... فائدہ سے میں نہیں ہی  
 رہوں گی۔ تمہارے قتل میں تمہارے بھائی پھنس جائیں گے اور میں اس گھر کی اکلوتی وارث  
 بن جاؤں گی۔“

”یاد رکھو جس دن تم نے اپنے بھائیوں سے میری شکایت لگائی..... اس کے آدھ گھنٹے کے  
 اندر اندر تصویریں ملنے میں پھیلا دوں گی۔ اور ہاں ان دو تصویروں کے علاوہ بھی تمہاری ایک خاص  
 اہم تصویر میرے قبضے میں ہے وہ میں تمہیں ابھی نہیں دکھاؤں گی۔ کیونکہ اصل کام تو ہی تصویر  
 نے کرنا ہے۔“

مجھے نادیا کی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ میرا سر گھومنے لگا۔  
 ”لو پانی پیو.....“ آٹھویں کھولیں تو نادیا نے پانی کا گلاس میری طرف بڑھا کر دکھا تھا جو میں  
 نے اس کے ہاتھ سے لے کر ٹھنڈا پلایا۔

”زیادہ پینشن لینے کی ضرورت نہیں ارم.....“ نادیا یہ نہایت پولاٹ لہجے میں کہنے لگی۔  
 ”نہیں سمجھو نہ کچھ ہوا ہے اور نہ کچھ ہوگا۔ سب کچھ صرف تمہارے ہاتھ میں ہے۔ ہاں..... جن  
 شراکتہ پر میں نے تم سے صلح کی ہے ان کا تختی سے خیال رکھنا ہے۔ کوئی کوتاہی نہ ہو۔ اگر ایسا کرتی  
 رہو گی تو پھر ہر گز تم دل و دماغ سے نکال دو بصورت دیگر میں ہر دستیاب حربہ استعمال کروں گی۔  
 اب تم جاؤ اور کچن کی صفائی کر کے دو پہر کا کھانا تیار کرو۔“ پرانی ٹوکرائی اور پیٹننگ مائکس کا پہلا گھم بن کر  
 میرے ہونٹ ہلچے گئے اور میں آنسوؤں کو جتنی ہوتی پیچھے آ کر کام میں لگ گئی۔

ناصر اور ارسلان کے سامنے نادیا مجھ سے انتہائی پیار کرنے والی بھابی ہوتی۔ اس کی ماں  
 میری تعریفیں کرتے نہ جھکتی۔ نادیا جب کبھی شاپنگ کرنے جاتی میرے لیے کچھ نہ کچھ ضرور لاتی۔  
 اپنے کپڑوں کے ساتھ ساتھ میرے لیے نئے فیشن کے کپڑے خریدنا نہ بھولتی۔ آؤنگ میں  
 بھی میں ان کے ساتھ ہوتی۔ رات دیر تک ہم بیٹھی ہر موضوع پر گہیں لگاتیں۔ دونوں ماں بیٹی کی  
 ایکٹنگ اس قدر فطری تھی کہ کبھی بھائیوں، مہمانوں یا کسی کے سامنے مجھے گھور کر بھی نہ دیکھتیں۔ مجھ  
 سے اتنا پیار، ہمدردی جتنا کہ دیکھنے والے اتنی اچھی بھابی ملنے پر میری قسمت پر رشک  
 کرتے..... سب سے بڑی بات یہ کہ اس کے بعد نہ کبھی اس لڑکے کا فون آ یا نہ ٹریڈ آ پائے ٹنگ  
 کیا۔ لیکن بھائیوں کے گھر سے نکلنے ہی یا تنہا ہوتے ہی ان کی آنکھیں ماتھے پر چڑھ جاتیں۔

بلیٹس خالہ صفائی سترائی کر جاتی لیکن کچن کا تینوں وقت کام اور برتن دھونا صفائی کرنا میری  
 ذمہ داری میں شامل تھا۔ اس کے علاوہ نادیا کے کپڑے پر پریس کرنا، اسے تیار ہونے میں مدد کرنا،  
 سب میرے ذمے تھا۔ خاص طور پر دو پہر کے کھانے کے وقت جب اکثر بھائی گھر میں نہ ہوتے  
 کھانے کی سرور بھی ماں بیٹی کے سامنے مجھے ہی کرنی پڑتی۔ میں خود کھانا ان کے بعد کچن میں بیٹھ  
 کر کھاتی۔ کھانا کھا کر اکثر دونوں سو جاتیں لیکن میرے دو پہر کو سونے پر سخت پابندی عائد تھی اور یہ  
 سارا جابل انہوں نے اس خوبصورتی سے بچھایا تھا کہ ناصر اور ارسلان دونوں کو ٹنگ کا شائبہ تک نہ  
 گزرتا۔ مجھے یہ حکم تھا کہ صبح سویرے غسل کر کے کپڑے بدل لیا کروں تاکہ میلے کپڑے دیکھ کر کسی کو  
 ٹنگ نہ ہو جائے۔ ہر ہفتہ دس دن بعد نادیا مجھے دھمکیاں دیتا نہ بھولتی۔ ناصر بھائی ساری تنخواہ لانا کر  
 نادیا کے ہاتھ پر رکھ دیتے۔ بنگ نمبر کی حیثیت سے ان کی تنخواہ اچھی خاصی تھی۔ جن میں سے تین  
 ہزار روپیہ وہ ارسلان کو دے دیتے اس میں سے بھی ہزار بارہ سو نادیا لے لیتی۔ گھر کے اخراجات  
 سے اچھی خاصی خریدی جاتی۔

ایک ماہ بعد میرے لیے نیا عزم جاری ہوا کہ دیر تک سوتی رہا کرو جتنی کہ ناصر دیکھ چلے  
 جائیں اور نادیا ارسلان کو تنہائی میں ناشتہ کروا چکے۔ ارسلان کے کالج جانے کے بعد مجھے اپنے  
 کمرے سے باہر آنے کی اجازت تھی۔ اور اُنھیں ہی پہلے صبح برآمدے کی صفائی کرنی پھر ناشتہ  
 کرتی۔ شروع شروع میں میں بہت گھبراتی۔ بہت زیادہ ٹنگ جاتی تھی اور پھر اتنا کام کرنے کی تو  
 مجھے عادت ہی نہ تھی۔ اور میری یہ عادت نادیا نے ہی بنائی تھی۔ مگر تو کر کے غزوہ کی..... آہستہ  
 آہستہ میں اس غلامی کی عادی ہو گئی۔ اگر کبھی اتفاق سے ناصر یا ارسلان بھائی اچانک، ایسے آ

تیری یادوں کے گلاب  
جاتے اور میں صحن میں کام کر رہی ہوتی..... تو مجھے اونچی آواز میں بات کرنے کا حکم تھا تاکہ نادیا  
اور اس کی ماں کو اطلاع ہو جائے اور وہ اُنھ کو دکھاوے کے طور پر کوئی کام کرنا شروع کر دیتی۔  
ایک دن میرے کمرے میں آئی اور مجھ سے پوچھے بغیر میرے ڈرائنگ ٹیبل سے تمام اچھی اچھی  
چیزیں نکالیں اور مجھے آرڈر لگا لیا کہ جا کر میں اس کی ڈرائنگ ٹیبل پر سیٹ کر کے رکھ دوں۔  
میں ڈراما سچا لگائی تو سمجھنے کر میرے چائٹا اس نے میرے گال پر مارا اور کہنے لگی۔  
"میری بات پر فوراً عمل کیا کرو۔"

مہینہ میں ایک آدھ بار میں ناصر بھائی سے ہزار پانچ سو روپیہ لیتی جو بھائیوں کے جانے  
کے بعد نادیا کے کمرے میں آ کر مجھے اس کے پرس میں خود ڈالنے پڑتے۔ امی کا زیور بھی نادیا  
نے اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ بیا کے ساتھ جاتی تو کپڑوں کے ایک جیسے دو سوٹ لاتی۔ لیکن  
مجھے نیا سوٹ پہنا منع تھا۔ میرے کپڑے نادیا ایک دو روٹھ پہننے کے بعد مجھے دیتی دو پہر اور رات  
کا کھانا پکا..... برتن اور مکن کی صفائی فریضہ گھر کا ہر وہ کام جو کسی بھی وقت کیا جاسکتا تھا میری ذمہ  
داری تھا۔ کئی بار یوں ہوتا کہ میں رات دیر تک کپڑے استری کرتی رہتی۔

اکثر میں راتوں کو تجھے میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر روتی جس سے دل کا غبار کچھ ہلکا ہو  
جاتا۔ سب سے تکلیف دہ کام میرے لیے نادیا کے کمرے کی صفائی ہوتی جب وہ دونوں ماں بیٹی  
خود تو بنی محسن کر ٹکیوں سے لپک لگا کر یا صوفے پر بیٹھی ہوتیں اور میں ان کے قدموں میں فرش کی  
صفائی کر رہی ہوتی۔ یہ موقع تقریباً روزانہ آتا اور روزانہ ہی میں اندر ہی اندر مٹھتی رہتی خاص طور پر  
جب دونوں طرف کے تیر بھی برسا رہی ہوتیں اور میری طرف دیکھ دیکھ نہتیں۔ وہ اس وقت باقاعدہ  
مجھ سے ٹوکر انیوں والا سلوک کرتیں۔

پھر یوں ہوا کہ ایک دن میں واشنگ مشین لگا کر کپڑے دھونے میں مشغول تھی اور بلیس  
خالہ صحن میں کام کر رہی تھی۔ نادیا کی ماں سیکڑ بخاری وجہ سے لپٹی ہوئی تھی جبکہ نادیا کے کمرے سے  
موسیقی کی آواز ابھر رہی تھی یا اس کی روٹھیں تھی کہ روزانہ جب سب چلے جاتے تو یہ پراوندگی لیٹ  
کر ڈیک پر گائے سنتی اور فلمی ویشن میگزین کی روٹی گردانی کرتی رہتی میں آ کر کمرہ کی صفائی و  
سینک کر دیتی۔

بلیس خالہ عام طور پر مجھ سے کم ہی بات کرتی لیکن اس روز بڑی اپنا تہیت سے میرے پاس  
آ کر کھڑی ہو گئی اور ایک تہہ کیا ہوا خط میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہنے لگی۔

تیری یادوں کے گلاب

"اس خط کو پڑھ لو..... انہوں نے دیا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ہمارے سامنے والے۔ کان  
کی طرف اشارہ کیا تو میں نے خیر ارادہ کی طور پر نگاہ اٹھ کر دیکھا۔ ایک نہایت وجہ پڑا تھا۔ میری  
نظریں جیسے ہی اس کی آنکھوں سے ٹکرائیں لڑنے سے نکلنے والی انداز میں آدھ کر ڈالا۔  
میں اس صورت حال سے گز پڑا گئی اور خط واپس بلیس خالہ کی طرف بڑھا جاتے ہوئے نہ نہ  
کے انداز میں سر ہلانے لگی۔

"رکھ لو نا....." بلیس خالہ جھڑک کر بولیں۔ "جلدی کرو چھپاؤ اسے نادیا نے دیکھ لیا تو  
قیامت آ جائے گی..... اور ہاں اسے پڑھنا ضرور۔" یہ کہہ کر بلیس اپنے کام میں مصروف ہو  
گئی۔ میں لافانہ ہاتھ میں پکڑے چکا بکار دھکی اور پھر چور نظروں سے گیلری کی طرف دیکھتے ہوئے  
لغافہ تیزی سے چھپا لیا۔ میرا دل دھاڑ دھاڑ مچنے لگا۔

رات تک نہ تو کوئی موقع ملا اور نہ جرأت ہوئی کہ لغافہ کھولوں..... رات کو جب کمرہ بند کر لیا  
تو میں نے لرزے ہاتھوں سے لغافہ کھولا۔

"میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں اسی مکان میں رہتا ہوں۔ یہ میرا اپنا گھر ہے۔ ایل  
ایل بی کر رہا ہوں۔ جواب کا خنجر ہوں۔"

خط سادہ کاغذ پر تھا۔ نیچے کوئی نام وغیرہ نہ لکھا تھا۔  
خط پڑھتے ہی ہمارے خوف کے تجھے پسینہ آ گیا۔ اگر یہ خط بھائیوں یا نادیا کے ہاتھ لگ گیا  
تو..... کچھ بھی نہ کرنے کی پاداش میں میری زندگی کو اجیرن بنا دیا گیا تھا..... یہ تو کج کولینز میرے  
پاس تھا..... اور پھر جانے کب میں سو گئی۔ خط میں نے سونے سے پہلے سنبھال لیا۔

☆.....☆.....☆

پھر ایک دن میرے دل میں خوشی کی ایک کونیل بھوٹ پڑی..... میں گھر آ یا تو اسی عورت کو  
اپنے گھر میں کام کرتے دیکھا جو سامنے والے گھر "نصیر منزل" میں کام کرتی تھی۔ امی نے بتایا کہ  
یہ اس بھئی کی بیٹی تھی میں رہتی ہے بڑی مشکل سے راضی ہوئی ہے کہ وہ پہرے کے بعد آ کر رہے گی۔  
چار سو روپیہ ملے ہوا ہے۔

اب میں بہانے بہانے سے خالہ بلیس سے بات کرتا۔ بڑی ہی اچھی عورت تھی۔ مجھے پھر  
کی معلومات تھیں اس کے پاس مگر نہایت احتیاط سے بولتی کم کو بھی تھی۔ کئی سوال کرنے کے باوجود  
بھی ہوں ہاں سے زیادہ نہ بولتی جس سے مجھے مایوسی ہونے لگی۔ ابھی اسے کام کرتے ہوئے چند

ی دن ہوئے تھے کہ مجھے کہنے لگی۔

”بہنے بھلی کا بل جمع کروانا ہے اکل بل کی آخری تاریخ ہے میں روپے کم ہیں۔“ میں نے نکال کر دے دیے۔

چند بیٹے اور گزر گئے۔ ایک بار پھر اس نے میں روپے مانگے۔ میں نے خاموشی سے دے دیے۔ اکثر دیکھتا کہ کام ختم کر کے جانے سے پہلے خالہ بقیس فرخ میں سے بچا ہوا پانا ساں، بھوسہ بھوسہ یا کوئی پرانا کپڑا لے جاتی۔ بھریوں دس بارہ دنوں کے بعد تیسری بار اس نے مجھ سے میں روپے مانگے تو مجھے حوصلہ ہو گیا۔ ثابت ہوا کہ یا تو بہت ہی غریب اور ضرورت مند ہے اور یا پھر نہایت لالچی عورت ہے۔

پھر ایک دن مجھے اس سے بات کرنے کا موقع مل ہی گیا۔ اتفاق سے اس دن تمام گھر والے کہیں گئے ہوئے تھے۔ کہ خالہ بقیس کام کرنے آ گئی۔ میں جان بوجھ کر اس کے سامنے پرس سے پیسے نکال کر گنتے اور جھوٹ موٹ کوئی حساب کرنے لگا۔ سو سو کے کئی دو جن سرخ نوٹ دیکھ کر بقیس خالہ غریب محسوس انداز میں میرے قریب آ کر باتیں مکھڑنے لگیں۔ اور آخر وہ نہ سکی اور گھر کی کوئی انتہائی مائی مجبوری بنا کر پچاس روپے کا تحائفہ کر دیا۔ میں ٹپس پر اور کہنے لگا۔

”خالہ کئی دفعہ تو مجھ سے ادھار پیسے لے کر گئی تھی تاج تک واپس نہیں کیے۔“

میری بات سن کر خالہ میرے قریب ہی بیٹھ گئی اور لگی اپنی غریبی کا ذکر شروع کر دی۔

”اچھا چھوڑ خالہ میں نے لوہا گرم کر دیکھ کر ضرب لگائی۔ چھوڑ نہیں تیس روپوں کی بات۔ اگر تو میرا ایک کام کروں تو میں تمہیں پانچ سو روپے دے سکتا ہوں۔“

”وہ کون سا بیٹا؟“ پانچ سو کی بات سن کر خالہ بقیس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

میں نے چند لمحے توقف کے بعد کہا۔

”یہ بے سنے والے گھر کی نوکری کے بارے میں کچھ جانا چاہتا ہوں۔ جہاں تم صبح کام کرنے جاتی ہو۔“

”کیا جانا چاہتے ہو۔۔۔۔۔؟“ بقیس خالہ کی آنکھوں میں ابھرنے اور تذبذب کے آثار ابھرے۔

”یہی کہو کہ ہے، اس کے ماں باپ، بہن بھائی کہاں ہیں؟“

”کیوں شاید باو تم نے یہ جان کر کیا کرنا ہے؟“

”بس ہے ایک ضرورت۔۔۔۔۔“

”وہ دراصل بات یہ ہے کہ دیکھنا اپنا انہوں نے منع کیا ہوا ہے کہ دھار۔ مگر لی کوئی بات کسی کو نہیں بتائی۔ ورنہ مجھے کام سے نکال دیں گے۔ اس گھر کی تنخواہ میرے گھر کا رتی پنا ہے۔ آٹھ سو روپہ مہینہ مجھے دیتے ہیں۔“

”چلو کوئی بات نہیں خالہ میں تم سمیٹ کر پرس میں رکھ کر پرس جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔“

”جب پچھلا ادھار واپس کر دو گی تو پھر نیا ادھار دوں گا۔“ میں اٹھنے لگا۔

”اورے سنو تو بیٹا۔۔۔۔۔ خالہ بقیس پریشان ہو کر بولیں۔“ پانچ سو روپہ بہت بڑی رقم تھی اور خالہ بقیس اسے کسی بھی قیمت میں کھانا نہیں چاہتی تھیں۔

”میں تمہیں بتا تو دیتی ہوں۔ مگر۔۔۔۔۔ وہ پھر رک گئی۔ تم آگے کسی کو ذکر نہ کرنا ورنہ میرے لیے مشکل ہو جائے گی۔“ خالہ شاید پریشان ہو گئی تھی۔

”دیکھو خالہ بات سیدھی ہے۔ وہ لڑکی مجھے اچھی لگتی ہے۔ تم اس کے عشق مجھے جگ جگ تازہ کی تو پانچ سو روپے لٹام دوں گا۔“

”اس لڑکی کا نام ابم ہے۔ اس کے ماں باپ فوت ہو گئے ہیں اور یہ ان لوگوں کے پاس ہی رہتی ہے۔ خالہ بقیس نے گولی مول جواب دیا۔

”اس کے کوئی بہن بھائی؟“

”نہ بھائی ہیں اس کے۔“

”وہ کہاں ہوتے ہیں کیا کرتے ہیں؟“

”وہ۔۔۔۔۔ اصل میں۔۔۔۔۔ دراصل۔۔۔۔۔ خالہ بقیس مزید بولنے لگی۔

”چھوڑ دے خالہ میں کسی اور سے پوچھ لوں گا۔ تیرے کن میں چور ہے تو مجھ سے پیسے بھی لینا چاہتی ہے اور بتانا بھی نہیں چاہتی۔ میرا تو خیال تھا کہ تجھے پانچ سو کے بعد پیسے اور بھی دے دوں مگر ٹو بے ایمان ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے پرس پینٹ کی جیب میں اس سا اور کھڑا ہوا۔

”بھنو تو بیٹا۔۔۔۔۔ خالہ نے میرا دامن پکڑ لیا۔ میں تمہیں ایک ایک لفظ جگ بتا دوں گی۔

”دیکھ تو مجھے جو کچھ بتائے گی میں اس کی تصدیق کروں گا۔ اگر وہ جگ نکلا تو مزید پانچ سو روپے تمہیں دوں گا۔ یعنی ہزار روپے تجھے ملیں گے۔ پانچ سو ابھی پانچ سو بعد میں اور اگر جھوٹ دلا تو پھر ٹو مجھے جانتی نہیں میں ایک ایک روپہ واپس وصول کروں گا۔“

”دیکھو بیٹا۔۔۔۔۔ خالہ رازداری سے بولی۔ کسی سے ذکر نہ کرنا۔۔۔۔۔ واپاروں کے بھی کان



تری یادوں کے گلاب

ہوتے ہیں۔ اس گھر میں تو مجھے والوں کا آنا جانا ہے اور نہ یہ کسی کے گھر آنا جانا پسند کرتے ہیں۔ اس لیے کسی کو درست بات معلوم نہیں۔ اصل میں یہ لڑکی ارم جسے تم ملازمہ سمجھ رہے ہو یہ تو یہاں رہنے والے دونوں لڑکوں کی بہن ہے۔ ارم کی بھابی اصل میں پہلے تو کرائی تھی۔ دونوں ماں بیٹی تو کرائیاں تھیں۔ انہوں نے ایسا چکر چلایا کہ دونوں مالک بن بیٹھیں اور اس لڑکی کو بدنام کر دینے کے ڈرا دے وے کر اس سے تو کرائیوں کی طرح کام کرائی ہیں۔

”کیا کہہ رہی ہو خالہ؟“ یہ انکشافات میرے لیے حیرت انگیز تھے۔ میں تو دنگ سی رہ گیا پھر میں کہہ کر یہ کہہ کر خالہ سے باتیں پوچھنے لگا۔ تو خالہ نے ایک ایسی اچھوتی کہانی سنائی کہ دماغ میں گرم ہواؤں کے جھڑپلنے لگے۔ خاص طور پر یہ کہ اس کے بھائیوں کو ساری صورت حال کا علم ہی نہیں۔ اور یہ کہ ان کے گھر میں جوفن آتے ہیں سب وہ نادیدہ چکر چکی تھیں جس نے درجنوں فون کرنا کر لڑکی کی عزت خاک میں ملا دی تھی۔ میں نے قیافہ سوسو کے پانچ نوٹ گن کر خالہ کی تسلی میں دیے جوفن اسی نے چھپا لیے۔

”خالہ.....!“ میں بچنے ہوئے انداز میں بولا۔

”مجھے ساری کہانی الف سے ہی تک بچ کر بتا دے ابھی تجھے پانچ سو روپے حریہ انعام

دوں گا۔“

پھر خالہ نے بتایا کہ محلے کا ایک لڑکا اس کو فون کرتا ہے۔ ارم کے ہاتھ کے ٹکے ہوئے پرانے خط جو ارم نے ٹادیہ کی کتلی کو لکھ کر دیئے تھے وہ خود ٹادیہ نے مجھے دیئے تھے اور وہ ٹیپا کے نوالے خود میں نے ہی کیے تھے۔ اس کام کے لیے ٹادیہ نے دو سو روپے مجھے اور تین سو روپے ٹیپا کو دیا تھا اور حریہ باتیں بتاتے تھے۔

”دیکھو خالہ.....!“ ساری کہانی سن کر میں لمبی سانس بھر کر بولا۔

”ٹو عمر کے اس حصے میں جب کہ حیرت انگیز قبر میں ہیں۔ ارم کی زندگی برباد کرنے میں تمہارا بہت بڑا حصہ ہے۔ تجھے کیا ملا چند سو روپے؟ یا پھر ہفتہ پندرہ دن بعد وہ تجھے سوچا اس اور دے دیتی ہوں گی۔ لیکن ٹو نے اپنی ماقبت تو خراب کر لی ہے۔ اب اللہ کو راضی کرو اور اپنی آخرت کی فکر کرتے ہوئے اپنی ماقبت سنوار لے۔ اس کا طریقہ یہی ہے کہ ٹو میرا ساتھ دے میں تجھے پیسے اتنے دوں گا کہ ٹو نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے ہوں گا۔ میں ارم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اگر ٹو میری اور ارم کی دوستی کر اے تو تجھے خوش کر دوں گا۔“

تری یادوں کے گلاب

اور پھر میں نے جلدی سے سادہ کاغذ پر ارم کے نام شادی کا پیغام بھیجا اور لفافے میں بند کر کے خالہ کو دیا۔ یہ خط اس کو میرے سامنے دینے کا سو روپے انعام اور اگر اس سے جواب نہ آئے تو حریہ دو سو روپے انعام دوں گا۔

”ٹھیک ہے بیٹا..... کل تم صبح ٹھیک بارہ بجے گیلری میں کھڑے ہو جانا اور دیکھتے رہنا میں خط اس کو دوں گی۔“

☆.....☆.....☆

ایک جھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی۔ میرا وجود بیسنے میں ڈوبا ہوا تھا اور دل ایسے دھڑک رہا تھا کہ سینہ پھاڑ کر باہر آ جائے۔ خواب ہی ایسا دیکھا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میری سہاگ رات ہے اور وہی والا لڑکا جس نے خالہ بقیس کے ہاتھ اسے خط بھیجا تھا وہ لمبے کے روپ میں میرا گھر ٹھٹھٹا اُٹھ رہا ہے۔ اور پھر میری نیند ٹوٹ گئی..... حلق میں کانٹے سے چھ رہے تھے۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ پانی بگ سے اُٹھ پلا اور ٹٹا ٹٹا بی گئی۔ اب نیند اُڑ چکی تھی۔ وال کھانک کی طرف نگاہ بھری تو پیہ چلا کہ صبح کے چار بجے ہیں۔ باہر جھانکا تو نہ پھوٹ رہی تھی۔ سب گھر والے سوئے ہوئے تھے۔ یہ کیا ہوا؟..... ایسا کیوں ہوا؟ اور پھر آہستہ آہستہ میں ٹارل ہوتی چلی گئی۔ اُٹھ کر دھو کیا اور صبح کی نماز پڑھی اور اللہ سے دعا ہوئی کہ میرے حال پر رحم کر۔ اور مجھے ان کی سازشوں سے محفوظ رکھے۔ اس کے بعد میں گھر کے کاسوں میں مصروف ہو گئی۔

لیکن وہ رورور کر مجھے خالہ بقیس کا خط دینا..... اس لڑکے کا آہستگی، خاموشی سے آداب کرنا اور رات والا خواب یاد آ رہے تھے۔ بار بار ذہن جھٹکنے کے باوجود یہ باتیں جیسے میرے دل و دماغ سے چپک کر رہ گئیں۔ مجھے ایک بے قراری اور بے چینی سی محسوس ہو رہی تھی۔ ساتھ ساتھ میں لیکن میں صبح کے ناشتے کی تیاری کر رہی تھی۔ اسے میں آہٹ ہوئی دیکھا تو ٹادیہ کی امی سیکتے تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر نفرت کے آثار ابھرا آئے۔

”اسے لڑکی رات تا صبح تک کے کسی کام سے کراہی چلا گیا ہے۔ ارسلان، ٹادیہ اور میں آج کہیں چپک پر جا رہے ہیں۔ ناشتے کے وقت ارسلان جہیں ساتھ چلنے کے لیے زور دے گا لیکن تم نے طبیعت خراب ہونے کا یا موڈ نہ ہونے کا یا پھر کوئی بھی بات کہہ کر انکار کر دینا ہے۔ کبھی.....؟ تم ساتھ نہیں جاؤ گی.....“ سیکتا ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔

”ہم شام تک آ جائیں گے اور سنوارسلان جا گا ہوا ہے..... ٹادیہ اس کے کمرے میں

تری یادوں کے گلاب

ہے۔ میں ناشتہ بنانے آئی ہوں۔ میں اپنے کمرے میں ہوں۔ تم ناشتہ بنا کر مجھے بتاؤ میں اوپر لے جاؤں گی۔ تم ذرا بعد میں آؤ گی۔" یہ کہہ کر کینٹ چلی گئی۔

میں کبیری سانس لے کر رو گئی۔ تھوڑی دیر میں خالد بلیس بھی کام کرنے آ گئیں۔ پھر میں نے فنی کیا جو دیا اور اس کی ماں کی فضا چھی۔ ارسلان بھائی نے بھترارو رو دیا لیکن میں نے سو نہ ہونے کا بہانہ کر دیا اور پھر تقریباً ساڑھے گیارہ بجے وہ تینوں سرری کھل گئے۔ گاڑی ارسلان چلا رہا تھا۔

میں سمجھ گئی کہ تادیہ باصر بھائی کی عدم موجودگی کا قاعدہ اٹھا کر ارسلان پر اپنی اداؤں کے جال پھینک کر اسے مزید اپنے سے قریب کرنا چاہتی ہے۔ ساتھ آج اس سے اچھی خاصی شاہنگ بھی کرے گی۔ بڑھیا تو صرف اس لیے ساتھ گئی ہے کہ کوئی شک نہ کرے کہ "دوہر بھائی" کیلے کیوں نظر ہیں۔ ورنہ فرنٹ سیٹ پر تادیہ بیٹھی تھی۔ ان کے جانے کے بعد میں مردہ دل سے اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔ کراچیاک آہٹ ہوئی میں نے یکدم آنکھیں کھول دیں۔ میں کبھی خالد بلیس کسی کام سے آئی ہوگی۔ مگر پھر اچانک اپنے سامنے ایک نوجوان شخص کو دیکھ کر میری ہلکی سی چیخ نکلی تھی۔ یہ وہی نوجوان تھا جس نے کل اپنی ٹیکری سے مجھے آداب کیا تھا۔ اور خالد نے جس کا خط مجھے دیا تھا۔

میں ہلکا ہلکی..... میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا یہ اندر کیسے آیا اور اب میں کیا کروں؟

پھر اچانک ہی ایک خیال بھیا یک خوف کی طرح میرے دماغ میں سرایت کرنا چلا گیا کہ کہیں یہ بھی تادیہ اور اس کی ماں کی سازش تو نہیں..... کہیں وہ بھائیوں کے سامنے میری رہی سہی عزت کی وجہیاں تو نہیں اڑاتا چاہتیں۔ اگر یہ بات ٹھیک ہے تو پھر یقیناً تادیہ کسی بہانے سے ارسلان کو لے کر فوری طور پر واپس ضرور آئے گی۔ تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے یکن کو کسی نوجوان کے ساتھ دھک رہا یاں مٹاتے دیکھ لے۔ یہ سوچتے ہی میرے پیروں میں جان نہ دی اور میں چکرار و حزام سے فرش پر گر گئی اور پھر مجھے ہوش نہ رہا۔

☆.....☆.....☆

چند منٹوں بعد میرے حواس بحال ہوئے تو میں اپنے بستر پر تھی۔ بید کے ایک طرف وہ نوجوان اور دوسری طرف خالد بلیس بیٹھی تھیں۔ مجھے ہوش میں دیکھ کر دونوں کے چہروں سے اطمینان چمکنے لگا۔ ایک غیر مرد کو اپنے بیدروم میں دیکھ کر میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"میرا نام شاہد ہے۔ میں آپ کے بالکل سامنے والے کمرے میں رہتا ہوں۔ ایل ایل بی کر

تری یادوں کے گلاب

رہا ہوں۔ مستقبل میں دیکھنا کہ کارواہ ہے۔ اپنے والدین کا اگھوتا بیٹا ہوں۔ دو بھینس ہیں اور امی ابو ہیں۔ میں گزشتہ کئی ماہ سے آپ کو چپکے چپکے دیکھتا رہا ہوں۔ آپ کی بھولی بھالی صورت کو دل سے بیٹھا ہوں۔ کل ایک خط بھی آپ کو بھیجا تھا۔ آج خود حاضر ہو گیا ہوں۔ یہ سب خالد بلیس کی سہرا بانی ہے۔ حرف مدعا یہ ہے کہ آپ سے شادی کا خواہش مند ہوں۔ اس ساری بات میں نہ تو کوئی چکر نہ اور نہ ہیرا پھیری میں اللہ کو حاضر تاظر جان کر کہتا ہوں کہ آپ سے عشق کرنا چاہتا ہوں مگر شادی کے بعد۔ اب آپ کی مرضی ہے کہ دل میں جگہ عطا نہ فرما دیں۔ یا اٹھکارا میں۔"

"تم بغیر اجازت اندر کیوں آئے ہو؟" میں حواس مجتمع کر کے بولی۔ "شادی کا بیٹھام دے۔" اچھا طریقہ نکالا ہے آپ نے اگر کوئی دیکھ لے تو میری کیا عزت رہ جائے گی؟

"اپنی ماں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آپ کی عزت کو اپنی عزت سمجھتا ہوں۔ اگر آپ قسم کریں تو ابھی اپنی شکل گم کر لیتا ہوں تاہم میری درخواست پر غور ضرور کیجئے گا۔ نوجوان کی خوب صورت سنگتو اعتماد اور شانگلی سے میری زبان تنگ ہو گئی۔ میں چاہنے کے باوجود اسے جانے کا نہ کہہ سکی اور گھر ٹکرا سے دیکھنے لگی۔ میری خاموشی سے اس کا حوصلہ بڑھا۔ "اگر آپ کہیں تو آپ کے بھائیوں کو رشتہ کا بیٹھام بھیجوں۔" اس کی اس بات کا جواب تو میرے پاس کوئی نہ تھا۔ میں نے نظریں جبریا لیں.....

"ایک کام میں دیر نہ گاہے گی بیٹا ضرور بھیجنا مگر اب چلو کہیں کوئی دیکھ نہ لے۔" یہ خالد بلیس کی آواز تھی۔

اس کے جانے کے بعد بھی میں کافی دیر گم صبر رہی..... سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اب کیا ہو گا۔ میں نے خالد کو بلایا۔ اس نے بغیر حیل و حجت کے مان لیا کہ اسے میں ہی اندر لائی تھی۔ اس نے مجھے تہہارا بھلا نظر آیا بیٹا.....

"مجھے کل سے ہی پتہ تھا کہ تمہارے گھر والے آج چلک پر جائیں گے اور تم بھیس رہو گی۔ اے بیٹا میں تو کہتی ہوں رشتہ آئے تو قبول کر لیجے..... ورنہ یہ ڈانسیں تو قطرہ قطرہ کر کے تمہارا خون پوس لیں گی۔"

اگلے ہی دن انکشاف ہوا کہ تادیہ نے ڈرا نیوٹک سکول میں داخلہ لے لیا ہے۔ صبح دس بجے اکیڈمی کی گاڑی خاتون انٹرکمز سمیت ہاؤس کو لینے آ گئی۔ اس کی ماں بھی ساتھ چلی گئی۔ پھر تو روزانہ ہی دونوں ماں بیٹی جج جج کر چلی جاتیں۔ آج نہیں تیسرا دن تھا۔

تری یادوں سے نکلا۔

اتوار کی وجہ سے دونوں بھائی گھر پر تھے۔ نادیہ اور اس کی ماں کو گھسے ہوئے ابھی آدھ گھنٹہ بھی نہ تھا کہ ہماری تیل بج اٹھی۔ خالد بقیس نے دروازہ کھولا۔ آنے والے ایک مرد اور عورت تھیں۔ چلا کہ شاہد کے والدین ہیں۔ خالد نے ناصر اور ارسلان کو بتایا۔ مجھے چائے وغیرہ کی ہوا۔ ہوئی۔ بھائیوں نے رشتہ کا بیچا سمن کر خاموشی اختیار کر لی۔ شاہد کی تعلیم ایل ایل بی جان کر ہوئی۔ کی خاطر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ مشورہ کیا۔ پھر مجھے بلایا۔ بات میرے سامنے کئی میں نے کہا جیسے آپ کی مرضی۔ دونوں اس معقول رشتے سے مطمئن نظر آتے تھے۔ خالد بقیس بھی وہیں موجود تھا۔ کہنے لگی۔ بیٹا انہوں نے ساری معلومات مجھ سے ہی لی تھیں۔ میں تو کتنی ہوں تعلیم یافتہ و شریف اور خوشحال فیملی ہے اتنا اچھا رشتہ نکل گیا تو مشکل ہو جائے گی۔ ناصر بھائی کہنے لگے۔ "نادیہ سے کیوں نہ مشورہ کر لیں۔"

"اے ہے بیٹا ان کو تو ہاں کر دو۔۔۔۔۔ محلے کے کئی اور لوگوں کی بھی اس لڑکے پر نذر ہے۔ نادیہ کو دونوں بھائی بعد میں بتا دیئے۔ رشتہ سے خوش ہی ہو گئی۔ پھر ارم بین کو آپ کی بہن فیصلہ تو آپ دونوں نے کرنا ہے۔" بقیس خالد کی سیالی باتیں سن کر دونوں بھائی ایک دوسرے کو اشارہ کر کے اٹھے اور انہوں نے جا کر باہر کر دی۔

شاہد کے ابو منٹائی لانے کے لیے جانے لگے تو ناصر بھائی نے کہا۔ میری وائف اس وقت گھر میں نہیں ہے۔ آپ ایسا کریں شاہد کو چائے ہمارے ساتھ ہی بیٹیں وہ ابھی آ جائے گی۔ چائے ہماری اودھ منٹائی آپ کی۔ ناصر بھائی کی بات سن کر سب ہنس پڑے۔

☆.....☆.....☆

خالد مجھ سے مل رہا ہے۔ کہیں نادیہ نے ہاں کر دی تو بھائی بھی انکار کر دیں گے۔ تم آؤ نہیں رک جاتے۔ اور ان دونوں ماں بیٹی کی سن گئی۔ میں نے خالد سے کہا تو خالد اچانک رو پڑا۔ اسے روتے دیکھ کر میں چونکی۔ "اس میں رونے کی کیا بات ہے خالد؟"

"بیٹی۔۔۔۔۔ خالد نے اچانک میرا سراپے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔" تمہارے ساتھ نہ کچھ بھی نادیہ اور اس کی ماں نے کیا ہے اس میں میں بھی برابر کی شریک ہوں۔ شاہد نے میری آنکھیں کھول دی ہیں اب میں تمہاری مدد کر کے اپنے گناہوں کا گھاوا کرنا چاہتی ہوں۔ خالد کی بات سن کر میں حیران ہوئی۔ لیکن پھر خالد نے مجھے شاہد سے ملاقات کی تمام باتیں سن و سنائیں تو میرے دل میں شاہد کی عزت اور محبت نے مزید سرا اٹھایا اور خالد باپسیوں کے گھناؤپ اندھیرے۔

تری یادوں سے نکلا۔

میں روشنی کی کرن دکھائی دینے لگی۔ ایک بچے کے قریب نادیہ اور اس کی ماں انہیں آگئیں۔

دو پہر کے کھانے پر جب ناصر بھائی نے انہیں ساری بات بتائی تو وہ چونک پڑیں اور ایک دوسرے کو کون انکھیں سے جو بکھا۔ عین اسی وقت میں نے خالد اور خالد نے مجھے دیکھا۔ نادیہ کی ماں کہنے لگی۔ بھئی تمہاری بہن ہے تم نے ہی فیصلہ کرنا ہے اور ساتھ پہلو میں بیٹھی نادیہ کے پاؤں پر اپنا ہیرا مارا سے خاموش رہنے کی ہدایت کی۔ اس کی اس حرکت کو میں نے بھی نوٹ کیا اور خالد نے بھی۔ کھانے کے بعد میں بچے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کیونکہ پچھلی والے دن بھائیوں کے سامنے مجھے زیادہ کام کرنے کی ضمانت ہوئی تھی۔ ارسلان اپنے کمرے میں گھس گیا۔ ناصر اور نادیہ اپنے کمرے میں قیلولہ کرنے لگے۔ نادیہ کی ماں بھی بچے اپنے کمرے میں آگئی۔ جو میرے کمرے سے ایک کمرے کے فاصلے پر تھا۔

مگھنہ بھر گزرا ہو گا۔ نادیہ سیر حیاں آرتی نظر آتی وہ سیدھی اپنی ماں کے پاس چلی گئی۔ بقیس خالد بھی کام کے بہانے کمرے کے گرد منڈلانے لگی۔ میرا دل بیٹھے لگا۔ نادیہ کا اس پر اسرار طریقے سے ماں کے پاس آنے کا مقصد یقیناً کسی نئی سازش کے تانے بانے بنا تھا۔ ایک ایک منٹ میرے لیے ہماری ہور تھا۔ پندرہ منٹ بھی نہ گزرے ہوں گے کہ خالد بقیس میرے پاس آگئی۔ آتے ہی کہنے لگی۔ ارم بین کو بیٹی ناگل کھلانے والی ہیں یہ دونوں۔ میں ان کے کمرے میں کام کر رہی تھی کہ نادیہ نے آکر مجھے باہر جانے کو کہا لیکن میں ان کی کھڑکی کے پاس کھڑی ہو کر ان کی باتیں سننے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن صرف یہ ہی سن پائی ہوں کہ ماں بیٹی سے کہہ رہی تھی کہ جب تک یہ پرکھی طوطی اس گھر کے باغچے میں بند رہے گی سب ٹھیک رہے گا۔ جیسے ہی اس کی شادی ہوئی یہ بیس بی آنکھیں دکھانے لگے گی اور ایک ایک کر کے سب ننچریں توڑتی چلی جائے گی۔

"اور کیا سنا خالد۔۔۔۔۔" میری بے تائیاں دینے لگیں۔

"کچھ بھی نہیں۔۔۔۔۔ اس کے بعد دونوں ماں بیٹی کی آوازیں ہم کو جھگڑا اور دوسرے جوت کرکھر پھر اور کانٹا پھنسی کرتے لگیں۔"

ابھی خالد بات کر ہی رہی تھیں کہ باہر قدموں کی چاپ ابھری جو یقیناً نادیہ کی تھی۔ خالد جلدی سے میرے ڈرائیگ ٹیبل کے پاس جا کر وہ سلیٹنگ نکال کر نہ پر پڑنے لگی۔ میں نے پشت کے مل سیدھی لیٹنے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

"خالد تم کیا کر رہی ہو یہاں؟ ابھی گئی نہیں؟ اور ابھی جانا بھی نہیں اور پھر کمرے میں جا کر بیٹھو۔"



مجھے تم سے کوئی کام ہے..... میں آتی ہوں۔"

"اچھا جی....." بقیس خالہ کمرے سے نکل گئی۔

نادیہ نے زور سے مجھے بلایا تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔

"اٹھ کر بیٹھو....." دو تھکانہ لہجے میں غلاب ہوئی۔ میں بیٹھ گئی۔

"شام کو رشتہ والے دو بارہ آئیں گے تو تم نے اس کو رانی ہے۔"

"مگر کیوں بھائی.....؟" میرے دل میں ہول اٹھنے لگے۔

"صرف اس لیے کہ یہ میرا حکم ہے..... یہ نہ ہو کہ ادھر سب لوگ چائے پی رہے ہوں ادھر

گلی میں تہہ باری تصویریں اور خطوط پائے جا رہے ہوں۔"

"لیکن بھائی..... اتنا غم تو نہ کرو..... میں نے آپ کی ہر شرط پر عمل کیا اور یہ بات شرط میں

شامل نہیں تھی۔"

"نہیں تھی تو آج سے شامل سمجھو اور اپنی بکواس بند کرو۔" نادیہ نے تھپڑ کھینچ مارا۔ "تم

اگلے دس سال تک شادی نہیں کرو گی۔ جس وقت وہ چائے پی رہے ہوں گے ہاں بھائی تم سے

تہہ باری مرضی کا پوچھیں گے۔ تو تم نے مضبوط لہجے میں لڑکے کو دیکھنے کی خواہش کرنی ہے۔ کوئی سا

بھی اس میں ایسا نقص نکال لیگا۔ جس سے لڑکے یا اس کے والدین کو نفرت آجائے مثلاً اگر رنگ

سا نولا ہے تو قد چھوٹا ہے تو..... قد زیادہ لمبا ہے تو..... کوئی بھی نقص اور یہ نقص تم نے خود سوچنا

ہے....." اور پھر نادیہ چلی گئی۔

نہیں کال پر ہاتھ رکھ سکتے کے عالم میں تھی۔ میں سمجھتی کہ نادیہ اور اس کی ماں میری زندگی

مکمل تباہ کر کے چھوڑ دیں گی۔ ابھی میں سوچوں میں گم تھی کہ بیڑیوں پر کسی کے قدموں کی چاپ

سنائی دی۔ میں جان گئی کہ خالہ بقیس بیٹے اتر رہی ہوں گی۔ کیونکہ نادیہ نے اس کو اوپر بھیجا تھا۔

میں اٹھ کر صحن میں آئی تاکہ خالہ سے کوئی بات کر سکوں لیکن نادیہ اوپر گیلری سے دیکھ رہی تھی۔ نادیہ

کی موجودگی میں مجھے خالہ سے بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ خالہ بھی ایک طائرانہ نظر مجھ پر ڈالتے

ہوئے گیٹ کھول کر چلی گئی تو نادیہ نے اشارے سے مجھے گیٹ بند کرنے کو کہا۔ میں گیٹ بند کر

کے بچتی۔ دیکھا تو نادیہ ہانچتی تھی۔ میں اپنے کمرے میں آ کر ستر پر گر گئی۔ اور سسٹنے لگی لیکن پھر کسی

آہٹ کو پا کر بچتی یہ نادیہ کی ماں تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر سنبھل گئی۔

"یہاں نسو نہ بہا..... اور اٹھ کر کچن صاف کر اس نے مجھے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا۔

"شام کو مہمان بھی تو آئے ہیں۔" طنز کے نشتر لگا کر وہ بھی نکل گئی۔ میں پھر روئے لگی۔

☆.....☆.....☆.....

تھوڑی دیر بعد آنکھوں سے پانی صاف کر کے اٹھی اور کچن میں چلی گئی جہاں ناشتے اور

دو پھر کے کھانے کے گندے برتنوں کا ڈھیر لگا تھا۔ چپ چاپ کام کرنے لگی۔ نادیہ دیر نہ گزری

تھی کہ نادیہ آ گئی..... آتے ہی کہنے لگی۔

"جلدی سے اپنے کمرے میں جا کر لیٹ جاؤ..... میں کام کرتی ہوں۔" اس کی اس

بات سے میں جڑی حیران ہوئی۔ لیکن نادیہ کا حکم تھا۔ مجھے جانا ہی تھا۔ میں کمرے کے باہر ہی

برآمدے میں ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ چند ہی منٹوں بعد مجھے ہاں بھائی اپنے کمرے سے نکل کر آتے

نظر آئے۔ مجھ سے تو کوئی بات نہ کی البتہ گاڑی نکالنے لگے۔ ان کے جانے کے بعد نادیہ نے سی

گیٹ بند کیا اور میرے پاس آ کر بیوی۔ وقفہ ختم! اب جا کر کام کرو..... یہ کہہ کر وہ ہنسی ہوئی

سیڑھیاں چڑھ گئی۔ میرے دیکھنے ہی دیکھتے وہ اپنے کمرے کے بجائے ارسلان کے دروازے پر

دھک دینے لگی۔ دھک دینے کے بعد وہ چلی مجھے دیکھا جس کر بالوں کو طنز یہ انداز میں نخرے سے

جھٹکا اور مجھے سامنے سے بہت جانے کا کہا۔ میں تیزی سے اپنے کمرے میں گھس کر کونڑی میں آ کر

کھڑی ہو گئی جس کے باہر جانی گئی تھی۔ لیکن اندر سے سب کچھ نظر آتا تھا۔ میرے دیکھنے ہی دیکھتے

ارسلان کے دروازہ کھولا۔ نادیہ کو دیکھ کر تیرہ ان ہونے لگا کہ نادیہ نے ہائیں وا کر دیں اور اونچی

آواز میں ہنسنے لگی۔ ارسلان کچھ بکھو نہ پایا تو نادیہ نے بے تکلفی سے اس کے کان میں کچھ کہا تو

ارسلان نے نادیہ کو کمرے سے پکڑ لیا۔

☆.....☆.....☆.....

شام چھ بجے کے قریب مہمان آ گئے۔ شاید کے امی ابو اور اس کی بیٹنیں پانچہ زہ اور سبین

انتہائی مار مار کر تھکے ہوئے تھیں۔ نادیہ چہرے پر مسکراہٹ سجائے استقبال کرنے

لگی۔ اس نے چائے کا سٹک کا سفید ٹراڈز رسوٹ زیب تن کر رکھا تھا جس کے کرتے پر پینڈے لکڑی کا کام ہوا

تھا۔ ریڈ لکڑی کا سٹک کا دو پینڈے شانے سے ڈھانکا رکھا تھا۔ اونچی میبل والے سرخ پینڈوں میں پڑکشش

نظر آ رہی تھی۔

ڈرائنگ روم میں مہمانوں کو بیٹھا گیا۔ وہ اپنے ساتھ مشن کی چھوٹی سی نوکر بھی لائے

تھے۔ خالہ بقیس بھی آ گئی۔ سیکٹور خالہ بقیس چائے وغیرہ تیار کرنے لگیں۔ ارسلان بیکری سے کچھ

تری یادوں کے گلاب

”انگل! ارم اب آپ کی بیٹی ہے جب چاہیں اسے لے جاسکتے ہیں۔“ ناصر نے سعادت مندی اور سلیجے ہوئے لہجے میں کہا تو نادیا نے گہری نگاہوں سے ناصر کو دیکھا۔

”تو پھر ٹھیک ہے۔“ کیزو تیزی سے بولی۔ ”نیکسٹ فرائی ڈے ڈن ہو گیا۔ ارم آج سے ہماری بھائی ہے۔“ میں ہفتوں کی طرح بیٹھی تھی۔ مجھے یہ سب کچھ خواب سا لگ رہا تھا۔

اگلے دن ناصر بھائی مجھ پر تھے۔ لیکن نادیا اور اس کی ماں ڈرائیونگ انسٹرکٹر کے ساتھ چلی گئیں تو ناصر بھائی میرے کمرے میں آ گئے۔ ان کو اچانک سامنے پا کر میں جہان بھی ہوئی اور پریشان بھی۔ دو چاند لگے دروازے میں کھڑے مجھے غور سے دیکھتے رہے اور پھر سمیرا خاموشی سے میرے سامنے آ کر بیٹھ گئے۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا کرب کیا بات کریں گے؟

”اسلامان! رانا دیکھا آج آپس میں کیا چکر ہے؟“ غصہ غصہ لہجے میں انہوں نے سوال دیا۔ اس غیر متوقع سوال کو سن کر مجھے کچھ نہ آئی کہ کیا جواب دوں۔ میں خاموشی سے ان کا منہ دیکھتی رہی۔

”میں کیا پوچھ رہا ہوں؟ کچھ جانتی ہو؟“

میں پھر بھی خاموش رہی۔

”ادھر دیکھو میری آنکھوں میں۔“ انہوں نے سخت انداز اختیار کرتے ہوئے اپنی آنکھیں شہادت سے میرا چہرہ اوپر کیا۔ ہماری آنکھیں چار ہوئیں وہ بغور میری آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔ مجھے ان کی آنکھوں میں دشت آجی محسوس ہوئی۔

”کچھ جانتی ہی نہیں یا بتانا نہیں جانتی ہو۔“ ان کا سخت انداز غراہٹ میں تبدیل ہونے لگا۔ میں ڈر محسوس کرنے لگی۔ میں ان سے نظریں جدا نہ کر سکتی تھی۔ مجھ کو شاید وہ اصل حقائق جاننے بغیر نہیں گئے۔ لیکن پھر مجھے ہاپ کی دھمکیاں

پادہ گئیں۔ میری آنکھیں نم ہونے لگیں۔ بچہ نے پانی سے مہرنے لگے۔ میرے ہونٹ ہلچل گئے۔ میں سسکتی گئی۔

”تم جانتی ہو۔“ ناصر بھائی چپے۔ ”سب جانتے ہیں۔“ ان کی آواز پھٹ گئی۔ ”بتاؤ۔ جلدی سے بتاؤ۔“ ورنہ تمہارا گھر گھونٹ دوں گا یا پتا نہ دوں گا۔“

”ناصر۔ بھائی۔“ میں زور سے جھنجھی اور بھائی سے لپٹ گئی۔ میرے حواس پر

تری یادوں کے گلاب

لیٹنے چلا گیا۔ میں نے کپڑے تبدیل کر کے ہلکا سا میک اپ کر لیا حالانکہ اندر سے دل ٹوٹا ہوا تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ نادیا سارے کچھ کر دے گی کہ ایک بار پھر ارم سے پوچھا جائے اور مجھے انکار کرنے کا پابند کر دیا گیا تھا۔ اور پھر ارسلان نے کون سی نادیا سے ہٹ کر بات کرنی تھی میرا دل بھجا ہوا تھا۔ میں بھی کچھ نہیں ہی تھی۔ خالد ایتیس کسی بہانے سے ڈرائنگ روم میں پہنچ گئی۔ تھوڑی دیر بعد ڈرائنگ روم سے ڈراؤنچی آواز سنائی دی۔ پھر شاہد کی امی نے مجھے ڈرائنگ روم سے نکل کر باہر جاتی نظر آئیں۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی۔ چند منٹوں بعد وہ وہاں آئیں تو شاہد بھی ان کے ہمراہ تھا۔ نادیا کی امی کچھ نہیں ہی رہیں اس نے ڈرائنگ روم میں جانے کی کوشش ہی نہ کی۔ شاید اسے اپنی بیٹی پر پورا اعتماد تھا۔

”اور پھر ایتیس خالد آئیں اور مجھے چائے لے کر جانے کی ہدایت کی۔ اس کا چہرہ سیاہ تھا۔ میں نے دو پینڈاؤں کا اور چائے کی فرنی ڈرائنگ روم میں لے کر پہنچ گئی۔ چائے رکھ کر آنے لگی تو ناصر بھائی نے مجھے اپنے پاس ہی بیٹھنے کی ہدایت کی۔ سب چائے نوش کرنے لگے۔ مجھے علم تھا کہ چائے پینے کے بعد ناصر بھائی مجھ سے کیا سوال کریں گے۔ نادیا نے اسی لیے شاید کو بھی بلوا لیا تھا۔ میں نے ایک بار شاہد کو طائرانہ نظر سے دیکھا کہ کیا نقص نکالوں۔ وہ قدرے غصیلی ہوئی رگھت کا ہونے چوٹ کا صحت مند اور خوبصورت نوجوان تھا گتھی موبائیس جلی لگ رہی تھیں۔ بڑھا نکلا تو وہ تھا ہی نکلتا بھی میں بھی تھی۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی کہ کیا کہہ کر سب کے سامنے انکار کروں گی۔ میرے پاؤں لرزنے لگے۔ مجھے ہاتھوں پر عرش محسوس ہو رہا تھا کہ اچانک شاہد کی امی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور میری طرف بڑھیں ناصر بھائی نے ان کے لیے جگہ خالی کر دی۔ بیٹھنے ہی انہوں نے ڈیپ کھولی۔ اس میں سے انگوٹھی نکالی اور میرا ہاتھ پکڑ کر پینا دی۔ سب نے مبارک مبارک کہا۔ نادیا خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگی۔ پھر اسے کچھ خیال آیا تو اس نے یکدم مسکراتے ہوئے پہلے شاہد کو اور پھر مجھے مبارک باد دی۔ میری تو سمجھانی ہی پٹ پٹا ہوئی تھی۔

سب کچھ میری توقعات کے برعکس ہو رہا تھا۔ ناصر بھائی نے تو مجھ سے میری مرضی دوبارہ پوچھی علی نہیں تھی۔

”میرا خیال ہے نیک کام میں ذریعہ نہیں ہونی چاہیے۔ میں شادی کو سادگی سے کرنے کا قائل ہوں۔“ یہ شاہد کے ابو تھے۔ محلے کے چند افراد اور چند رشتہ داروں کی موجودگی میں جمعہ المبارک کو اس فرض کو ادا کر دینا چاہیے۔

تری یادوں کے گھر

تاریکیاں چھانے لگیں۔ میرا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ ناصر بھائی نے مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔  
 ”اس بے چاری سے کیا پوچھتے ہو ناصر میاں..... اس کی زبان پر تو بیک میٹنگ کے نام لگے ہیں۔“ یہ خالد بقیس کی آواز تھی اور پھر میں بے ہوش ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

ہوش آیا تو اپنے بستر پر تھی خالد بقیس مجھ پر جھکی میرے کال ضبط پر ہی تھی..... کمر..... من..... شور تھا..... چند سیکنڈ میں نہیں پورے حواسوں میں واپس آ چکی تھی۔ دیکھا تو ناصر بھائی ارمان اور دیا ر کے ساتھ لگا کے مار رہے تھے۔

”بھول..... بھول..... تجھے جان سے مار دوں یا خود کشی کر لوں.....“ صورت حال کو بھانپتے ہی میں بکلی کی سی تیزی سے اٹھی اور جا کر ناصر بھائی کا ہاتھ روک کے لگی۔ لیکن وہ تو پاگل ہو چکے تھے۔ چائے، ٹھنڈے، گھونٹے، ملا تیس سب کچھ ارسلان پر آزار رہے تھے۔ لیکن ارسلان صرف خاموشی سے ہٹ رہا تھا۔

میں دونوں بھائیوں کے درمیان آ کر کھڑی ہو گئی جس سے ارسلان کے بجائے میں پنہ لگی۔ ”آپ کو اللہ کا واسطہ بھائی جان میں نے ہاتھ جوڑ دیے۔“ میں نے انہیں کچڑا چاہا تو انہوں نے مجھے اتنے زور سے دھکا دیا کہ میں زمین پر گر گئی۔ ادھر ادھر دیکھا تو بقیس خالد بھیں نظر نہ آئی۔ میں پھر اٹھ کر دوڑی لیکن ناصر بھائی تیزی سے باہر نکل گئے۔ میرے ہاتھ پاؤں پھولنے لگا۔ کچھ نہیں آ رہی تھی کیا کروں۔ ارسلان سر پہوڑا لے کھڑا تھا۔ اسے تو چپ سی لگ گئی تھی۔

اچانک باہر سے دوڑتے قدموں کی آواز آئی۔ دیکھا تو شاہد اور اس کے ابو آ رہے تھے۔ ان کے پیچھے پیچھے شاہد کی امی اور خالد بقیس تھیں۔ شاہد وہی ان کو بلا کر لائی تھی۔ اتنے میں ناصر بھائی اپنا ہاتھ لے کر آ گئے اور گرے۔

”ہٹ جاؤ سب..... میں گولی مار دوں گا اسے۔ جان سے مار ڈالوں گا اسے..... اس کو شرم نہیں آئی..... بھائی کی عزت سے کھیلے ہوئے.....“ صورت حال سمجھیر دیکھ کر میں ارسلان کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ شاہد ناصر بھائی سے لپٹ گیا، لیکن وہ تو کسی طور پر قابو میں ہی نہ آ رہے تھے۔ یقیناً خالد بقیس نے انہیں ارسلان اور نادیہ کے قتل کے بارے میں بتایا ہوگا جس سے وہ آپ سے ہی باہر ہو گئے۔

بڑی مشکل سے شاہد اور اس کے ابو نے ناصر بھائی کو کنٹرول کیا اور صوفے پر بٹھایا لیکن ان

تری یادوں کے گھر

کے منہ سے جھانک اور آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ بقیس خالد خلدی سے پانی لے کر کمر لگیں۔ شاہد نے انہیں پانی پلایا جس سے انہیں قدرے سکون آیا۔ تو شاہد نے ہاتھ آ بھتی سے ان کے ہاتھ سے لے لیا۔ اچانک ارسلان کے کم صدمہ جو دس حرکت پیدا ہوئی اور وہ تیزی سے چلے ہوا ہونے بھائی ناصر کے پیروں سے لپٹ گیا۔ ”بھائی جان مجھے معاف کر دیں..... میں آپ کا مجرم ہوں..... جو چاہیں مجھے سزا دیں۔ جان سے مار دیں یا گھر سے نکال دیں۔“ ارسلان زار و تھار روئے لگا۔ اب کم صدمہ ہونے کی باری ناصر بھائی کی تھی۔ انہوں نے ارسلان کو کوئی جواب نہیں دیا۔ شاہد نے ارسلان کو فرش سے اٹھایا اور صوفے پر بٹھایا۔ چند لمحوں کے لیے عکین خاموشی چلی گئی۔ ارسلان پھر رونے لگا۔ ناصر بھائی کسی سوچ میں گم تھے۔ گہری سوچ میں..... جیسے کسی نتیجے پہنچی جانے کی کوشش کر رہے ہوں۔

”دیکھو جیانا“ شاہد کے ابو بولے۔

”مجھے تو کچھ پتہ نہ تھا کہ اس گھر میں کیا ڈرامے کھیلے جا رہے تھے۔ چند دن پہلے شاہد زبانی اور پھر بقیس سے پتہ چلا۔ تو ان ماں بچی کے گھٹاؤ نے پھرے سامنے آئے جو تینوں بھائیوں کا خون جو بکوں کی مانند چوس رہی ہیں۔ ناصر بیٹے..... اب بہتر یہ ہے کہ ان کے آنے۔ پہلے ماحول کو تامل کر دیا جائے تاکہ انہیں فی الحال پتہ نہ چلے۔ باقی میرا تو مشورہ ہے کہ تم دونوں بھائی اتفاق سے رہو..... ارسلان نے خاموشی سے مار کھا کر اور پھر بر ملا اعتراض کیا کہ سعادت مند کی کا موت دیا ہے۔ بہتر اسی میں ہے کہ تم بھی اسے معاف کر دو رہی بتا رہی ہاں۔ شاہد ہمارا واحد بیٹا ہے۔ اس نے کبھی بے جا ضد نہیں کی اور ہمیشہ خوب صورت اور درست فیصلے دیتا ہے۔ ارم کو ہماری بیوی بنانے کا فیصلہ بھی یقیناً بہتر ہے۔ ہمارا اس مسئلے میں کوئی اعتراض نہیں۔ نادیہ کا معاملہ تمہارا اندرونی معاملہ ہے۔ اس پر آپ جمل کر فیصلہ کریں اور اس سارے معاملے کو ریڈ ہت بقیس کو جاتا ہے جس کو اس پر ہا چاہے میں اپنی غلطیوں کا احساس ہو گیا اور یہی دور طریقہ تھا جس سے وہ اپنے گناہوں کو بخشوا سکتی تھی۔“

”مم..... میں آپ کا شکر گزار ہوں اگلے!“ ناصر بھائی بھی ہنسنے لگے کہ ”آپ سارا صورتحال جاننے کے باوجود بھی اپنے فیصلے پر قائم ہیں۔“ ناصر کی بات سن کر شاہد نے آگے بڑھ کر ناصر کا شانہ چھو تپایا اور کہنے لگا۔

”چلو اب دونوں بھائی مجھے ملو..... کہ اسی میں اس گھر کی جگہ ہے۔“ شاہد کی بات سن کر





کرت پائی۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ کیوں۔۔۔۔۔ کہ  
دروازے میں ناصر اور ارسلان دونوں کھڑے کینے تو زلفروں سے ناو یہ اور اس کی ماں کو  
محمود رہے تھے۔ ناو یہ کی ماں بھی یہ صورت حال دیکھ کر شہنشاہ کر رہی تھی کہ گیت تو اندر سے بند تھا۔ یہ  
دونوں کس وقت اور کیسے آئے۔

”ناصر۔۔۔۔۔ آ۔۔۔۔۔ پ۔“ ناو یہ کی زبان میں بکلا ہٹ آ گئی۔

”یہ۔۔۔۔۔ دونوں سے تمہارے اس ڈارے کی سن گن محسوس کر رہا تھا۔“

”ناصر بیٹا۔“ ناو یہ کی ماں تیزی سے ناصر کی طرف بڑھی۔ ”آج پہلے نہیں ان دونوں کو کیا  
ہوا۔۔۔۔۔ کھانے کے دوران لڑ پڑیں۔۔۔۔۔ میں بڑی دیر سے ان کو چپ کر داری تھی۔“

”بہت جاوے غیرت عورت!“ ارسلان نے پوری قوت سے تھپڑ کینے کے منہ پر مارا۔  
”ارسلان۔۔۔۔۔!“ ناو یہ دانت تھتی ہوئی ارسلان کی طرف لگی۔ لیکن ناصر بھائی نے  
اسے بالوں سے کپڑا لیا اور بیٹنا شروع کر دیا۔ اچھی طرح ٹاک منہ چانے کے بعد اس کو چھوڑا۔  
اور ارسلان نے سیکڑ کو دو چار ہاتھ جڑ دیے جس سے دونوں ماں بچی کا ہنٹ پر نہیں بچی چو نہیں  
سہلانے لگیں۔

”اب اس گھر میں رہنے کا تم ماں بچی کا کوئی جواز نہیں۔۔۔۔۔ تمہاری ساری گفتگو ہم دونوں  
نے خود سنی اور جس طرح ہماری بہن کو بلیک میل کر کے اسے ڈکرائی جا کر دکھا ہوا ہے وہ منظر بھی  
آنکھوں سے دیکھا۔“

”اب میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں ناو یہ کہ تمہیں اسی وقت طلاق دے کر غار کر  
دوں۔ چلو۔۔۔۔۔ اٹھو۔۔۔۔۔ اٹھو۔“ ناصر نے ناو یہ کو پاؤں سے ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

صورت حال کو بھانپتے ہوئے ناو یہ تیزی سے اٹھی اور ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

”مجھے معاف کر دیں ناصر۔ خدا ارطلاق شدہ ہیں۔ میں برا ہوں جو آؤں گی۔“

”بیٹا نہیں۔ معاف کر دو میں تمہارے پاؤں پر پڑتی ہوں۔“ سیکڑ ناصر کے سروں کی طرف  
بڑھی تو وہ تیزی سے پیچھے ہو گیا۔

”بہت جا۔۔۔۔۔ مجھے کھلی۔۔۔۔۔ تیری لڑائی بھائی کی وجہ سے ہم نے کئی بار اپنی لڑائی بہن کو  
مارا۔ اور اس کی طرف سے لاہر داہو گئے۔“

”جائیں تھے۔۔۔۔۔ ظل۔۔۔۔۔“ ناصر بھائی جیسے ہی کہنے لگے میں نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

پوچھیں گے تو۔۔۔۔۔ میں کوئی نقص نکال کر انکار کروں گی لیکن وہاں تو سبھی کر دی گئی۔ اور جیسا  
مجھے سے پوچھا تک نہیں۔“

”لیکن۔۔۔۔۔ اب تم از خود انکار کر دو گی۔ شام کو جب ناصر اور ارسلان دونوں گھر پر ہوں  
گے تو تم یہ انگوٹھی لا کر ان کے سامنے رکھ دو گی۔ اور کوئی بھی بہانہ کر کے رشتے سے انکار کر دو گی۔“

”نہیں بھائی۔ ایسا مجھ سے نہ ہو سکے گا۔“ میں نے پہلی بار جرات دکھائی۔ ”اب میں  
خود انکار نہیں کروں گی۔“

”ارم۔۔۔۔۔“ ناو یہ اپنی کرسی سے کھڑی ہو گئی۔ ”میرا خیال ہے تم اپنی ان تصویروں کو بھائی  
گئی ہو۔۔۔۔۔“ اس کا انداز سختی خیز تھا۔

”بھائی۔۔۔۔۔ پلیز ایسا نہ کرنا۔ دیکھو میں نے تمہاری کتنی شریفی دہنی ہیں اپنے ہی گھر میں  
ملازمہ بن کر رہ رہی ہوں۔“

”تم نے مافی نہیں۔ لڑکی۔“ ناو یہ کی ماں تھی۔ جس نے پیچھے سے آ کر اچانک میری  
چٹیا پکڑ لی۔ ”ہم نے متواری ہیں۔ زیادہ سارے بننے کی کوشش نہیں کرنی تم نے۔“

”اس سال تک ہم تمہاری شادی نہیں ہونے دیں گے۔ اور ہر آنے والے رشتے کو تم خود  
ٹھکرادی جا کر کسی کو کانوں کان پتہ نہ چلے کہ یہ ہماری وجہ سے ہو رہا ہے۔“

”لیکن۔۔۔۔۔ کیوں تم ماں بچی میری جان کی دشمن ہو۔۔۔۔۔ اس لیے کہ میں تمہیں اس وقت  
اس گھر میں لائی جب تمہارا مالک مکان تم لوگوں کا سامان پابری پھینکنے والا تھا۔ میں نے تو تم لوگوں پر  
تس کیا تھا لیکن تم مجھ پر ظلم کیوں کرتی ہو۔“ میں کچھ روئے لگی۔

”چھوڑو۔۔۔۔۔ ماں اس کو۔“ ناو یہ نے بڑھ کر میری چٹیا میں سے ہاتھ سے چھڑوائی۔

”زیادہ دھڑکرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں یا تو تمہارے دونوں بھائیوں کو خوش رکھ  
سکتی ہوں اور یا پھر تمہیں۔۔۔۔۔ تینوں کو ایک ساتھ خوش رکھنا میرے بس میں نہیں اور یاد رکھو میری

بات کو رد کرنے کا سوچنا بھی نہیں۔ ورنہ تمہارے نام کے فون بھی اس گھر میں آنا شروع ہو  
جائیں گے اور تمہارے کسی کے نام لکھے لو لیون بھی شاید اور اس کے رشتہ داروں کو کتنی جائیں گے اور

تمہاری تصویریں بھی محلہ بھر میں پھیلا دی جائیں گی۔ اب تم دلعان ہو جاؤ۔۔۔۔۔“ ناو یہ نے ہاتھیں  
ہاتھ سے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

”اور سنو تمہاری طرف سے انکار کی خبرات تک مجھے مل جائے۔ ورنہ۔۔۔۔۔“ وہ جملہ مکمل سی

تری یادوں کے گلاب

"نہیں بھائی جان..... معاف کر دیں۔ انہوں نے زیادتیاں ہرے ساتھ کیں اور میں انہیں معاف کرتی ہوں۔"

میری بات سن کر ناصر بھائی ڈک گئے۔ تھوڑی دیر بعد دیکھتے رہے اور پھر کھینچ کر نکلتے لگایا۔ میں ان کے شانے سے سر نہکا کر دینے لگی۔

نادیہ اور اس کی ماں یکے پاؤں اٹھتے اٹھتے جاتے پر ہر اس ماں پر پیشاں مرجھائے کھڑی تھیں۔ اب یہ اللہ بھتر جانتا ہے کہ وہ چشمیان تھیں یا کوئی نئی چال تھی رہی تھیں۔ ارسلان نے ہم دونوں بہن بھائیوں کو الگ کیا اور کہنے لگا۔ ابھی بات مکمل نہیں ہوئی ہے بھائی۔

"مجھے پتہ ہے چھوٹے بھائی..... ہاں تو نادیہ....." ناصر اپنی بیوی سے مخاطب تھا۔  
 "وہ قصوریں..... اور غلطو..... ابھی اور اس وقت نکال کر اس بھلی پر کھو اور اس لڑکے کا نام بتاؤ جو تمہارے کہنے پر اس گھر میں فون کرتا تھا۔"

نادیہ چپ چاپ اٹھی اور تھوڑی دیر میں مطلوبہ چیزیں پیش کر دیں۔ اس کا چہرہ ہنسنا ہوا تھا۔  
 "اس لڑکے کا نام.....؟" ناصر بھائی نے پوچھا۔

"سلیم....." نادیہ سر جھکا کر مری ہوئی آواز میں بول رہی تھی۔  
 "یہ جو اس گلی میں رہتا ہے۔ وہ آوارہ سالن لگا۔"

"وہ جہیں کہاں سے مل گیا؟"  
 "خالہ ثقیس کے ذریعے سے بات ہوئی تھی۔"

"کتنے میں سو رہا ہوا تھا؟" ناصر کا طنز اس کے لہجے کی گئی میں ڈوبا تھا۔  
 "پانچ سو روپے میں۔"

تراخ کی آواز آئی اور نادیہ لڑکھڑا کر رہ گئی۔  
 "بے غیرت..... میری بہن کی بے عزتی کے لیے تم نے میری ہی حقوہ استعمال کی۔"

نادیہ گال پر ہاتھ رکھ کر سسکتی لگی۔  
 "ارسلان جا کر شاہد اور خالہ ثقیس کو بلا لائے۔"

انکے چند منٹوں میں دونوں آ گئے۔  
 ناصر نے شاہد کو سلیم کے بارے میں بتایا تو وہ آگ بگولا ہو گیا۔  
 "اس کتے کی یہ بہت، ناصر بھائی آپ فکر نہ کریں۔ اب یہ میرا کام ہے۔ اس کے ساتھ

تری یادوں کے گلاب

وہ کروں گا کہ نہ صرف ساری زندگی اس لٹ پر زبان بند کئے گا بلکہ آئندہ کسی شریف خاتون کو شک کرنے سے قویہ کرے گا۔"

☆.....☆.....☆

اور پھر اگلے دن سے شادی کی شاپنگ زور و شور سے شروع ہو گئی۔ شاہد کی دونوں بہنیں پاکیزہ اور تبین اس شاپنگ میں امداد کے ساتھ ہو گئیں۔ درمیان میں دن ہی کتنے تھے۔ لہذا صبح سے شام تک شاپنگ، شاپنگ اور پھر شاپنگ۔ ہمارے تو قریبی رشتہ دار بھی نہ تھے۔ اگر تھے تو وہ بیرون ملک تھے۔ نادیہ اور سلیم کو صرف گھر تک محدود کر دیا گیا لہذا پاس پڑوس والیاں رات کو آ کر ڈھونڈ لگیں۔ شاپنگ شروع کر دیں۔ اگلے ہی دن آئے سانسے دونوں گھر جا دیے گئے۔ تمام رسوم مشترک رہی ہوئیں۔ محدہ المبارک کو بعد نماز جمعہ سادگی سے نکاح پڑھا دیا گیا اور میں گلی کے اس پار چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

کلیدوں سے کچی اور پھولوں سے لدی بیج پر ارم اپنے گھنٹوں کو بازوؤں کے حصار میں لیے اپنے آپ میں سست رہی تھی۔ شب کے بارہ بج چکے تھے۔ گزشتہ تین منٹ سے وہ ہر آہٹ پر چونک اٹھتی تھی۔ اسے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ بیک میٹنگ کی دوزخ سے نکل کر امانوں کی جنت میں پہنچ گئی ہے۔ اور کوئی پل کو امانوں کا دیو تا ظہور پندہ ہونے والا ہے۔

اور پھر چوٹی دروازے کے باہر کھٹ پٹ ہوئی۔ دروازہ کھلا۔ کوڑا کسمائے ارم نے جھکے جھکے گھر گھٹ کی اوٹ سے پٹکیں اٹھا لیں۔ یہ شاہد ہی تھا جو پلٹ کر چٹنی لگا رہا تھا۔

اس کا دل زور سے دھڑک اٹھا..... اس کے سینے و جو سے سنسنائیں پھوٹنے لگیں۔  
 دواؤں عشق سے شیرازہ۔ پریوں کی شہزادی کو لٹے۔ پرستان کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔

شاہد و جبرے دھیرے آگے بڑھا اور ڈھل بند کی بیج کے قریب آ کر رک گیا۔ چند لمبے گزور گئے تو ارم نے پٹکیں اٹھا لیں لیکن شاہد کو دالیا نہ انداز میں گھورتے دیکھ کر جلدی سے جھالیں گرا لیں۔ وہ جھینپ گئی۔ وہ بیڑہ کیا۔ وہ سستے گئی وہ سر کٹے لگا۔

"آج تجھے اپنی دہن کے روپ میں سامنے پا کر عاؤں کی قبولیت پر یقین ہو گیا ارم۔" یہ شاہد تھا۔ جو اس کی خوبی کی انجست شہادت سے افسار ہاتھا۔

ارم کے گلابی چہرے سے حجاب پھوٹنے لگا۔



تری یادوں کے چراپ

”زندگی کتنی خوب صورت ہے۔“ اس نے گفتگو جاری رکھی۔ ”ہاں کبھی کبھی کچھ ماقبت  
ماندیش لوگ دوسروں کی خوشیوں بھری زندگی میں زہر گھولنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاہم یہ  
دورانہ مختصر اور عارضی ہوتا ہے اور سازشی ہمیشہ دوسروں کے لیے کھودنے والے گڑھے میں نہ  
گرتے ہیں۔“

ارم کو شاد کی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔  
”شاید.....!“ ارم بول اٹھی۔

”بعض باتیں بظاہر یقین سے بہت دور نظر آتی ہیں لیکن قدرت کے فیصلے الگ ہوتے  
ہیں۔ آج سے چند دن قبل تک میں اپنی شادی کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ پھر جانے کیا ہوا۔ اے  
کے سب ہی کانٹے بٹتے چلے گئے۔ لہٰذا..... لیکن مجھے تو ابھی تک کچھ سمجھ نہیں آتی..... ارم کی  
جھک دور ہو رہی تھی..... کچھ تم ہی سمجھاؤ نا..... یقیناً یہ ساری بساط تم نے ہی بچھائی ہوگی۔“

”سمجھا دوں گا۔“ شاد کا صلا کم کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن آج نہیں پھر کسی دن آن  
کی رات ہماری زندگی کی یادگار رات ہے۔ آج ہم صرف اپنی باتیں کریں گے دوسروں کی کوئی  
بات نہیں ہوگی۔“ جذبات کی شدت سے شاد کی آواز بھرا گئی۔ اس کے ہاتھ ارم کے گدازو نو  
کی طرف پیش قدمی کرنے لگے۔ ارم کسمانے لگی۔ لیکن اس کی برائے نام ممانعت اور  
لطیف جدوجہد کامیاب نہ ہو سکی۔

اور پھر جب چیزوں کی چھبھاہٹ کے ساتھ شوخ و خشک کریمیں ان کی تھانویں میں جھانک  
جھانک کر غل ہونے لگیں تو ارم کو محسوس ہوا کہ اس سیاہ رات کی کوکھ سے ایک نئی صبح تاپاں جنم لے  
چکی ہے۔

**داخلہ جاری ہے**

**دعائے پرف گرنز ہاسٹل**

**ماہا گرنز ہاسٹل**

D-11/4، سیٹلائٹ ٹاؤن،

بالتقابل گورنمنٹ پوسٹ گر بچرہیٹ کالج

0321-5330025, 051-5858195

NA-12، مین سیدتھ روڈ

سیٹلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی

051-5826767

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk